یارب

غلام میراں



یارب

غلام میراں

انتساب:

رب سوہنے کی بے مثال صفات میں سے ایک صفت

"رحمت!" کے نام

جس کے حساب و شمار کا کوئی احاطہ ممکن ہی نہیں۔

غلام میراں

شعر

صرف احساسِ ندامت اک سجدہ اور چشم تر

اے خدا کتنا آساں ہے، منانا تجھ کو

غلام میراں
المدینہ پاک پیلس میرج ہال
ڈاک خانہ ڈالو والی
تحصیل و ضلع سیالکوٹ
whatsapp:03056293694
email:ghulammiranbhutta@gmail.com

پیش لفظ:

اللہ رب العزت کی بسائی اس نگری میں جسے دنیا کہتے ہیں یہاں کروڑوں اربوں انسان بستے ہیں۔مالکِ کائنات نے اپنے ہر بندے کو بے پناہ صلاحیتیں،خوبیاں ودیعت دے کر تخلیق فرمایا ہے۔آپ چاہے دنیا کے جدید سہولیات سے آراستہ شہروں سے بہت دور کسی پنڈ،دیہات کے کسی گھر کے چھوٹے سے آنگن میں لگے دھریک کے پیڑ کی گھنی چھاؤں تلے۔۔۔کچے مٹی کے فرش پہ بچھی چارپائی پہ بیٹھے۔۔۔بانس کی لکڑی سے بنی قلم تھامے تختی پہ آڑھے ترچھے حروف تحریر میں لانے میں مگن ہوں۔آپ نہیں جانتے آپ کتنے انمول ہیں۔دھان کی فصل کی کاشت کے لیے ہاتھ میں تھامے ننھے پنیری کے پہلے بوٹے کو کھیت کی پانی سے نرم کیچڑ والی دلدلی مٹی میں گاڑتے ہوئے آپ کبھی سوچتے ہیں۔آپ کتنے خاص ہیں؟بھاری بھرکم بستے اٹھائے وقت پر سکول مدرسے،کالج یا یونیورسٹی پہنچنے کے لیے وہ جو تیز تیز قدم اٹھاتے آپ آگے بڑھ رہے ہیں۔آپ اس احساس سے خالی ہیں۔آپ کیا ہیں۔۔۔؟آسمان کی وسعتوں میں جہاں آپ زمین سے سینکڑوں میل بلندی پہ محوِ پرواز ہوتے ہیں۔ایئر ہوسٹس سے کھانا لے کر پہلا لقمہ حلق میں اتارنے سے پہلے آپ نے کبھی سوچا ہے۔آپ رب العزت کے کتنے پیارے بندے ہیں۔آپ کی یہ سانسیں۔۔۔ایک ایک لمحہ۔۔۔گھڑی پل ویسے ہی اہم ہے جیسے آپ خاص ہیں۔

غم میں رہو یا شاد رہو
کچھ ایسا کر چلو کہ بہت یاد رہو

بس ذرا اپنے من کے اندر جھانکنے کی لوڑ ہے۔پھر دیکھئے آپ پہ کیسی نئی نئی دنیاؤں کے بھید کھلتے ہیں۔۔۔آج سے ہی وہ پہلی سوچ وہ پہلا قدم اٹھایئے جو آپ کو آپ سے ملا دے۔

پہلے ناول "جسے جرم عشق پہ ناز تھا" کی غیر معمولی پذیرائی اور آپ سبھی قارئین کی حوصلہ افزائی میرے شاملِ حال رہی تبھی میرا دوسرا ناول آج آپ کے ہاتھوں میں ہے۔جب آپ میرے پہلے اور اکلوتے ناول کو ہی میرا ماسٹر پیس کہتے ہیں تو میرے لیے جہاں یہ بے حد اچنبھے کی بات ہوتی ہے۔وہیں میرے لیے اپنا دوسرا ناول تحریر میں لانا ذرا کٹھن مرحلہ تھا۔

بحرحال بفضلِ باری تعالیٰ تکمیل کے سبھی مراحل سے گزر کر کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔آپ ملاحظہ کریں گے کہ پروردگار مجھ سے گناہ گار نااہل خطاکار بندے سے ایسا کام لے رہا ہے۔تو پھر آپ لوگ تو بڑے ہی پیارے سلجھے اور نیک لوگ ہیں۔

آخر میں کراچی والوں کا ڈھیر سارا شکریہ۔۔۔ محترم عمران احمد اور اقبال بھٹی صاحب جنہوں نے اپنے ادارے نئے اُفق ڈائجسٹ میں میرے اس ناول "یارب" کو سلسلہ وار پیش کیا۔ بھائی وسیم انور میں آپ کا بے حد مشکور ہوں آپ پاک سوسائٹی کے پلیٹ فارم سے میرے کام کو سینکڑوں لوگوں تک پہنچا رہے ہیں۔ اور محترم عبدالغفار صاحب علی میاں پبلیکیشنز کا بہت بہت شکریہ جو میری اس کاوش کو کتابی صورت میں لا رہے ہیں۔

والسلام

غلام میراں

فہرست

باب 1

یارب

"چاچو طٰہٰ کے کمرے میں کتابوں والی الماری۔"

ایک چھوٹے سے رقعے پر درج عبارت پڑھتے ہی اس کا سر تاسف سے دائیں بائیں ہلنے لگا۔

وہ مجھ سے (طٰہٰ عالم) سے فقط ایک بار ملی تھی اور اس پہلی ہی ملاقات کے بعد وہ میرے متعلق کیسا سوچتی ہو گی اس بات کا مجھے علم تھا، اس کے ہاتھ میں موجود رقعہ ایک کھیل کا حصہ تھا۔ جو میرے بھتیجے رومی میاں کا ایجاد کردہ تھا۔

ایک غیر ملکی چینل اے ایکس این پر چلنے والے اپنے پسندیدہ کھیل "منٹ ٹو وِن اِٹ" کو رومی میاں نے اپنے انداز میں "فائنڈ ٹو وِن اِٹ میں کچھ یوں ڈھالا تھا کہ گھر کے مختلف حصوں میں چند رقعے چھپا رکھے تھے، کسی بھی ایک رقعہ کے مل جانے پر اس پر اگلے رقعے تک پہنچنے کے لیے اشارہ عبارتاً درج تھا۔ کم سے کم وقت میں سبھی رقعے کھوج لانے والا اس کھیل کا فاتح ٹھہر تا لیکن وہ تا حال رقعہ ہاتھ میں تھامے جیسے تذبذب کا شکار کھڑی تھی اور میرے کمرے میں آنے سے کترا رہی تھی۔ جب وہ ایک دم سے چونکی۔ اس کی ٹیم کے ننھے منے کھلاڑی اسے بلند آواز میں پکار رہے تھے۔۔۔ "گو گو۔۔۔ یومنہ آنٹی" بچوں کو یوں پکار تا دیکھ کر لا محالہ اسے میرے کمرے تک آنا ہی پڑا۔ دروازے تک پہنچنے کے بعد اس نے کچھ سوچتے ہوئے جوتے باہر ہی اتار دیئے تھے اور ساتھ ہی دھیرے سے دروازہ کھول کر وہ دبے پاؤں چلتے ہوئے میرے کمرے میں آداخل ہوئی۔ اندر پہنچتے ہی اس نے ایک طائرانہ سی نگاہ دوڑا کر کمرے کا جائزہ لیا۔ اب اسے اطمینان ہو چکا تھا کہ میں اپنے کمرے میں نہیں ہوں اور اندر داخل ہوتے ہوئے وہ ایسی ہی دعائیں مانگ رہی تھی۔

کمرے میں کوئی کسی قسم کا برقی قمقمہ روشن نہ تھا۔ فقط مغربی سمت میں کھلنے والی کھڑکی سے کمرے کے اس حصے میں سورج کی کرنیں جیسے زینہ بنا کر اتر رہی تھیں۔ یوں وہ کمرے میں پھیلی اس ملگجی روشنی میں سر کو دروازے کی جانب گھما کر دیکھتے ہوئے دھیرے دھیرے چلتے میرے پلنگ کے ساتھ پڑی الماری کی طرف بڑھ رہی تھی۔ یکا یک جو میں نے ایک طویل سجدے سے اپنے سر کو اٹھایا تو وہ مجھ سے ٹکرا کر بہ مشکل گرتے گرتے سنبھلی اور بھونچکا سی ہو کر اپنے حلق سے نکلتی چیخ پر اس نے مشکل سے قابو پایا تھا، تو دوسری جانب مجھے بھی اس کا بنا دستک دیئے میرے کمرے میں چلے آنا معیوب لگ رہا تھا۔ میں متعجب سا اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا تو اب سوالیہ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ وہ سراسیمہ سی ہو کر میرے سامنے کھڑی تھی۔ اس نے اشارتاً مجھ سے

معذرت چاہی اور میں نے بھی اشارتاً ہی اس کی معذرت کو قبول کر لیا تھا۔ ساتھ ہی مجھے یاد آنے لگا کہ چند لمحے پہلے رومی میاں بھی ایسے ہی انداز سے کمرے میں آئے تھے اور الماری میں کچھ چھوڑ کر الٹے پیروں لوٹ گئے تھے۔
یہ خیال آتے ہی میں نے انگشتِ شہادت سے اس کی عقبی جانب اشارہ کیا، تو وہ میرا اشارہ پا کر پلٹی، اس نے الماری میں پڑا رقعہ اٹھایا اور کاندھے سے کمر کی طرف گرہ لگے آنچل کو کھول کر سر پر اوڑھتے ہوئے جیسے داخل ہوئی تھی ویسے ہی دھیرے سے کمرے سے چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے بابا رب نواز کی دی کالی چادر کو ایک بار پھر سے کھول کر اپنے کاندھوں کے گرد اوڑھا اور جائے نماز پر بیٹھتے ہی تسبیح ہاتھ میں لے کر آنکھیں موند لیں۔
اگلے روز فجر کی نماز سے فراغت پاتے ہی میں حسبِ معمول تسبیح ہاتھ میں لیے چھت پر آ گیا تھا۔ چھت پر آنے کی خاص وجہ یہ تھی کہ صبح تڑکے چھت کا رخ کوئی بھی نہ کرتا تھا، یوں مجھے تنہائی میسر آ جاتی تھی اور میں وہاں ایک سرے سے دوسرے سرے تک ٹہلتا ہوا چند وظائف پڑھ لیا کرتا تھا۔ آج یونہی ٹہلتے ہوئے یکایک میری نظر کسی کے سر پر پڑی کوئی نیچے لان میں جاگنگ کر رہا تھا لیکن گھر میں کوئی بھی ایسا فرد نہ تھا جو یوں طلوعِ صبح اٹھ کر جاگنگ کرتا ہو، تو پھر وہ کون تھی؟ سرعت سے میرے ذہن میں خیال آیا، میں یہ جاننے کے لیے متجسس انداز میں ذرا سا آگے کو جھکا یہاں چھت کے اس حصے سے لان کا کچھ حصہ ہی دکھائی دیتا تھا لیکن مجھے وہاں کوئی ذی روح دکھائی نہیں دیا۔ میں وہاں سے ہٹنے کو ہی تھا جب وہ مجھے ٹریک سوٹ پہنے کانوں میں ہینڈ فری لگائے جاگنگ کرتی دکھائی دی اور میں اسے دیکھتے ہوئے سوچنے لگا کہ اگر میں پہلا ساطٰہٰ عالم ہوتا تو یوں اسے جاگنگ کرتا دیکھ کر جھٹ سے اپنے کمرے میں پہنچ کر ٹریک سوٹ پہنتا اور لان میں پہنچ کر اسے خوب تنگ کرتا کہ وہ چڑ کر اپنے کمرے میں چلی جاتی۔
یومنہ میرے چچا مرزا کی سب سے چھوٹی صاحبزادی تھی اور اس کی والدہ یعنی میری چچی اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ ان کا تعلق ایک بڑے زمیندار گھرانے سے تھا۔ جب ان کے والدین رضائے الٰہی سے وفات پا گئے تو زمینوں کی دیکھ بھال کی خاطر چچا کو اپنے خاندان بھر کے ساتھ گاؤں جانا پڑا، تبھی سے وہ وہیں مقیم ہو کر رہ گئے تھے اور جب یومنہ کی بڑی بہن آمنہ کے رشتے کی بات مجھ سے بڑے بھائی غلام مصطفی عالم کے لیے چلی تو ماں نے اس رشتے کو قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ پھر اس بات کو لے کر جو میرے چچا چچی خفا ہوئے تو اس بات کو بیتے بھی اب عرصہ ہو چکا تھا۔ شاید وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ رنجش رفو ہو گئی تھی یا پھر کوئی مجبوری تھی جو انہیں یومنہ کو ہمارے ہاں بھیجنا پڑا تھا۔ وہ ماسٹر کر رہی تھی اور چند روز ہی یونیورسٹی کے ہاسٹل میں بتانے کے بعد وہ مستقل طور پر ہمارے گھر رہنے آ گئی تھی۔ پھر یہ بات مجھے بعد میں معلوم پڑی تھی کہ در حقیقت بڑے ابا اسے ہاسٹل سے گھر لے آئے تھے اور میں یہ جاننے کے بعد سوچنے لگا کہ بزرگوں کی چھایا بھی اللہ کی بڑی نعمت ہے، آج جو میں جیتا جاگتا اپنے پیروں پر چلنے پھرنے کے قابل ہو پایا تھا تو اس میں بھی بڑے ابا کا بڑا کردار شامل تھا۔ میرے لبوں پر سدا ان کے لیے دعائیں جاری رہتی تھیں، وہ مجھے اپنے ابا سے بھی بڑھ کر عزیز تھے اور جب کبھی وہ بہت بیمار پڑ جاتے اور مجھے پاس بلا کر کہتے کہ "طٰہٰ میاں اب ہمارے جانے کا

وقت آگیا ہے''تو ان کی یہ بات سن کر میری آنکھیں یوں برس پڑتیں کہ ان کے ہاتھ بھیگ جاتے اور وہ مجھے اپنے سینے سے لگا کر کہنے لگتے کہ ''میاں تمہاری یہ محبت ہی ہمیں اس دنیا میں روکے ہوئے ہے'' اور میں بچوں کی طرح چلانے لگتا کہ بڑے ابا میں آپ کو کہیں نہیں جانے دوں گا۔ میں اپنے بازو پھیلا کر انہیں یوں جکڑ لیتا کہ پاس موجود لوگوں کی آنکھیں بھی رقت جذبات سے بھیگنے لگتیں اور وہ بھی بڑے ابا سے میری محبت اور وابستگی کو دیکھ کر میری طرح ان کی لمبی عمر کے لیے دعائیں کرنے لگتے۔ مجھے یونہی خیالوں میں گم چھت پر ٹہلتے ہوئے آج کچھ زیادہ ہی وقت بیت چکا تھا۔ جب بابا عبد القادر مجھے ڈھونڈتے چھت پر آپہنچے تھے۔

''صاحب ناشتے کی میز پر آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔'' وہ میرے پاس آکر ہاتھ باندھے جب یوں مجھ سے مخاطب ہوتے تو مجھے ان پر بڑا پیار آتا تھا۔ انہیں میں یونہی ادب سے ہاتھ باندھے محبت سے بات کرتے دیکھتا تو سوچتا رب سوہنے نے ہم پر جو پانچ وقت کی نماز فرض کی ہے تو اس میں بھی ہمارا ادب سے ہاتھ باندھے کھڑے ہونا رب سوہنے کو کیسا پیارا لگتا ہو گا۔ اسے بھی ہم پر کس قدر پیار آتا ہو گا، ذات، پات، رنگ، نسل، امیری، غریبی، سندھی، پنجابی، بلوچی، پٹھان کسی بھی تفریق کے بغیر رب سوہنا سبھی کو اپنی رحمت کی چھایا میں لے لیتا ہو گا۔ جیسے آگے بڑھ کر میں نے اپنا ایک بازو بابا عبد القادر کے کاندھوں کے گرد حائل کر دیا تھا اور اب میں ان کے ہمراہ قدم سے قدم ملا کر چل رہا تھا۔ ہمارے ڈائننگ ہال میں داخل ہوتے ہی بابا عبد القادر رسوئی میں جا گھسے اور میں ہولے سے سلام کرنے کے بعد بڑے ابا کے ہاتھ پر بوسہ دے کر ان کی بغل میں ہی خاموشی سے بیٹھ گیا تھا۔ پہلے شاید وہاں کچھ باتیں ہو رہی ہوں لیکن اب میرے وہاں پہنچنے پر مکمل طور پر خاموشی چھا چکی تھی۔ فقط رسوئی سے پانی کے گرنے اور برتنوں کے ٹکرانے کا شور سنائی دے رہا تھا، لیکن چند لمحے بعد ہی اس شور میں انسانی آوازوں کا اضافہ بھی شامل ہو گیا تھا۔ جب یومنہ ہاتھوں میں چند کاغذات تھامے ڈائننگ ہال میں داخل ہوئی تو سبھی کو سلام کرنے کے بعد وہ میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ آج وہ پہلے روز ہمارے ساتھ ناشتے کی میز پر آئی تھی، وہ بچپن میں کبھی ایک دو بار ہی ہماری طرف آئی ہو گی، اسی وجہ سے اب اس کے عرصہ دراز کے بعد ہمارے ہاں آنے پر ماں چند روز تک ناشتہ اور کھانا اس کے کمرے میں ہی بھجوا دیتی تھی، تاکہ چند روز میں وہ سبھی سے جان پہچان بنا لے تو اسی بیچ اس کی جھجک بھی مٹ جائے گی۔ یوں آج وہ سبھی کے ساتھ ناشتے کی میز پر موجود تھی۔ اس کے آجانے کے بعد میری نگاہیں بدستور جھکی ہوئی تھیں۔ جب مجھے ماں کی آواز سنائی دی۔ وہ یومنہ سے مخاطب تھی۔

''بیٹا اگر آپ پڑھنا چاہتی ہو تو ناشتا آپ کے کمرے میں ہی بھجوا دیں۔''

''ارے نہیں آنٹی دراصل آج کلاس میں پریذنٹیشن ہے، میں نے سوچا جب تک ناشتہ مکمل ہو گا چند پوائنٹس ذہن نشین ہو جائیں گے۔'' ماں کی بات سن کر اس نے دھیرے سے جواب دیا تو بڑے ابا اس کی بات مکمل ہوتے ہی سراہتے ہوئے بولے۔

''بھئی ہماری بیٹی تو بڑی ہونہار ہے۔'' یومنہ بڑے ابا کی بات سن کر شرماتے ہوئے مسکانے لگی اور میں بدستور ابھی تک چپ چاپ ہی بیٹھا تھا۔ جب ابا اس سے دریافت کر رہے تھے۔

"بیٹا آپ کی پریزنٹیشن کا موضوع کیا ہے؟"

"جی انکل میرا موضوع ایک نیا دریافت ہونے والا ذرہ ہگ بوسون ہے، جس کا نام دو سائنس دانوں ہگ اور بوسون کے ناموں کی نسبت سے ہی رکھا گیا ہے۔ یہ ہگ اور بوسون کی حالیہ دریافت ہیں جس پر انہیں نوبل پرائز سے بھی نوازا گیا ہے۔" ابا کے سوال کا جواب دیتے ہوئے یومنہ ہاتھ میں پکڑے صفحات کو بھی الٹا پلٹا کر دیکھتی رہی، ابا اس کے موضوع سے متعلق جان کر اسے سراہے بنا نہ رہ سکے تو ماں یوں خاموش رہی جیسے ان کے پلے کوئی بات ہی نہ پڑی ہو، وہ فقط ستائشی نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی۔ پھر اچانک جو انہوں نے ایک اچٹتی سی نگاہ مجھ پر ڈالی تو جیسے اب ان کے چہرے سے مسکان غائب ہو چکی تھی اور میں نے بھی جو ایک لمحہ بھر کو نگاہیں اٹھا کر ان کی جانب دیکھا تھا تو فوراً ہی اپنی نگاہیں واپس جھکا لی تھیں۔ میں نے اس وقت بھی بابا رب نواز کی دی چادر کو اوڑھ رکھا تھا اور سر کو قدرے خم دیئے سبھی کی باتیں سن رہا تھا کہ یکا یک یومنہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔

"طٰہٰ سنا ہے آپ یونیورسٹی کے دنوں میں بڑے اچھے مقرر رہ چکے ہیں۔ آپ میری پریزنٹیشن میں کچھ ہیلپ کریں ناں۔" وہ اپنی بات کہہ چکی تھی اور جواب طلب نگاہوں سے میری جانب دیکھ رہی تھی لیکن اس کی بات ختم ہونے تک میری کیفیت ہی بدل چکی تھی۔ مجھ پر رعشہ ساطاری ہو چکا تھا۔ میں اپنی سیمابی کیفیت پر قابو پانے کی کشمکش میں مبتلا تھا، میرا وجود مجھے سرد ہوتا محسوس ہو رہا تھا لیکن ساتھ ہی اپنی ہتھیلیوں اور پیشانی پر پسینے کی موجودگی کو بھی میں محسوس کر سکتا تھا پھر ایک جھماکا سا ہوا اور میرے چار سُو منظر بدلنے لگا۔ چار سُو چلتی خوفناک۔۔۔ آندھی۔۔۔ اسپیکروں سے نکلتی پھٹی پھٹی آوازیں۔۔۔ انسانوں کے انبوہ سے بلند ہوتا نعروں کا شور۔۔۔ اور تاریک آندھی میں اُڑتے اخبارات کے صفحات اب مجھے واضح دکھائی دے رہے تھے، پھر یکا یک ہوا میں اُڑتے ان صفحات میں سے ایک خون آلود صفحہ میرے چہرے سے آ چپکا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں حواس باختہ ہو کر اپنے ہاتھ اٹھائے چہرے سے چپکے خون آلود اخبار کو ہٹانے کی کوشش میں چیخنے لگتا، میرے قریب بیٹھے بڑے ابا میری دگر گوں ہوتی کیفیت کو بھانپ چکے تھے۔ وہ چند لمحوں تک میری طبیعت کے سنبھلنے کا انتظار کرتے رہے لیکن انہوں نے جب مجھے ہر طرح سے بے بس پایا تو مجھے کاندھوں سے تھامے اٹھایا اور میں ان کے ہمراہ منوں بھاری ہوتے وجود کے ساتھ رینگتا ہوا چلنے لگا۔ ماں اور ابا آزردگی سے سر کو جھکائے وہیں بیٹھے رہے۔ جبکہ یومنہ کی متعجب نگاہیں سوالیہ بنی دیر تک میرا تعاقب کرتی رہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆

باب 2

تلاش

بڑے ابا مجھے لے کر ڈائننگ ہال سے میرے کمرے میں چلے آئے تھے، لیکن تا حال میں سیمابی کیفیت میں مبتلا گم صم سا تھا اور بڑے ابا بھی فقط اشاروں کنایوں میں ہی اپنی بات سمجھاتے رہے تھے۔ وہ اس بات کو بخوبی سمجھتے تھے کہ میرے ذہن میں چلتی اتھل پتھل اگر رک سکتی تھی تو ایک ہی صورت میں کہ مجھے تنہا چھوڑ دیا جائے۔ اسی مقصد سے وہ مجھے آرام کرسی پر بٹھا کر وہاں سے جا چکے تھے۔ کمرے سے نکلتے ہی میرے ذہن کے سلو لائیڈ پر پھر سے ڈائننگ ہال کا منظر چلنے لگا تھا۔ یکایک جو یومنہ نے مجھے مخاطب کیا تو گویا میری روح تک کو ہی جھنجھوڑ ڈالا تھا۔

اس سے پہلے کہ ایک بار پھر سے میں ویسی ہی کیفیت کا شکار ہونے لگتا، میں سبھی قسم کے خیالات کو جھٹک کر سوچنے لگا کہ میں اس کی پریذنٹیشن میں کیا مدد کر سکتا ہوں، اس کے بقول کہ آج ہی اس کی پریذنٹیشن ہے اور اس نے جو موضوع بتایا تھا وہ کسی نئے دریافت ہونے والے ذرے کی بات کر رہی تھی جس کا نام دو سائنس دانوں ہگ اور بوسون کے ناموں کی نسبت سے ہی رکھا گیا تھا یعنی کہ اس کا موضوع ہگ بوسون ایک نیا دریافت ہونے والا ذرہ تھا۔ یہ نئی دریافت اور اس کے سائنس دان دونوں ہی میرے لیے بالکل اجنبی تھے۔ معلومات ہی سہی یہ سوچ کر میں نے اپنا کمپیوٹر آن کیا اور سرچ انجن میں ہگ بوسون لکھ کر جو انٹر کا بٹن دبایا تو سرعت سے اس موضوع سے متعلقہ بہت سے صفحات میرے سامنے کھل چکے تھے۔ پھر ایک ایک کر کے میں ان صفحات کا مطالعہ کرنے لگا تھا۔

دنیائے سائنس کس قدر ترقی یافتہ ہو چکی تھی اور پھر اسی ترقی یافتہ دنیا کے دو بڑے سائنس دان ہگ اور بوسون خود دنیا کو بتا رہے تھے کہ ''یس آئی ایم دابلیور'' وہ اس نئے دریافت ہونے والے ذرے کے لیے منعقد ہونے والی اس عظیم و عالیشان تقریب میں جہاں دنیا جہاں سے آئے سینکڑوں اعلیٰ دماغ موجود تھے۔ جن میں ہر مذہب رنگ و نسل سے تعلق رکھنے والے افراد جمع تھے۔ وہ انہی کے سامنے بے ساختہ اپنے ہاتھ اٹھائے خوشی سے سرشار ہو کر بتا رہے تھے کہ انہیں یقین ہو گیا ہے کہ خدا ہے، کوئی ہے، جس کے دم سے اس کائنات کا نظام چل رہا ہے، جوں جوں میں مطالعہ کرتا چلا گیا۔ مجھے اس نئی دریافت سے متعلق بہت سی معلومات حاصل ہوتی چلی گئیں۔ پھر ایک دم سے مجھے دہریہ قسم کے لوگوں کا خیال آنے لگا جو سرے سے ہی خدا تعالیٰ کے وجود سے منکر ہیں، میں اپنی اب تک کی زندگی میں کسی ایسے شخص سے نہ ملا تھا لیکن اب سوچ رہا تھا کہ اگر زندگی نے وفا کی اور کبھی ایسا کوئی شخص

زندگی میں ملا تو اسے یہ ضرور کہوں گا کہ تم جیسے لوگ جو خدا تعالیٰ کے وجود کو نہیں مانتے، اس کے بھیجے نبیوں کو بھلا کیسے مانو گے، ان پر نازل کردہ مصحف کا بھلا کیوں کر مطالعہ کرو گے لیکن آج سائنس بھی اس حقیقت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہے جس حقیقت سے تم لوگ نگاہیں چرا رہے ہو۔ یہ تمھی لوگوں کے لیے لمحۂ فکریہ ہے۔

ایسے ہی خیالوں کے دائرے سے میں اس وقت پلٹا جب دروازے پر کوئی دستک دے رہا تھا۔ میں نے آواز دی تو یہ بابا عبد القادر تھے ۔ وہ دوا والی ٹرے اٹھائے اندر داخل ہوئے۔

''صاحب دوا لے لیجئے۔'' انھوں نے ٹرے کو میز پر رکھتے ہوئے نہایت شائستگی سے کہا۔ میں دوا کھالوں گا۔ میں نے فقط انہیں اشارتاً ہی جواب دیا۔ جسے سمجھ لینے کے باوجود وہ وہیں کھڑے رہے پھر میرے مزید کچھ بھی کہنے سے پہلے ہی وہ دوبارہ بولے۔

''بڑے صاحب کا پیغام ہے میں آپ کو دوا کھلا کر ہی کمرے سے باہر آؤں۔'' اور میں ان کی بات سنتے ہی سوچنے لگا کہ ایک بڑے ابا کے سوا اور بھی تو گھر میں اتنے سارے لوگ موجود ہیں۔ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ جب بابا عبد القادر نے پانی بھرا گلاس میری جانب بڑھا دیا۔ میں نے دوا کھالی تو وہ دوا والی ٹرے اٹھا کر پھر کمرے سے چلے گئے تھے۔

دوپہر کھانے کے بعد میں ذرا استراحت کو لیٹ گیا تھا اور جو عصر کی نماز ادا کرنے کے بعد میں کمرے سے باہر آیا تھا تو میرا مقصد فقط بڑے ابا کے کمرے میں جا کر ان کا حال دریافت کرنا تھا۔ اب اس عمر میں وہ غذا سے زیادہ دوا سے ہی چل رہے تھے۔ پھر میں ان کے کمرے تک پہنچنے ہی والا تھا۔ جب یکایک مجھے اپنے ہاتھ کے ساتھ کسی ننھے سے ہاتھ کے چھونے کا احساس ہوا، اور جو میں نے سر گھما کر دیکھا تو یہ رومی میاں تھے۔ میں نے ان کے مقابل بیٹھتے ہوئے ان کے ہاتھ پر بوسہ دیا تو مجھے ان سے معلوم پڑا کہ وہ میرے لیے کسی کا پیغام لائے تھے اور وہ یومنہ تھی۔ جو اس وقت لان میں بیٹھی میرا انتظار کر رہی تھی۔

رومی میاں کے کاندھے پر ہلکی سی تھپکی لگا کر میں نے کہا کہ انہیں بولنا وہ تھوڑی دیر میں آرہے ہیں اور میں بڑے ابا کے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ ان کے کمرے میں پہنچ کر مجھے معلوم پڑا کہ وہ اپنے کمرے میں ہی نہ تھے اور یوں اب میں لان کی جانب بڑھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ وہ عمر کے اس حصے میں بھی آرام سے کہاں بیٹھنے والے تھے۔ لازماً کسی کا کوئی مسئلہ سلجھانے گئے ہوں گے یا کسی کی مالی اعانت کو پہنچے ہوں گے۔ ان میں اور میرے ابا میں یہی ایک بڑا فرق تھا۔ میرے ابا ٹھہرے آج کی دنیا کے مادہ پرست انسان، آج وہ جس بھی مقام پر تھے وہ سارا مقام و مرتبہ بڑے ابا کی بدولت ہی تو تھا۔ انھوں نے جو اپنی زندگی کے کئی برس بنا کسی لالچ و طمع کے انسانیت کی بھلائی میں صرف کیے تھے۔ میرے ابا آج ان برسوں کا حساب دولت سمیٹ کر چکا رہے تھے۔ کبھی میں بھی ابا کے ساتھ ان کی دولت سمیٹ سیاست کا ایک اہم حصہ تھا لیکن آج مجھے ایک ایم این اے کا بیٹا ہونے پر کوئی فخر محسوس نہ ہوتا تھا۔ آج اگر گھر میں میری کوئی پسندیدہ شخصیت تھے تو وہ بڑے ابا ہی تھے۔ یونہی سوچتے ہوئے میں لان میں لگی کرسیوں تک پہنچ چکا تھا۔

یومنہ مجھے دور سے ہی اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ پاس پہنچ کر میں نے سلام میں پہل کی اور اسے کھڑا دیکھ کر خود بھی بیٹھتے ہوئے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

پھر ایک نظر میں ہی اسے دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس روز ڈائننگ ہال میں مجھ پر طاری ہو جانے والی عجیب کیفیت کو دیکھ کر اس کے ذہن میں ایسے بہت سے سوال اٹھ رہے تھے جن کے جواب وہ مجھ سے حاصل کرنا چاہتی تھی۔ وہ اب ہمارے گھر کے ایک اہم فرد کی طرح تھی۔ اگر وہ مجھ سے کچھ جاننا بھی چاہتی تو مجھے اسے کچھ بتانے میں کوئی حرج محسوس نہ ہوتا، لیکن پھر یہ سوچ کر کہ ابھی اسے ہمارے ہاں آئے دن ہی کتنے بیتے تھے جو یوں میں اس کے سامنے اپنی زبوں حالی کی روداد کھول کر بیٹھ جاؤں۔ ''آج آپ کی پریذنٹیشن کیسی رہی؟''اس سے پہلے کہ وہ مجھ سے کوئی سوال کرتی میں نے موضوع ہی بدل ڈالا۔

''جی۔۔۔ دراصل میری باری آنے تک پیریڈ ٹائم آف ہو گیا تھا، یوں اب میری پریذنٹیشن کل ہو گی۔''اس نے ایک دم سے چونک کر جواب دیا۔ گویا وہ کسی گہری سوچ میں محو تھی۔ اسے پھر سے خاموش پا کر میں بولا۔

''اب اگر آپ کو کسی بھی قسم کی مدد کی ضرورت ہو تو بولیے گا۔'' وہ میری یہ بات سن کر مسکائی اور کہنے لگی کہ اس نے رومی کو میرے پاس اسی مقصد سے بھیجا تھا۔ پھر وہ مجھے اپنی تیاری سے متعلق آگاہ کرنے لگی۔ اسے سننے کے بعد ہی مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کافی اچھے ذہن کی مالک تھی۔ وہ ہگ بوسون کے اس نئے دریافت ہونے والے ذرّے اور اس کی ساخت کو طبعی یا حسابی انداز میں کلیے سے بڑی مہارت سے بیان کر سکتی تھی۔ اس کی تیاری ایک اعلیٰ پریذنٹیشن کے لیے کافی تھی۔ وہ بول چکی تھی، اب میری باری تھی۔ میں نے فقط اس کی معلومات کی ترتیب کو درست کیا۔ اسے بتایا کہ وہ پریذنٹیشن کا آغاز وہاں سے کرے جب ایک عظیم و عالیشان تقریب کے دوران ہگ اور بوسون ہر رنگ و نسل اور مذہب سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے سامنے بے ساختہ پکار اٹھے تھے۔

''یس آئی ایم دا بلیور'' ایسا کہتے ہوئے میں اسے دیکھ رہا تھا کہ وہ مجھے سن کر جہاں اسے میری کوئی بات مفید لگتی، وہ اپنے پاس رکھی نوٹ بک میں اسے درج کر لیتی تھی اور جونہی میری بات مکمل ہوئی تو اب وہ مجھے کچھ الگ ہی انداز سے دیکھ رہی تھی۔ پھر اس کے استفسار پر کہ مجھے یہ سبھی معلومات کیسے حاصل ہوئیں۔ میں نے اسے آج سرچ کے حوالے سے آگاہ کیا۔ گویا یوں ہمیں وہاں بیٹھے وقت کے بیتنے کا جیسے احساس ہی نہ ہوا تھا، اب سورج غروب ہونے کو ہی تھا۔ میرے یومنہ کے ساتھ آکر بیٹھنے کے بعد مجھے اندازہ تھا کہ اب وہاں کوئی اور نہیں آئے گا۔ بڑے ابا تو دور کی بات بھابھی، بچوں تک کو میرے قریب نہ آنے دیتی تھی۔ رومی میاں ابھی دو ماہ کے ہی تھے جب میری طبیعت بگڑ گئی تھی اور جب میری حالت سنبھلی اور میں اپنے گرد و پیش کے ماحول کو ذرا سمجھنے کے قابل ہوا تو رومی میاں بڑے ہو چکے تھے اور پھر صائم میاں جو دنیا میں آئے تو میرا کتنا جی چاہتا کہ میں انہیں انگلی پکڑ کر چلنا سکھاؤں، جب وہ اپنے لڑکھڑاتے قدموں سے میری جانب بڑھتے تو اسے گرنے سے پہلے ہی اٹھا کر اپنی بانہوں میں سمیٹ لوں۔ اوپر ہوا میں جو اچھالوں تو اس کے معصوم قہقہے میرے کانوں میں کیسا سرور بھر دیں اور جو وہ اپنے دودھ کے دانتوں سے میرے ہاتھوں پر کاٹے تو

میں اس میٹھے درد کے احساس کو محسوس کرنا چاہتا تھا لیکن بھابی کیا سمجھتی میرے ایسے جذبات کو، ان کے نزدیک تو میں ایک خبطی، جنونی انسان تھا جو کسی بھی لمحے ان کے بچوں کو نقصان پہنچا سکتا تھا۔ ''اشھد ان لا الہ الا اللہ'' ایک دم سے میں خیالوں کے دائرے سے پلٹا، مغرب کی اذان شروع ہو چکی تھی اور یومنہ بھی مجھ سے اجازت لے کر جا چکی تھی۔ میں جھٹ سے اٹھا وضو تو تھا ہی وہیں سے سیدھا مسجد کی جانب چل پڑا۔

گھر سے مسجد تک کا فاصلہ اتنا تھا کہ تکبیر تحریمہ کے ساتھ شامل ہونے کے لیے مجھے اذان کے شروع ہونے سے ذرا پہلے گھر سے چلنا ہوتا تھا اور اب میرے گھر سے نکلنے تک موؤذن نصف سے زیادہ اذان کہہ چکا تھا۔ یوں میرے مسجد میں پہنچنے تک جماعت کھڑی ہو چکی تھی لیکن مجھے پہلی ہی رکعت میں جا ملنے کا موقع مل گیا تھا۔ فرض نماز کی ادائیگی کے بعد سنتیں اور نوافل ادا کر کے میں رب سوہنے کی رحمت کے برستے انوار میں بھیگنے کے لیے وہیں بیٹھا رہا۔ بسا اوقات مسجد میں یونہی بیٹھے ہوئے مجھے وہی پہلے ساطۂ عالم یاد آنے لگتا اور ساتھ ہی مجھے وہ نماز یاد آنے لگتی تھی جو ایک بار میں نے اپنے دوستوں کے ساتھ ادا کی تھی۔

ایک روز جو ہم دوستوں کا گروپ یونیورسٹی سے نکلا تو ہمیں ہر سمت سے اذان کی آوازیں آتی سنائی دے رہی تھیں۔ اس روز ہمارے ساتھ ایک نیا لڑکا اعظم بھی تھا۔ وہ جو نماز پڑھنے کا عادی تھا، تو اس روز اس نے ہمیں بھی مسجد چل کر نماز ادا کرنے کی دعوت دی۔ اس کی دعوت پر جو میرے دوست مسجد کی جانب بڑھے تو لامحالہ مجھے بھی ان کے ساتھ چلنا پڑا تھا۔ وگرنہ میں تو کبھی عید کی نماز ادا کرنے کسی عید گاہ تک بھی نہ گیا تھا۔ میری اس روز ادا کی نماز کی حرکات و سکنات کچھ یوں تھیں جیسے کسی نے چلتی وڈیو کو چار گنا کے حساب سے فارورڈ پر چلا دیا ہو۔ دوسروں کے دو رکعت ادا کرنے تک میں باہر کھڑا اپنے دوستوں کے باہر آنے کا انتظار کر رہا تھا اور آج مجھے کیسا سرور ملتا تھا، نماز میں ایک ایک رکعت کو ادا کرنے میں۔

یہی سوچ کر بے ساختہ میرے لب سے ادا ہونے لگا تھا کہ وہی ستار العیوب ہے جو ہماری برائیوں کو اچھائیوں سے بدلتا ہے۔ پھر میں مسجد سے جو باہر نکلا تو میرے دل کی طرح باہر کا موسم بھی بدل چکا تھا۔ گھٹا نے جو رم جھم سی برسا رکھی تھی تو ساتھ ہی سنسناتی ہوائیں بھی چل رہی تھیں۔ اس برستی پھوار اور رم جھم میں، میں گھر پہنچنے تک کوئی بھیگنے والا نہ تھا، ایسا سوچتے ہوئے میں نے جیسے ہی اپنا پہلا قدم آگے بڑھایا تو تیز ہوا کے جھونکے سے اپنے کاندھوں کے گرد اوڑھی چادر کو میں نے بہ مشکل کھلنے سے روکا تھا لیکن میں ٹھہرا نہیں اور اب راستہ بھر میں سوچتا چلا جا رہا تھا کہ بابا رب نواز کی دی یہ چادر کیسا طلسماتی چولا ثابت ہو رہی تھی۔ پہلے تو اس نے میرے جسم کو حرارت پہنچا کر میری روح تک کو گرما دیا تھا اور اب چل رہی یخ بستہ ہواؤں کے سامنے بھی ڈھال ثابت ہو رہی تھی۔ ساتھ ہی مجھے یاد آنے لگا کہ بابا رب نواز نے ہدایت کی تھی کہ ''میاں جب اچھے ہو جاؤ تو اسی جگہ آ کر مجھے یہ چادر لوٹا جانا۔'' ایسا یاد آتے ہی میں نے ارادہ کر لیا کہ جو اب بڑے ابا ملیں گے تو میں ان سے اس سلسلے میں بات کروں گا۔

گھر پہنچ کر میں سیدھا اپنے کمرے میں چلا آیا تھا۔ پھر اوڑھی ہوئی چادر پر جو نمی تھی، اسے میں نے جھاڑ کر ایک طرف پھیلا دیا تھا اور بستر پر جو ذرا سی دیر آرام کرنے کو لیٹا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہونے لگی تھی۔ میں نے آواز دی تو بابا عبد القادر دوا والی ٹرے ہاتھوں میں اٹھائے اندر داخل ہوئے۔ انہیں کمرے میں داخل ہوتا دیکھ کر میں فوراً ہی اٹھ بیٹھا تھا۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ اب وہ مجھے دوا کھلائے بغیر کمرے سے نکلنے والے نہ تھے۔ یہی وجہ تھی کہ پھر کسی بھی حجت کے بغیر میں نے دوا کھالی تھی۔

اگلے روز ناشتے کی میز پر یومنہ میرے پہنچنے سے پہلے ہی موجود تھی اور میرے وہاں بیٹھنے کے بعد مجھے یہ اندازہ لگانے میں ذرا دیر نہ لگی تھی کہ میرے پہنچنے سے پہلے وہاں میری ہی باتیں ہو رہی تھیں۔ یومنہ اپنی پریذنٹیشن کے لیے مجھ سے حاصل ہوئی معلومات سے سبھی کو آگاہ کر چکی تھی۔ پھر ناشتہ کرتے ہوئے وہ یکایک مجھ سے مخاطب ہوئی۔

''طٰہٰ آج آپ میرے ساتھ یونیورسٹی چل سکتے ہیں؟'' اس کی بات سن کر فقط میں ہی نہیں باقی لوگوں نے بھی ناشتہ چھوڑ کر یوں حیرت سے اس کی جانب دیکھا۔ گویا اس نے کوئی ناممکن سی بات کہہ دی ہو۔ جب اس کی بات ختم ہوئی تو میں کیا کوئی جواب دیتا، بڑے ابا فوراً ہی قہقہہ لگاتے ہوئے بولے۔

''بھئی کیوں نہیں جائے گا۔'' پھر وہ میری جانب مسکا کر دیکھتے ہوئے بولے۔ ''طٰہٰ میاں ذرا آج اپنے خاص وقت میں سے کچھ وقت یومنہ بیٹی کے لیے بھی نکال کر اس کی یونیورسٹی چلے جانا۔'' اب کی بار جو بڑے ابا بھی اس کے ہم آواز ہو کر بول اٹھے پھر میں بھلا ان کی کسی بھی بات کو رد کرنے سے متعلق سوچ بھی کیسے سکتا تھا۔ یوں میں نے مختصر سا جواب دے کر ہامی بھر لی تھی اور میری ماں اور ابا یوں حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے جیسے آج کوئی اَن ہونی ہو گئی ہو۔ ماں نے جواب کی بار میری جانب دیکھا تو وہاں مجھے ممتا کی وہی پیاسی جھلک دکھائی دی۔

مجھے احساس تھا کہ میری ذات سے جڑے ان کے کتنے ارمان تھے، اگر وہ مجھ سے خفا تھے تو یہ بھی ظاہر اً ہی تھا۔ میں نے کبھی ان کی بات جو نہ مانی تھی۔ آخر کو تھے تو ماں باپ ہی۔ چاہے میرے ان سے کتنے ہی اختلافات کیوں نہ ہوں وہ مجھ سے کتنا ہی خفا کیوں نہ ہوں، لیکن اس رشتے کی عظمت ان سب باتوں سے بڑی تھی۔

ڈائننگ ہال سے اپنے کمرے میں پہنچ کر مجھے خود پر غصہ آ رہا تھا کہ میں نے یومنہ کے ساتھ اس کی یونیورسٹی چلنے کے لیے ہامی کیوں بھر لی تھی؟ لیکن بات تو وہاں سے شروع ہوئی تھی جب یومنہ نے مجھ سے اپنی پریذنٹیشن کے لیے مدد چاہی تھی اگر میں اسی روز انکار کر دیتا تو آج یہ نوبت نہ آتی۔

میں جو کہ عرصہ دراز سے ایک تنہائی سی تنہائی کا شکار تھا، تو یہ میرے چاروں طرف جیسے کوئی مکڑی کا سا جالا بن چکی تھی۔ مجھے اس تنہائی سے پیچھا چھڑانا دشوار معلوم ہوتا تھا، اسی لیے گھر میں یا خاندان بھر کی کسی بھی تقریب میں، میں جانے سے کتراتا تھا۔ بسا اوقات گھر میں منعقدہ کسی تقریب میں، میں بھولے سے پہنچ جاتا تو پھر سبھی کو میرا وجود وہاں گراں گزرتا۔ وہ اب اس بات کے

عادی ہو چکے تھے کہ میں کسی بھی قسم کی زندگی کی پہلی سی رعنائیوں کا حصہ نہیں بننا چاہتا، یوں وہ مجھے کسی قسم کی مصروفیت سے آگاہ کرنا بھی مناسب نہ سمجھتے تھے اور جو کبھی میں انجانے میں گھر میں منعقدہ کسی تقریب میں اچانک سے جا پہنچتا تو مجھے وہاں پا کر جوان کا عزو وقار مجروح ہونے لگتا تو پھر وہ چاہتے کہ میں جلد سے جلد وہاں سے ہٹ جاؤں۔ اس بات کا مجھے خود بھی احساس ہوتا اور میں وہاں سے ہٹنے میں ذرا وقت نہ لگاتا۔ ابھی اپنے کمرے میں پہنچ کر میں ایسی ہی کشمکش کا شکار تھا کہ یارب جیسا میں نے حلیہ بنا رکھا ہے، اسی حلیے میں، میں اس کے ساتھ چلوں گا تو وہ کیسا محسوس کرے گی۔ یونیورسٹی میں اس کی کلاس میٹس بھی ہوں گی وہ لازماً مجھے ان سے بھی ملوائے گی، تو یوں وہاں اس کا امیج خراب ہو گا اور میں بھلا ایسا کیونکر چاہوں گا۔

ایسا ہی سوچ کر آج عرصہ دراز کے بعد میں نے ان بند کبرڈ کے پٹ کھولے جہاں وہ سارے ملبوسات میرا انتظار کر رہے تھے جو ماں، ابا اور بھائی میری گزری ہر سال گرہ پر مجھے تحفتاً دیتے آئے تھے، لیکن میں نے ان کو استعمال کرنا تو دور کی بات کبھی ٹھیک سے دیکھا تک بھی نہ تھا پھر جس سوٹ پر آکر میرا ہاتھ رک گیا تھا، وہ فقط ایک ہی شخص مجھے گفٹ کر سکتا تھا، اور وہ جی ایم تھے۔ بڑے بھائی غلام مصطفیٰ کو میں جی ایم ہی کہہ کر پکارا کرتا تھا، جی ایم میری پسند ناپسند سے اس قدر واقف تھے کہ بارہا یوں ہوتا کہ وہ اپنے لیے لایا سوٹ بھی مجھے دے دیتے کہ میرے تن پر آتے ہی وہ کچھ یوں جچنے لگتا تھا جیسے میرے لیے ہی بنا ہو۔ یا یوں کہہ لیں کہ ہم دو بھائیوں میں جو چیز مشترک تھی وہ لباس کی پسندیدگی ہی تھی۔

پھر لباس تبدیل کرنے کے بعد جو ایک اور کام میں نے کیا وہ بابا رب نواز کی دی چادر تھی جسے میں نے رات خشک ہونے کے لیے پھیلایا تھا اور اب ایک بار پھر سے جھاڑ کر تہہ لگا کر اسے اپنے بستر پر رکھ دیا تھا۔ اس کے بعد میں ڈریسنگ کے سامنے کھڑا بال بنا رہا تھا، بال تو خاصے بڑھ چکے تھے اور داڑھی تو میں باقاعدہ رکھ چکا تھا۔ اپنے شانوں تک دراز بال دیکھ کر مجھے کالج کا زمانہ یاد آنے لگا تھا۔ جب ایسے ہی بال بڑھائے میں پونی کرتا تھا۔ پھر یکایک جو میری نظر گھڑی پر پڑی تو میں نے مزید کمرے میں ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا اور اپنے کمرے سے نکل کر جو میں پورچ میں پہنچا تو مائیکل ہمارا ڈرائیور مجھے دیکھ کر جیسے دنگ رہ گیا۔ میں اسے اپنی جانب بڑھتا دیکھ کر وہیں ٹھہر گیا۔ تو وہ خوشی سے کیسا سرشار بے قابو ہو کر میری جانب بڑھا چلا آیا تھا پھر میرے قریب پہنچ کر بے ساختہ اس نے مجھے اپنے گلے سے لگا لیا تھا اور جب یومنہ اپنے ہاتھوں میں ایک بڑی فائل اور چند ایک کتابیں اٹھائے پورچ میں پہنچی تو ایسی ہی کچھ ملتی جلتی حالت اس کی بھی ہو رہی تھی۔ اس نے آج پہلی بار مجھے کالی چادر کے بغیر دیکھا تھا جسے میں ہمہ وقت اوڑھے رکھتا تھا۔ ان سب کے علاوہ کوئی اور بھی تھا جو مجھے دیکھ رہا تھا۔ کوئی اور بھی تھا جو آج برسوں بعد مجھے زندگی کی پہلی سی رعنائیوں میں واپس پلٹتا دیکھ کر اپنے آنسوؤں پر قابو نہ رکھ پایا تھا۔ میں جانتا تھا کہ ماں اور ابا اپنے کمرے کی اس کھڑکی کے پاس کھڑے جہاں سے پورچ کا سارا منظر واضح دکھائی پڑتا تھا مجھے دیکھ رہے تھے اور اپنے آنسوؤں پر قابو نہ رکھ پائے تھے۔ میں یہ جاننے کے باوجود بھی نہ پلٹا اور میں نے اس کھڑکی کی جانب نہ دیکھا جہاں وہ کھڑے مجھ پر نہال ہو رہے تھے۔

یومنہ گاڑی میں بیٹھ چکی تھی۔ میں بھی آگے بڑھ کر مائیکل کے مقابل سیٹ پر بیٹھا تو میرے بیٹھتے ہی مائیکل نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

رم جھم سے شروع ہونے والی بارش رات گئے تک موسلا دھار ہو کر برستی رہی تھی جس کے اثرات ابھی تک جگہ جگہ کھڑے پانی کی صورت میں باقی تھے اور آسمان پر بادل اب بھی کہیں کہیں ٹولیوں کی صورت تیرتے دکھائی پڑ رہے تھے۔ پھر جب کبھی انہی بادلوں کی کوئی مست ٹولی سورج کے سامنے آ کر اس کی کرنوں کو ڈھانپ لیتی تو کہیں دھوپ تو کہیں چھاؤں کا سا منظر دکھائی دیتا۔

ہماری گاڑی سروس روڈ سے نکل کر اب شہر کی ایک اہم مصروف ترین شاہراہ سے گزر رہی تھی۔ سڑک کے بیچ و بیچ لگے برقی کھمبے جن پر موجود قمقمے رات کو روشن کر دیئے جاتے تھے۔ ان کے ساتھ لٹک رہے فلیکس ابا کی الیکشن کے دنوں چلائی سیاسی مہم کی یاد دلا رہے تھے۔ کبھی ان پر ابا کے ہمراہ میری تصاویر بھی آویزاں ہوتی تھیں لیکن آج میں خود ان کی کسی قسم کی سیاسی سرگرمیوں کا حصہ بننا نہیں چاہتا تھا۔

اب ہم یونیورسٹی پہنچنے والے تھے۔ یونیورسٹی گھر سے کوئی زیادہ فاصلے پر نہ تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم یونیورسٹی جا پہنچے تو مائیکل نے گاڑی پارکنگ ایریا میں جا روکی۔ میں اور یومنہ گاڑی سے اترتے ہی یونیورسٹی کی اندرونی عمارت کی جانب بڑھ چکے تھے۔ آگے بڑھتے ہوئے اب مجھے کئی عمارتیں دکھائی دے رہی تھیں اور یومنہ مجھے وہیں سے الگ الگ شعبوں سے متعلقہ عمارتوں کا تعارف اشاروں سے کروا رہی تھی۔ کچھ ہی پل میں ہم اس عمارت تک پہنچ گئے تھے جس کے آڈیٹوریم میں یومنہ کی پریذنٹیشن تھی۔ ہال میں داخل ہونے سے ذرا پہلے میں نے اسے کہا کہ میں اس کے ساتھ آ ہی گیا ہوں تو مجھے واپس جانے کی کوئی جلدی نہیں۔ ایسا میں نے فقط اس مقصد سے کہا تھا تاکہ وہ اطمینان سے اپنی پریذنٹیشن دے سکے اور جب اس کی کلاس مکمل ہو تو ہم پھر لوٹیں، وہ میری یہ بات سن کر اس قدر خوش ہوئی کہ پھر جھٹ سے بولی۔

''طٰہٰ آپ سے میری چند کلاس فیلو بھی ملنا چاہتی ہیں۔'' اس کی بات سن کر مجھے لگا جو بات اس نے پریذنٹیشن مکمل ہونے کے بعد کہنا تھی وہ پہلے ہی کہہ دی تھی۔ میں فقط اس کی بات کے جواب میں مسکرا دیا۔ اب ہم آڈیٹوریم ہال میں پہنچ چکے تھے اور میں پچھلی کسی نشست پر جا بیٹھا تھا، جب کچھ دیر میں پریذنٹیشن کا آغاز ہوا تو پہلی باری یومنہ کی ہی تھی۔ اس نے بگ بوسون تھیوری کا تعارف کروانا شروع کیا تو اس کا موضوع ہی کچھ اس قدر دلچسپ تھا کہ سارے ہال پر جیسے گہرا سکوت طاری ہو گیا اور میری دی معلومات سے بھی اس نے بھرپور استفادہ کیا تھا۔ وہ پُر اعتماد انداز میں اپنی پریذنٹیشن مکمل کرنے کے بعد واپس اپنی نشست پر جا بیٹھی تھی اور یونہی جب ایک، دو اور لڑکیوں نے بھی اپنی پریذنٹیشن مکمل کر لی تو وہ میرے پاس آئی۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ کہیں میں بوریت تو محسوس نہیں کرنے لگا۔ اس کی یہ بات سن کر پہلے تو میں نے اسے خوش دلی سے سراہتے ہوئے بہترین پریذنٹیشن دینے پر داد دی اور پھر اسے کہا کہ اس کی پریذنٹیشن میں نے دیکھ لی ہے اب اگر پیریڈ ختم ہونے تک میں اسے یہاں بیٹھا نہ ملوں تو میں ہال سے باہر کھڑا اس کا انتظار کر رہا ہوں گا۔ وہ میری بات سن کر چلی گئی تو چند لمحوں تک وہیں بیٹھے رہنے کے بعد میں وہاں سے اٹھ کر باہر آ گیا تھا۔

امتحانات کے دن ہونے کی وجہ سے یونیورسٹی تقریباً سنسان دکھائی دے رہی تھی۔ وہاں کھڑے رہ کر مجھے اپنے یونیورسٹی کے دن یاد آنے لگے تھے۔ میں اچھے ذہن کا مالک تھا، لیکن میری سرگرمیاں اچھی نہ تھیں۔ اگر میں بھی اپنی تعلیم کو سنجیدہ لے کر چلا ہوتا تو اگر آج جی۔ ایم کی طرح پی ایچ ڈی نہ بھی ہوتا تو کم سے کم انجینئر یا وکیل تو ضرور ہوتا۔

جب وقت گزر جاتا ہے تو ہم اسے مقدر میں ہی نہ لکھے ہونے کا راگ الاپتے پھرتے ہیں۔ سارا خطا وار اپنے مقدر کو گردانتے لگتے ہیں حالانکہ یہ ہم پر ہی منحصر ہوتا ہے کہ ہم اس خاص وقت کی قدر و اہمیت کو کس حد تک سنجیدہ لیتے ہیں۔ ہم جانتے بوجھتے اس وقت کو بے دریغ غیر معیاری سرگرمیوں میں لٹا دیتے ہیں اور جب وقت اپنی دھیمی دھیمی رفتار سے گزرتا چلا جاتا ہے تو ماضی ایک پچھتاوا بن کر رہ جاتا ہے۔ ایسی ہی سوچوں کے دائرے سے میں اس وقت پلٹا جب مجھے اپنے عقب سے میٹھی چہکاریاں سی سنائی دیں۔ میں سمجھ گیا تھا کہ یومنہ اپنی کلاس میٹس کے ساتھ ہال سے باہر آچکی ہے اور اب وہ میری طرف ہی آرہی ہیں، لیکن یہ جاننے کے باوجود بھی میں پلٹا نہیں، پھر ایک ہاتھ میری جانب بڑھا، ہاتھ کی جانب دیکھتے ہوئے جو میں پلٹا تو یہ یومنہ تھی۔ اس کا میری جانب بڑھا ہوا ہاتھ ابھی تک ہوا میں ہی معلق تھا۔ پھر نہ چاہتے ہوئے بھی مجبوراً مجھے اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دینا پڑا اور ساتھ ہی میری نظر پاس کھڑی تین اور لڑکیوں پر پڑی۔ میرا ہاتھ ابھی تک یومنہ کے ہاتھ میں ہی تھا۔ جب وہ چہکتے ہوئے بولی۔

"مجھے پریزنٹیشن میں بہت اچھے مارکس ملے ہیں۔ آئی ایم رئیلی تھینک فل ٹو یو طہٰ۔"

اس کی بات سن کر مجھے بہت اچھا لگا اور میں سوچنے لگا کہ ساری محنت تو اس کی اپنی ہی تھی پھر وہ اپنا ہاتھ میرے ہاتھ سے جدا کرتے ہوئے مجھے اپنی کلاس میٹس سے ملوانے لگی۔ جانے وہ انہیں میرے متعلق کیا کچھ بتاتی رہی تھی کہ ان کی باتوں سے مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں کوئی برگزیدہ ہستی ہوں، جس کی زبان سے ادا ہوئی ہر بات اللہ کی بارگاہ میں قبول ہو جاتی ہو اور ساتھ ہی مجھے لگنے لگا کہ ہم لوگ کتنے ظاہر پرست ہوتے ہیں۔ بڑھی ہوئی داڑھیاں، لمبی زلفیں اور چہرے پر دکھائی دیتا نور ہی ہمارے نزدیک پہنچے ہوئے لوگوں کی علامتیں بن چکی ہیں۔

پھر باتوں باتوں میں ہی ہم پارکنگ تک پہنچ چکے تھے۔ یومنہ نے اپنی دوستوں کو الوداع کہا اور ہمارے گاڑی میں بیٹھتے ہی مائیکل نے گاڑی آگے بڑھا دی تھی پھر جب تک ہم گھر پہنچتے عصر کی اذانیں شروع ہو چکی تھیں یوں گھر سے قریب ہی واقع مسجد کے پاس سے گزرتے ہوئے میں نے مائیکل کو رکنے کو کہا اور میرے گاڑی سے اترتے ہی مسجد کی جانب بڑھنے تک مائیکل گاڑی لے کر آگے بڑھ چکا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆

باب 3

خواب، خیال اور یادیں

مسجد میں نماز ادا کر کے میں گھر پہنچا تو گھر کے خاص دروازے سے اندر قدم رکھتے ہی مجھے ایک طرف سے بچوں کا شور سنائی پڑا۔ میں نے سر گھما کر دیکھا تو یومنہ بچوں کے ساتھ لان میں بیڈ منٹن کھیل رہی تھی۔ میرے گھر میں داخل ہوتے ہی اس نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا لیکن میں رکا نہیں بلکہ اسے نظر انداز کیے آگے بڑھ چکا تھا۔ ابھی میں نے چند قدم ہی آگے بڑھائے ہوں گے کہ جب مجھے اپنے عقب سے یومنہ کی آواز سنائی دی۔ وہ مجھے رکنے کے لیے کہہ رہی تھی۔ اس کی آواز سن کر مجھے رکنا پڑا اور میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ بچوں کے ساتھ ریکٹ ہاتھ میں تھامے جوشیلے انداز میں میری جانب بڑھی چلی آ رہی تھی پھر میرے قریب پہنچنے سے پہلے ہی اس نے کچھ دور سے ہی ریکٹ میری جانب اچھال دی۔

"طہٰ کیچ اِٹ اینڈ۔۔۔" اور باقی کہ چند الفاظ جیسے اس کے حلق میں ہی دب گئے تھے۔ میں اپنی جگہ سے ہلا تک نہ تھا اور نہ ہی اس کے ہوا میں اچھالے ریکٹ کو میں نے آگے بڑھ کر تھامنے کی کوشش کی تھی۔ اسے مہمان سمجھ کر اب تک جو میں نے اس کے ساتھ وقت گزارا تھا تو وہ یوں مجھ سے بے تکلف ہو رہی تھی۔ مجھے اس کی بیڈ منٹن کھیلنے کی آفر پر سخت غصہ آ رہا تھا، اسی لیے میں مزید وہاں اک لمحے کو بھی نہ ٹھہر سکا تھا اور تیز تیز قدم اٹھاتا اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا تھا۔ میرا ایسا رویہ دیکھ کر جیسے یکایک اس کے چہرے پر پژمردگی سی چھا گئی تھی۔ وہ متعجب سا ہو کر چند قدم آگے بڑھی جیسے مجھے پھر سے روکنا چاہتی ہو اور پھر وہیں ٹھہر کر اس نے زمین پر گرے ریکٹ کو اٹھایا اور سراسیمہ ہو کر مجھے جاتا ہوا دیکھتی رہی۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر بھی میرا غصہ کم نہ ہوا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ پہلے مجھے اس پر غصہ آ رہا تھا اور اب خود پر آنے لگا تھا، مجھے دیکھتے ہی اس نے چہکتے ہوئے خوشی سے سرشار کیسے ریکٹ کو میری جانب اچھالا تھا اور اپنے ساتھ کھیلنے کی دعوت دی تھی لیکن میرے نظر انداز کرنے پر پھر اسے کس قدر تکلیف پہنچی ہو گی، ایسا ہی کچھ سوچتے ہوئے میں مضطرب سا ہو کر کبھی آرام کرسی پر جا بیٹھتا تو کبھی بستر پر لیٹ جاتا اور سوچنے لگتا کہ مجھے اس کے ساتھ ایسا سلوک اختیار نہیں کرنا چاہیے تھا۔

اسے ہمارے ہاں آئے ابھی دن ہی کتنے بیتے تھے اور وہ یوں میری ذات سے قریب تر ہوتی چلی جا رہی تھی، میرے ماضی سے جڑی حقیقت کا اسے کچھ تو ادراک ہو ہی چکا ہو گا۔ بڑے ابا سے نہیں، ماں، ابا اور بھائی سے بھی نہیں یا گھر کے کسی ملازم سے نہ سہی وہ اب تک بھابی سے تو جان پہچان بنا چکی تھی وہ اسے میرے متعلق کچھ نہ کچھ تو بتاتی ہوں گی، یوں پھر اسے میرا احترام نہیں کرنا چاہیے تھا،

مجھ سے اسے کسی قسم کی کوئی ہمدردی بھی نہیں ہونی چاہیے تھی اور میں کسی قسم کی ہمدردی کے قابل ہی کہاں تھا۔ اگر ایسا تھا تو پھر عبیرہ بھی تو میرے دل سے زیادہ قریب تھی۔

ہم زندگی میں جن دوستوں پر اپنی ذات سے زیادہ اعتبار کرتے ہیں، سمجھتے ہیں کہ وہ ہمارے بنا رہ ہی نہیں سکتے، ہمارے لیے وہ اپنی جان تک دے سکتے ہیں، انہیں ہم سے اس قدر محبت ہے، وہی اپنے بن کر دغا دے جاتے ہیں۔ شاید زندگی کو اسی لیے ایک معلم کی طرح کہا گیا ہے کہ وقت بیتنے کے ساتھ ساتھ یہ ہمیں کئی طرح کے درس دیتی ہے۔

یونہی وقت نے مجھے بھی ایک ایسی ہی حقیقت سے لذت آشنائی دلائی تھی۔ یہ خیال آتے ہی میں دھیرے دھیرے اپنے ماضی میں اترنے لگا تھا۔ جب ان دنوں مجھ پر اک عجیب سیمابی کیفیت طاری رہتی تھی، مجھ سے سرزد ہوئے گناہوں کا بوجھ مجھے کسی کروٹ چین نہ لینے دیتا تھا اور میں بے کل سا ہو کر یہ سوچ کر گھر سے باہر چلا جاتا تاکہ باہر کی رونق میں کسی طرح سے اپنے دل کو بہلا سکوں، اپنے ضمیر کی آواز کو دبا سکوں لیکن پھر وہی باہر کی رونق میرے لیے عذاب بن جاتی اور میں مضمحل سا ہو کر وہاں سے سیدھا گھر پلٹ آتا، گھر پہنچ کر اپنے کمرے کو مقفل کر کے بستر پر پڑا رہتا اور چند لمحے ہی راحت میں کٹتے کہ پھر سے دھیرے دھیرے میرا کمرہ بازگشت بننے لگتا اور میرے ضمیر کی آہنی ضربیں مجھے بے کل سا کیے دیتیں اور جب یہ خاموشی میں گونجنے والی بازگشت میرے اعصاب پر بھاری ہونے لگتی تو میں سوچنے لگتا کہ کسی سے اپنی کیفیت بیان کروں تو ہو سکتا ہے کچھ راحت نصیب ہو لیکن کہوں تو کسے، ماں اور ابا تو میرا چہرہ تک نہ دیکھنا چاہتے تھے۔ بھابی اور بھائی بھی مجھ سے خفا تھے۔ اک بڑے ابا ہی تھے تو انہیں میں اپنی بپتا سنا کر مزید آزردہ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ یونہی ژولیدہ حال ہو کر میں ہیوی بائیک لے کر جو گھر سے نکلتا تو میرا مقصد فقط اپنے کسی دوست سے مل کر دل کا بوجھ ہلکا کرنا ہوتا تھا۔ اسی مقصد سے پچھلے کئی روز سے میں عبیرہ کے گھر کے چکر لگا چکا تھا اور ہر بار مجھے اس کے گھر کے ملازم سے یہی سننے کو ملتا کہ بی بی صاحبہ گھر پر نہیں ہیں۔

آج میں نے پھر سے اس سے ملنے کی خاطر اپنی بائیک اس کے گھر سے باہر جا روکی تھی۔ سوئچ آف کر کے میں بائیک سے اترنے لگا تو جیسے اپنے پیروں پر لڑکھڑا سا گیا تھا۔ میں نشے میں کب تھا، بلکہ اب تو میں ہر قسم کا نشہ ترک کر چکا تھا۔ پھر شاید یہ ان چیزوں کی طلب تھی لیکن ایسا بھی نہ تھا، میں کئی بار چیلنج کے طور پر نشہ ترک کر چکا تھا اور مجھے ایسا کرنے میں اب مہارت حاصل ہو چکی تھی۔

یقیناً پھر یہ میرے دل کا بوجھ تھا، یا میرے ضمیر کی آواز تھی، جو اب جاگ چکا تھا اور دل کا بوجھ ایک بھاری نشہ بن کر میرے اعصاب سلب کیے جا رہا تھا۔ میں کافی عرصہ تو صبر کرتا رہا خود سے ہی لڑتا رہا۔ بارہا سوچتا رہا کہ اگر میں اپنے ماضی کو بھلا نہ سکوں تو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لامحالہ اس کے ساتھ جینا تو سیکھ ہی لوں گا لیکن پھر ہر بیتا دن ہر بیتا لمحہ مجھے پہلے سے بھاری لگنے لگتا تھا۔ اپنے اوپر طاری اسی بوجھ کو کسی طرح سے ہلکا کرنے کی خاطر میں عبیرہ سے ملنے آیا تھا۔ یکایک مجھے آہنی دروازے کا چھوٹا پٹ کھلنے کی آواز آئی، میں بیل بجا کر اب دروازے کے پاس ہی دیوار سے پشت ٹکائے آنکھیں موندے کھڑا تھا۔

"صاحب آپ۔''ملازم نے باہر نکلتے ہی حیرت سے میری جانب دیکھ کر کہا۔

"مجھے عبیرہ سے ملنا ہے۔''حیرت زدہ سے کھڑے ملازم کی بات سن کر میں نے جواب دیا۔

"صاحب عبیرہ بی بی تو سو چکی ہیں۔''ملازم نے فوراً جواب دیا جسے سن کر میں نے اپنی جیب سے فون نکالا، ابھی پونے دس ہو رہے تھے۔وہ اتنی جلدی سونے کی عادی نہ تھی۔میں نے سوچا۔

"دیکھنا اگر سوئی ہوئی ہیں تو ابھی جاگ جائیں گی تمہاری بی بی صاحبہ۔''میں نے فون سے عبیرہ کا نمبر ملا کر اپنے سامنے کھڑے ملازم کو یوں دیکھتے ہوئے یہ بات کہی جیسے اس کی کوئی چوری پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔

لیکن شاید وہ صحیح کہہ رہا تھا۔عبیرہ نے میرے دو، تین بار کال کرنے پر بھی کال وصول نہ کی تھی۔اب میں ملازم سے کیا کہتا۔وہ میرے قریب ہی کھڑا یہ دیکھ رہا تھا کہ میرے بارہا کال کرنے کے باوجود عبیرہ نے میری کال ریسیو نہ کی تھی تو اس نے پلٹ کر دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا اور میں بائیک اسٹارٹ کرنے کے بعد جیسے ابھی تک تذبذب کا شکار اوپر بالکونی کی جانب دیکھ رہا تھا۔ بالاخانہ کی پہلی منزل پر بالکونی سے ملحقہ کمرہ عبیرہ کا ہی تھا جہاں برقی قمقمے بھی روشن دکھائی دے رہے تھے۔پھر جانے مجھے کیا سوجھی میں نے جو بائیک اسٹارٹ کی تھی تو فوراً ہی بند کرتے ہوئے اسے ذرا پیچھے لے جاکر دیوار کے ساتھ لگا کر کھڑا کیا پھر ایک پیر بائیک پر ٹکاتے ہوئے ذرا سا سہارا لے کر میں دیوار پر چڑھا اور اگلے ہی لمحے اندر کود گیا تھا۔

میرے لیے اس انداز میں عبیرہ کے کمرے تک پہنچنا کوئی نئی یا انوکھی بات بھی نہ تھی۔اکثر عید کا تحفہ اسے میں اسی انداز میں آکر دیا کرتا تھا لیکن اندر کودتے ہی یکایک جو مجھے اس کے گھر میں موجود سر بین ڈاگ کا خیال آیا تو جیسے میرے وجود میں سنسنی سی دوڑ گئی تھی۔میں وقت ضائع کیے بغیر ہی جھٹ سے اس پائپ تک جا پہنچا جس کے سہارے مجھے بالکونی تک پہنچنا تھا۔اوپر پہنچ کر میں نے دیکھا کہ عبیرہ کے کمرے کی لائٹ آف تھی۔میں نے بالکونی میں کھلنے والے دروازے کو ذرا سا دبایا، وہ اندر سے بند تھا، لیکن مجھے اندر سے مدھم سی آواز سنائی دی۔میں اس آواز کو پہچان گیا تھا۔وہ عبیرہ کی ہی آواز تھی۔وہ فون پر کسی سے بات کر رہی تھی۔میں دروازے سے ہٹ کر کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا۔یہاں مجھے اس کی آواز واضح سنائی دے رہی تھی۔وہ ابھی تک فون پر کسی سے باتیں کر رہی تھی۔جب میں نے اپنے کان کھڑکی سے لگا دیئے۔''طٰہٰ پاگل ہو چکا ہے۔داؤد مجھے اس بات کی سمجھ نہیں آتی ایسے پاگل شخص کو کسی نے یوں کھلا کیوں چھوڑ رکھا ہے۔آج پھر آیا تھا، میرے گھر وہ تو اچھا ہوا جو میں نے پہلے سے ہی ملازم سے کہہ رکھا تھا کہ وہ موقع محل دیکھ کر اسے مناسب جواب دے دیا کرے۔نہیں تو آج مجھے اس کی ایب نارمل باتیں برداشت کرنا پڑتیں۔''

داؤد کو تو میں جانتا تھا، لیکن عبیرہ۔۔۔تم ایسی نکلو گی یہ میں نہیں جانتا تھا۔نہ جانے کیوں میری آنکھیں یوں برس پڑیں یارب۔۔۔اور میں اگلے چند لمحوں تک گھٹنوں میں سر دیئے دیوار کا سہارا لے کر وہیں بیٹھا رہا۔

جہاں ایک جانب میں اس کی بے وفائی پر رنجیدہ آنسو بہا رہا تھا تو دوسری طرف عبیرہ اب قہقہے لگا لگا کر داؤد سے باتیں کر رہی تھی جب اس کے قہقہے میرے اعصاب پر بھاری ہونے لگے تو طیش میں آ کر میرا جی چاہا میں کھڑکی یا دروازہ توڑ کر اندر جاؤں اور عبیرہ کا گلا دبوچ لوں اور اس وقت چھوڑوں جب اس بے وفا کے قفس سے روح پرواز کر جائے لیکن اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے میں نے ایسا کوئی قدم اٹھانے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ جب میرے اپنے مجھ سے روٹھ گئے تھے۔ دوست احباب ساتھی سبھی منہ موڑ گئے تھے اور رہی سہی کسر میرے ضمیر اور دل کی آوازوں نے پوری کر دی تھیں۔ تو ایسے میں عبیرہ نے ٹھیک ہی تو کہا تھا کہ مجھ جیسے پاگل شخص کو بھلا یہاں کیوں ہونا چاہیے۔ میں نے بائیک اسٹارٹ کرتے ہوئے یوں دیوانوں کے سے انداز میں قہقہہ لگاتے ہوئے کہا اور بائیک واپس گھر کی جانب بڑھا دی۔

اگلے چند روز مجھے شدید بخار نے آ لیا۔ اس قدر شدید بخار نے مجھ سے جیسے میری سدھ بدھ ہی چھین لی تھی اور میں کئی روز تک ایسے ہی نیم بے ہوشی کے عالم میں پڑا رہا، پھر مجھے چند روز بعد ذرا ہوش آیا تو میرے سرہانے مجھے بڑے ابا ہی دکھائی دیئے۔ وہ آنکھیں موندے اپنے سر کو دیوار سے ٹکائے ہاتھ میں تسبیح لیے بیٹھے تھے۔ میری وجہ سے ان کا سکون بھی غارت ہو چکا تھا۔ کتنا برا تھا میں یا رب مجھے موت کیوں نہیں آ جاتی۔ میں نے جو لمحہ بھر کو اپنی آنکھیں کھولی تھیں تو بڑے ابا کو یوں بے آرام پا کر بے تاب ہو کر پھر سے موندھ لیں۔

یکایک مجھے دروازے پر دستک سنائی دی۔ جب دستک مسلسل ہوتی رہی تو میں نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ آنکھیں کھولنے پر چند لمحوں تک مجھے یونہی محسوس ہوتا رہا جیسے میرا وجود شدید بخار سے تپ رہا ہو۔ گویا میں خیالوں ہی خیالوں میں جو اپنے بیتے کل میں جا اترا تھا تو بیتے دنوں کا کرب مجھ میں پھر سے جاگ اٹھا تھا۔ میں آنکھیں ملتے ہوئے دروازے تک پہنچا اور دروازہ کھولا تو میرے سامنے یومنہ کھڑی تھی۔ اسے دیکھتے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ وہ مجھ سے ملنے کیوں آئی ہے۔ اس کے سلام کا جواب دیتے ہی میں نے اپنے سخت رویے کی وجہ سے اس کی دل آزاری کے لیے اس سے معذرت چاہی۔ میری بات سنتے ہی وہ میری سوچ کے برعکس فوراً بولی۔

ارے طٰہٰ اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ اپنوں سے بھلا کوئی معذرت چاہتا ہے۔ مجھے آپ سے ایک کام تھا۔ میں اسی لیے آئی ہوں۔'' اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے میں یہی سوچ رہا تھا کہ شاید اسے میرے سخت رویے کی وجہ سے دکھ پہنچا ہو گا لیکن اس کے رویے سے مجھے ایسا کچھ محسوس نہیں ہوا۔ بلکہ اس کی باتوں میں تو کس قدر اپنائیت تھی۔ مجھے خاموش پا کر وہ پھر سے بولی۔

"دراصل اس ویک اینڈ پر چند چھٹیاں آ رہی ہیں۔ جن میں مجھے گھر جانا ہے، لیکن اس سے پہلے مجھے کچھ خریداری کرنا تھی۔ اگر آپ میرے ساتھ چل سکیں تو مجھے بہت اچھا لگے گا۔'' وہ اپنی بات کہہ چکی تھی اور اب میرے جواب کی منتظر کھڑی تھی۔ اس کی بات سن کر میں گم صم سا یہ فیصلہ ہی نہیں کر پا رہا تھا کہ میں اسے کیا جواب دوں پھر لا محالا جو میں نے ہامی بھر لی تو اس کا چہرہ یوں خوشی سے کھل اٹھا تھا۔ وہ مجھے آج شام کا وقت بتا کر چلی گئی اور میں وہیں چپ چاپ سا کھڑا چند لمحوں تک سوچتا رہا کہ میرے جیسے شخص کے

ساتھ وقت بیتانے میں بھی کوئی خوشی محسوس کر سکتا ہے۔ ذرا شام سے پہلے میں ایک بار پھر سے اسی قسم کی کشمکش سے دوچار ہو رہا تھا کبھی تو میرا جی چاہتا کہ میں کوئی بہانہ بنا کر اس کے ساتھ چلنے سے انکار کر دوں یا کہیں باہر نکل جاؤں اور پھر جب دوبارہ اس سے ملاقات ہو تو اسے کہہ دوں کہ مجھے کسی ضروری کام سے باہر جانا پڑ گیا تھا۔ میں یونہی منصوبے بنا رہا تھا کہ جب بابا عبد القادر یومنہ کا پیغام لے کر میرے کمرے میں پہنچے۔

وہ مجھے کہنے آئے تھے کہ یومنہ پورچ میں کھڑی میرا انتظار کر رہی ہے۔ یوں اب میرا کچھ بھی سوچنا بے کار تھا۔ میں بابا عبد القادر کے تعاقب میں پورچ تک پہنچا تو یومنہ گاڑی کے پاس کھڑی میرا ہی انتظار کر رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے سلام کیا اور میں نے جواب دیتے ہوئے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی تو پھر اس کے بیٹھتے ہی میں نے گاڑی آگے بڑھا دی تھی۔

گھر کے خاص دروازے سے نکل کر ایک طرف کو مڑتے ہوئے میری نظر گاڑی میں نصب میوزک سسٹم پر پڑی جسے کبھی میں گاڑی میں بیٹھتے ہی آن کر لیا کرتا تھا تو خاص قسم کے ووفر سسٹم سے پیدا ہونے والے ارتعاش سے قریبی گھروں کے دریچے اور شیشے لرزا اٹھا کرتے تھے اور وقت بے وقت تنگ ہونے پر لوگ مجھے کوستے بھی ہوں گے لیکن آج مجھے ان چیزوں میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ گاڑی میں کافی دیر سے خاموشی تھی اور میری نظریں آگے بڑھتی شاہراہ پر ہی مرکوز تھیں۔ جب یکایک یومنہ نے اس خاموشی کو توڑا۔

"آپ سے ایک سوال پوچھوں۔"

"آپ مجھے شرمندہ کر رہی ہیں۔ یومنہ سوال پوچھنے کے لیے آپ کو میری اجازت کی ضرورت نہیں۔" وہ کچھ پوچھنے میں خوف محسوس کر رہی تھی۔ جب میں نے اس کے خدشات دور کرنے کے لیے فوراً جواب دیا۔ میرا جواب پا کر وہ چند لمحوں کے توقف کے بعد کچھ سوچتے ہوئے دوبارہ بولی۔

"آپ ہمیشہ عبادت میں کیوں مشغول رہتے ہیں حالانکہ آپ کی عمر کے لوگ تو فرائض تک کی ادائیگی سے دور بھاگتے ہیں؟" یومنہ اپنی بات کہہ چکی تھی اور اب جواب کی منتظر تھی جب کہ میں سوچ رہا تھا کہ ایسا سوال کرنے والی وہ پہلی لڑکی تھی کبھی تو اپنے دل کی کیفیات بیان کرنے کے لیے میں کوئی رازداں ڈھونڈا کرتا تھا اور لوگ مجھ سے دور بھاگتے تھے اور آج جب میں نے چپ سادھ لی تھی تو کسی نے یوں اپنائیت سے کچھ جاننا چاہا تھا۔ جس کا جواب بھی میں پوری ایمانداری سے دینا چاہتا تھا۔

"آپ ہمیشہ عبادت میں کیوں مشغول رہتے ہیں، یہی سوال ہے ناں آپ کا؟" اسے مخاطب کرتے ہوئے میری نگاہیں آگے بڑھتی شاہراہ پر ہی مرکوز تھیں اور بے تحاشا ٹریفک کے درمیان میں مکمل چوکس ہو کر ڈرائیو کر رہا تھا۔ وہ میرے جواب کی منتظر تھی۔ جب کچھ وقفے کے بعد میں نے اپنا سلسلہ کلام جوڑا۔

"اچانک سے ظاہر ہو جانے والا ایسا مرض جس کی شناخت ہی نہ ہو سکے اور آپ کو لگنے لگے کہ اب آپ اس اذیت زدہ کیفیت سے کبھی نکل ہی نہ پائیں گے کیسی تکلیف دہ چیز ہوتی ہے۔ تب آپ کے پاس کرنے کو باقی کیا رہ جاتا ہے۔ اسپتال کے کسی وارڈ کے بوسیدہ حبس زدہ سے کمرے کے کسی بستر پر پڑے آپ کیا کر سکتے ہیں، فقط اپنی موت کا انتظار۔ قطار در قطار لوگ آپ کے سرہانے بدلتے رہیں گے، روز نئے نئے چہرے آپ کو دکھائی دیں گے بعض آپ کو دلاسہ دیں گے حوصلہ وہمت رکھنے کی تلقین کریں گے اور جاتے ہوئے چند پیسے آپ کے سرہانے رکھ کر چلے جائیں گے۔ یا زیادہ سے زیادہ آپ کا کوئی سگا آپ کے لیے دعا کر دے گا، ان قیمتی سانسوں کو جو رب سوہنے نے ہزار نعمت کی طرح عطا کی تھیں۔ میں نے کبھی ان کی اہمیت کو نہ جانا تھا۔ جیسے میں سمجھتا تھا کہ مجھے کیا ہو گا؟ طٰہ عالم کے پاس اتنا سب کچھ ہے، روپیہ پیسہ ہے، اثر ورسوخ ہے، مجھے بھلا کیا ہو سکتا ہے، کوئی ہمارے خاندان کی طرف آنکھ اٹھا کر تو دیکھے ہمیں کچھ کہہ کر تو دیکھے اسے میں وہاں پہنچا دوں گا جہاں سے پھر وہ کبھی واپس نہ آ پائے گا۔

میں ساری دنیا میں گھوم پھر سکتا ہوں، بنا روک ٹوک کہیں بھی آ جا سکتا ہوں کسی بھی بڑے سے بڑے ریستوران میں جا کر ٹھہر سکتا ہوں، میں پیسے سے دنیا جہاں کا ہر آرام و آسائش خرید سکتا ہوں، مجھے کیا ہو سکتا ہے؟

کوئی ہے جو ہماری ٹکر میں آ سکے شہر بھر کے لوگ ہم سے ڈرتے ہیں۔ کبھی کسی کی ہمت نہیں ہو سکی کہ کوئی ہمارے سامنے اونچا بول سکے، کوئی ہماری برائی کر سکے۔

شہر میں گزرتے ہوئے ہمیں بڑے بڑے پروٹوکول ملتے ہیں۔ ہمارے لیے شاہراہیں بند کروا دی جاتی ہیں۔ ہم بلٹ پروف گاڑیوں میں گھومتے پھرتے ہیں۔ مجھے ایسے میں بھلا کیسے کچھ ہو سکتا ہے، کیسا نادان تھا میں کتنا غفلت میں ڈوبا ہوا تھا، پھر اس نے مجھے یہ احساس دلا ہی دیا۔

معالج نے جب جواب دے دیا تو اس کا کہنا یہ بھی تھا کہ آپ چاہے دنیا کے کسی بھی اسپتال چلے جائیں وہاں آپ کو یہی جواب ملے گا کہ انہیں کوئی ایسی طبی بیماری نہیں جو ہماری میڈیکل رپورٹس میں ظاہر ہو رہی ہو، یہ بات جان لینے کے باوجود ملک بھر کے کونے کونے میں واقع ہر وہ جگہ جہاں اعلیٰ معالج اور لیب کی سہولیات دستیاب تھیں۔ میرے ٹیسٹ کروائے گئے لیکن کہیں کچھ ظاہر نہ ہوا۔ میں ہر گھڑی ہر ہر لمحہ موت کے منہ سے قریب تر ہوتا چلا جا رہا تھا اور میڈیکل میں میری اس بیماری کی کوئی شناخت ہی نہ تھی اور ہوتی بھی کیسے یہ بیماری جسمانی ہوتی تو رپورٹس میں اس کی کوئی شناخت ظاہر ہو پاتی۔

یہ تو مجھ سے سرزد ہوئے گناہوں کی سزا تھی جو ناسور بن کر میرے وجود میں ہی نہیں بلکہ میری روح میں اپنا گھر بنا چکی تھی اور جب روح بیمار ہوتی ہے تو دنیا کی کوئی خوردبین اس بیماری کے وجود کو ظاہر نہیں کر پاتی۔

آپ نے یہی دریافت کیا تھا ناں کہ میں ہر وقت عبادت میں کیوں مشغول رہتا ہوں، آج دوبارہ ملی تندرستی مجھے اتنی پیاری ہے کہ میں اپنا ہر لمحہ ہر گھڑی اللہ کے حضور عبادت میں گزارنا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ جب میری صبح ہو تو اللہ کی حمد و ثناء سے ہو۔

رات کو جب میں سونے کے لیے لیٹوں تو اپنے رب سوہنے کو ہی یاد کرتے ہوئے مجھے نیند آئے اور نیند میں لاشعوری کیفیت میں بھی میں کسی ایسے خواب میں داخل ہو جاؤں جو مجھے میرے اللہ سے اور قریب کر دے۔'' آخری بات کہتے ہوئے میں نے سر گھما کر ایک نظر اس کی جانب دیکھا تو وہ بے حس و حرکت حیرت زدہ سی ہو کر میری جانب دیکھ رہی تھی۔

''طٰہٰ۔۔۔ آپ سے وہ جرم کیسے سرزد ہوا تھا۔۔۔ میں جاننا چاہتی ہوں۔'' کچھ توقف سے یومنہ نے یوں ٹھہر ٹھہر کر اپنے سوال کو بیان کیا کہ جس سے مجھے یہ اندازہ لگانے میں ذرا مشکل پیش نہیں آ رہی تھی کہ اب وہ میرے گزرے کل کے بارے میں جاننے کے لیے کتنا بے تاب ہو رہی تھی۔

''یومنہ آپ بھول رہی ہیں کہ آپ اس وقت میرے ساتھ خریداری کرنے آئی ہیں اور میرے ماضی سے متعلق بہت کچھ تو آپ پہلے ہی جانتی ہیں۔'' میں نے اسے ایسا جواب اس لیے دیا کیوں کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ میں اپنے ماضی کے تلخ باب کو کھول کر بیٹھ جاؤں اور میری وجہ سے اس کی خریداری متاثر ہو۔

''اگر میں پہلے کچھ سن چکی ہوں طٰہٰ تو اب مجھے آپ سے سب جاننا ہے۔'' یومنہ بضد تھی اور در حقیقت میں بھی تو یہی چاہتا تھا کہ کسی کو تو میں بیان کروں۔ اپنے وہ احساسات، کیفیات، وہ گھڑیاں جو مجھ پر قیامت بن کر بیتی تھیں۔

''میں آپ کو وہ سب بتاؤں گا لیکن یہ ایک طویل داستان ہے۔ ابھی اسے رہنے دیں۔'' میرا جواب پاتے ہی وہ فوراً بولی۔

''مجھے ان لمحوں کا انتظار رہے گا طٰہٰ۔'' یومنہ کے جواب دینے تک میں شہر کے ایک بڑے پلازہ کے پارکنگ ایریا میں گاڑی روک چکا تھا۔ یہ شہر کا ایک بڑا اور معروف ترین شاپنگ سینٹر تھا۔ یومنہ اور میں اندر داخل ہوئے، کھلے کھلے چہرے، میٹھے قہقہے۔۔۔ سرگوشیاں اور موسیقی کی چھڑی دھنیں ہم جگمگاتی رنگا رنگ دکانوں کے سامنے سے گزرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے جب یومنہ ایک سن گلاسز والی دکان کے سامنے پہنچ کر رکی اور مجھے لے کر اندر داخل ہو گئی۔ وہ اندر پہنچتے ہی مختلف قسم کے گلاسز دیکھنے لگی۔ مجھے لگا اسے وہ سن گلاسز اپنے لیے لینا تھے لیکن پھر ایک دم سے اس نے ایک گلاسز میری جانب بڑھا دیئے۔'' یہ آپ کے چہرے پر بہت جچے گا۔'' میں خود بھی گلاسز کا بے حد شوقین تھا لیکن اس کی پسند واقعی لاجواب تھی۔ یہ اوکلے کے سن گلاسز تھے۔ میرے چہرے پر انہیں سجاتے ہی دکان دار لڑکے نے آئینہ میرے سامنے کر دیا۔

صاحب ایک دم دبنگ لگ رہے ہو'' اس کی بات سن کر مجھے ہنسی آ گئی اور میں نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔"

''طٰہٰ آپ مسکراتے ہوئے بھی بہت اچھے لگتے ہیں۔'' یومنہ نے مجھے پہلی بار مسکراتے دیکھا تھا اور پھر برجستہ تعریف بھی کر دی تھی۔ میرے اصرار کے باوجود اس نے گلاسز کے پیسے مجھے نہیں دینے دیئے تھے اور انہیں خریدنے کے بعد ہم وہاں سے آگے بڑھے۔ جب یومنہ نے اپنی خریداری مکمل کر لی تو پھر چلتے چلتے میں ایک دکان کے سامنے پہنچ کر ٹھہر گیا تھا اور میرے ساتھ چلتے ہوئے وہ اس دکان میں داخل ہوئی تو حیرت سے میری جانب دیکھ رہی تھی۔ جیسا کہ دکان میں داخل ہوتے ہوئے وہ باہر کانچ کے باکس میں

سجی ڈمیوں سے اندازہ لگا سکتی تھی کہ یہ حجاب، اسکارف اور عبایا جیسے خواتین کے اسلامی لباس کی دکان تھی۔ اندر پہنچ کر میں نے ایک عبایا خریدا، وہ ساتھ کھڑی کچھ بھی نہ سمجھ سکی۔ جب پیسے ادا کر کے میں نے وہ عبایا اسے دیتے ہوئے کہا۔

"یومنہ آپ کو یہ میری طرف سے گفٹ ہے۔" اسے میرا یہ تحفہ لیتے ہوئے کچھ وقت لگا۔ وہ حیرت زدہ سی جیسے اسے لیتے ہوئے ہچکچا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر اب مسکراہٹ بھی کچھ پھیکی پھیکی سی لگ رہی تھی۔ گویا اسے کچھ بہت اچھا محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ ہم دکان سے نکلے اور پھر اس پلازہ کے اس خاص دروازے کی جانب بڑھے جہاں سے ہمیں باہر نکلنا تھا۔ یومنہ چپ چاپ سر جھکائے جیسے کچھ سوچتی ہوئی میرے ساتھ چل رہی تھی۔ ہم دروازے تک پہنچے اور پھر میں وہیں ٹھہر گیا۔ اس جگہ میرے ساتھ کوئی واقعہ بیت چکا تھا۔ میری کوئی یاد اس جگہ سے جڑی تھی، پھر کوئی جھماکا سا ہوا اور میرے گرد و نواح کا منظر تیزی سے بدلنے لگا اور اب میں جس منظر میں اتر چکا تھا، یہ اسی سلسلے کی اگلی کڑی تھی، جب یومنہ کے دروازہ کھٹکھٹانے پر میں خیالوں کے دائرے سے پلٹا تھا۔

چند روز تیز بخار میں مبتلا رہنے کے بعد جو میری طبیعت میں کچھ بہتری آئی تو بڑے ابا نے مجھے مائیکل کے ساتھ باہر گھوم پھر آنے کو بھیج دیا تھا اور اس روز کچھ خریدنے کی غرض سے میں اسی پلازہ میں آیا تھا۔

یہاں اسی جگہ میں نے عبیرہ کو داؤد کے ساتھ خریداری کرتے دیکھا تھا۔ انہیں ایک ساتھ دیکھ کر میرا خون کھولنے لگا تو میں خود پر قابو نہ رکھ پایا تھا۔ میں دوڑا اور اس سے پہلے کہ میں ان تک پہنچتا عبیرہ نے یوں غصے سے مجھے اپنی جانب بڑھتے دیکھ لیا تھا، داؤد اس سے کچھ فاصلے پر آگے آگے چل رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ داؤد کی جانب دوڑی اور اسے داؤد کی طرف بڑھتے دیکھ کر مجھے لگا میں انگریزی فلم ورلڈ وارزی کا وہ وائرس زدہ انسان ہوں جس سے بچنے کے لیے وہ بھاگ رہی تھی حالانکہ میں تو فقط ایک بار اس سے ملنا چاہتا تھا۔ اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ عبیرہ اگر آج میں کوئی دیوانہ یا خبطی انسان ہوں تو ہمیشہ ایسا تو نہ تھا، پھر کیا ہوا جو آج تم مجھ سے یوں نگاہیں بدلنے لگی ہو۔ میری چاہت، پیار اور محبت کو بھلا کر آج تم مجھ سے نفرت کرنے لگی ہو۔ میرے اس تک پہنچنے سے پہلے اب داؤد میرے سامنے کھڑا تھا۔

"میرے سامنے سے ہٹ جاؤ داؤد۔" میں نے غصے سے چیختے ہوئے داؤد سے کہا اور اس نے اگلے ہی پل مجھ پر ہاتھ اٹھا دیا۔ میں تو پہلے سے ہی غصے سے پاگل ہو رہا تھا، اس کے ہاتھ اٹھاتے ہی اپنے آپے میں نہ رہا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کی گردن دبوچ لی۔ اب اس کی گردن میرے بازوؤں کی گرفت میں تھی اور وہ چھڑانے کی لگاتار کوشش میں تھا۔ میں اس کی گردن کو اپنے بازوؤں کی گرفت میں لیے اس پر ایک ہاتھ سے گھونسوں کے وار کیے جا رہا تھا اور چند لمحوں میں ہی ہمارے ارد گرد لوگوں کا ایک بڑا ہجوم جمع ہو چکا تھا۔ ہم پلازہ کے بیرونی دروازے کے سامنے ہی گتھم گتھا تھے۔ جہاں چند گارڈ بھی کھڑے تھے پہلے تو چند ایک لوگوں نے آگے بڑھ کر چھڑانے کی کوشش کی لیکن تب تک میں داؤد کی خوب درگت بنا چکا تھا اور خون اس کے چہرے سے رسنے لگا تھا۔ جب لوگ ہمیں الگ کرنے میں ناکام رہے تو پھر گارڈز نے مجھے داؤد سے جو الگ کیا تو میں بپھر کر ان دو گارڈز سے چھوٹ کر پھر سے داؤد کو دبوچ لیتا

اور وہ پھرتی سے آگے بڑھ کر مجھے اپنے بازوؤں کے شکنجے میں جکڑنے کی کوشش کرتے رہے۔ اسی بیچ عبیرہ کا بھی برا حال ہو رہا تھا۔ وہ داؤد کو مجھ سے بچانے کے لیے لوگوں کو پکارتی رہی۔ اس سے پہلے کہ میں پھر سے چھوٹ کر داؤد اور عبیرہ تک جا پہنچتا گارڈز مجھے ان سے دور لے گئے تھے اور ساتھ ہی چند لمحوں میں پولیس کی گاڑی کے سائرن سنائی دینے لگے تھے۔ مائیکل پارکنگ میں کھڑا میرا انتظار کر رہا تھا اور پولیس مجھے گاڑی میں بٹھا کر تھانے لے جا رہی تھی۔ جب پولیس کی گاڑی میں، میں بے حس و حرکت بیٹھا جا رہا تھا۔ مجھے مائیکل پارکنگ میں گاڑی کے پاس کھڑا سگریٹ پیتا دکھائی دیا لیکن اسے چند لمحوں پہلے ہوئے اس حادثے سے آگاہ کرنے سے زیادہ مجھے فکر اس بات کی تھی کہ میری ایسی حرکت سے اب بڑے ابا کو کس قدر تکلیف پہنچے گی۔"

"طٰہٰ۔۔۔ طٰہٰ آپ ٹھیک تو ہیں۔" مجھے دور کہیں فاصلے سے کوئی آواز آتی سنائی دی۔ میں نے ارد گرد نگاہ دوڑائی یومنہ میرا بازو تھامے آوازیں دے رہی تھی۔ جنہیں سن کر پاس کھڑے چند ایک لوگ بھی مجھے عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے اور میں جیسے منوں بھاری وجود کو گھسیٹ کر یومنہ کے ساتھ چلنے لگا۔ اس گھڑی مجھے دیکھنے والے لوگ یہی سوچ رہے ہوں گے کہ میں سائیکالوجی کے کسی دماغی مرض کا شکار ہوں۔ یومنہ ایک ہاتھ میں شاپنگ بیگز پکڑے اور دوسرے ہاتھ سے میرا ایک بازو تھامے مجھے پارکنگ ایریا تک لے گئی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆

باب4

سیاہ و سفید

گھر پہنچ کر میں سیدھا اپنے کمرے میں چلا آیا تھا۔ میرے لباس تبدیل کرنے کے تھوڑی دیر بعد ہی بابا عبد القادر کمرے میں آئے۔ وہ مجھ سے کھانے سے متعلق دریافت کرنے آئے تھے، بھوک محسوس نہ کرنے پر میں نے انہیں کھانالانے سے منع کر دیا تھا اور وہ مزید کسی بھی سوال و جواب کے خاموشی سے کمرے سے چلے گئے تھے۔ بڑے ابا کی طرح بابا عبد القادر بھی مجھے خوب سمجھتے تھے۔ مجھے کچھ کچھ یاد ہے جب میری طبیعت بگڑ جاتی تو میری ویسی حالت دیکھ کر وہ پاس کھڑے کیسے رویا کرتے تھے۔ میں جانتا تھا کہ آج جو میں اپنے پیروں پر چلنے پھرنے اور خود زندگی گزارنے کے قابل ہو پایا تھا تو اس میں بابا عبد القادر کی وہ چھپ چھپ کر روتے ہوئے مانگی دعاؤں کا کتنا اثر شامل تھا۔

ایسے ہی سوچتے ہوئے میری نظر بابا رب نواز کی دی چادر پر پڑی، مجھے یاد آیا کہ میں کئی دنوں سے سوچ رہا تھا کہ کسی روز بڑے ابا کے ساتھ جا کر میں یہ چادر بابا جی کو لوٹا دوں لیکن بار ہا چاہنے کے باوجود کوئی نہ کوئی کام آڑے آ ہی جاتا یا کبھی یہ بات میرے ذہن سے محو ہو جاتی تھی۔ ابھی رات کافی بیت چکی تھی۔ بڑے ابا اب سو چکے ہوں گے یہ سوچ کر میں نے ان کے کمرے میں جانے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ پھر یونہی میرے ذہن میں ایک دم سے ایک سوال اٹھا۔ آج یومنہ کے ساتھ خریداری کرتے ہوئے میں نے اسے عبایا تحفتاً دیا تھا اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اسے میرے اس تحفے سے کچھ زیادہ خوشی نہیں ملی تھی اور میرے ذہن میں اس وقت یہی چل رہا تھا کہ کیا وہ میرے اس تحفے کو اسی مقصد سے استعمال کرے گی جس مقصد کے تحت میں نے اسے وہ تحفتاً دیا تھا؟ یا پھر وہ اسے کہیں سنبھال کر رکھ دے گی۔

میں نہیں جانتا تھا کہ وہ اسے استعمال کرے گی بھی یا نہیں لیکن میں اتنا ایمانداری سے کہہ سکتا تھا کہ میں نے اسے جو تحفتاً عبایا لے کر دیا تھا ایسا میں نے بالکل درست کیا تھا اور شاید یہ مجھے اس لیے بھی درست لگنے لگا تھا کیونکہ اس سے پہلے بھی ایک لباس ہی تحفتاً

دینے پر میں نے کسی کو ہمیشہ کے لیے کھو دیا تھا۔ ایک وہ بھی لباس ہی تھا اور ایک یہ بھی لباس ہی تھا لیکن دونوں میں اتنا ہی فرق تھا !جتنا اچھائی اور برائی میں۔۔۔ جیسے کسی سیاہ اور سفید میں۔۔۔

دسمبر کی انیس تاریخ میں کبھی نہیں بھولتا تھا اور اس سال بھی دسمبر کی انیس تاریخ میں چند روز ہی باقی تھے۔ میں عبیرہ کو ہر سال مہنگے سے مہنگا تحفہ دینے کی کوشش کرتا تھا اور اس سال بھی میں اسے کوئی خوبصورت اور مہنگاترین تحفہ دینا چاہتا تھا۔

دسمبر کی دودھیا سفید کہرے سے لپٹی سرد شام میں مَیں بیٹھا یہی سوچ رہا تھا کہ اسے اس سال میں ایسا کیا تحفہ دوں۔ وہ کیا خاص چیز ہونی چاہیے جو پچھلے چند سالوں میں میرے دیئے تحائف سے الگ ہو، میں عبیرہ سے بے حد محبت کرنے لگا تھا۔ ویسی ہی محبت جیسی میری عمر کے نوجوان اکثر اس عمر میں کرنے لگتے تھے۔ میں ارادہ کر چکا تھا کہ اس سالگرہ کے بعد میں اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنا بنا لوں گا، اور میرے ذہن میں یہ بھی چل رہا تھا کہ مجھے جلد سے جلد اپنے ماں اور ابا سے اس سلسلے میں بات کرنی چاہیے۔ عبیرہ جیسی چندے آفتاب چندے مہتاب اور ایک اونچے گھرانے کی لڑکی کے رشتے سے وہ بھلا کیونکر انکار کریں گے۔

یہ سوچ کر میں ان کی طرف سے بھی مطمئن ہو جاتا تھا۔ دسمبر کی آخیر سیاہ راتیں ہر طرف چھائی گاڑھی دھند درختوں سے جھڑتے زرد پتے اور اس عالم اداسی میں، میں دفعتاً اچھل پڑا۔ دودھیا سفید پیرہن جسے پہن کر وہ کوئی اپسرا لگے، ایک لباس جو عبیرہ جیسی شخصیت کے شایانِ شان ہو، جسے وہ پہن کر جب اپنی سالگرہ کا کیک کاٹنے کے لیے سبھی کے سامنے آئے تو تقریب میں مدعو لوگ اسے دیکھ کر دنگ رہ جائیں۔ وہ طہٰ عالم جس پر شہر بھر کی لڑکیاں فدا تھیں۔ اس کے ساتھ دو گھڑی بتانے کو اپنے لیے باعثِ فخر سمجھتی تھیں۔ وہ سبھی دیکھ سکیں کہ خود طہٰ عالم کس پر فدا ہے۔

پھر جتنا میرے لیے کٹھن یہ سوچنا تھا کہ میں اسے تحفے میں کیا دوں، اس سے کئی گنا دشوار اس لباس کو کھوجنا تھا۔ اگلے دو روز میں نے وہ لباس کھوجنے میں لگا دیئے تھے۔ پھر شہر کے ایک بہترین ڈیزائنر کا ہی تیار کردہ وہ لباس تھا جو کہ ابھی تک کسی بھی ماڈل کے تن پہ نہ سجا تھا اور نہ ہی کسی ماڈل نے ریمپ پر چل کر اسے لوگوں کے سامنے پیش کیا تھا، یہی وجہ تھی کہ ڈیزائنر نے مجھ سے اس لباس کی قیمت چار گنا کے حساب سے زیادہ وصول کی تھی۔

اسے لے کر میں گھر پہنچا اور گھر پہنچتے ہی میں نے عبیرہ کو فون لگایا۔ میں اسے کہنا چاہتا تھا، کہ وہ اپنی اس سالگرہ پر میرا تحفتاً دیا لباس پہنے اور اس لیے یہ بھی ضروری تھا کہ میں اسے یہ لباس ابھی پہنچا دیتا کیونکہ آج رات ہی اس کی سالگرہ تھی۔ چند ایک بیل جانے پر ہی اس نے کال ریسیو کی اور اس کے کال ریسیو کرتے ہی میں اسے بتانے لگا کہ کتنی ہی جدوجہد کے بعد مجھے وہ تحفہ ملا ہے جو میں تمہیں اس برتھ ڈے پر دینے والا ہوں۔

"ایسا کیا خاص گفٹ ہے طہٰ؟" عبیرہ جاننے کے لیے بے تاب ہو رہی تھی۔

''خاص تو وہ تب ہو گا جب تم اسے پہنو گی''۔ جب میں نے اسے ڈیزائنر کا نام بتایا تو اب وہ اس لباس کو دیکھنے کے لیے بے تابی کا اظہار کرنے لگی اور میں نے اسے یہ کہہ کر فون بند کر دیا کہ چند ہی گھڑیوں تک میرا ڈرائیور وہ لباس لے کر تمہارے گھر پہنچ رہا ہے، اور پھر لباس کے ملتے ہی عبیرہ کی کال آ گئی۔ وہ لباس اسے بے حد پسند آیا تھا اور یہ جان کر میں اسے کہنے لگا کہ میں اس کی خوشی کے لیے ایسے کئی لباس تحفے میں دے سکتا ہوں۔ اس کے کال بند کرنے سے پہلے میں نے اس سے دہرا کر پوچھا کہ آج شام داؤد بھی آ رہا ہے ناں اور اس کی ہاں پر میں مطمئن ہو گیا تھا۔ داؤد عبیرہ کا پرانا بوائے فرینڈ تھا لیکن میرے عبیرہ کی زندگی میں آ جانے کے بعد وہ اچھی طرح سے جانتا تھا کہ عبیرہ فقط مجھے چاہتی ہے اور میں بھی عبیرہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ عبیرہ سے بات ختم ہونے کے بعد کئی ایک اور دوستوں کو بھی میں نے کال کر کے دہرایا کہ وہ آج رات عبیرہ کی سالگرہ پر آ رہے ہیں ناں۔ میں چاہتا تھا کہ سبھی دیکھ لیں کہ طٰہ عالم جسے شادی کے لیے منتخب کر چکا ہے۔ وہ لڑکی شہر بھر میں اپنا ثانی نہیں رکھتی۔

اور اب مجھے بڑی بے تابی سے اس وقت کا انتظار تھا۔ جب عبیرہ میرا تحفتاً دیا لباس پہن کر تقریب میں مدعو لوگوں کے سامنے آئے اور میں عبیرہ کی بجائے ان لوگوں کو دیکھ رہا ہوں جب وہ مسحور ہو کر عبیرہ کو دیکھ رہے ہوں۔ جب اس کی ہم عصر لڑکیاں اسے رشک بھری نگاہوں سے دیکھ رہی ہوں اور میرے وہ دوست جن میں عبیرہ کا پرانا بوائے فرینڈ داؤد بھی شامل تھا۔ عبیرہ کو دیکھ کر میری قسمت پر رشک کریں۔ اس سالگرہ میں اپنی ماں، ابا اور بھائی کو بھی خصوصاً اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا اور اگر میری کوئی بہن بھی ہوتی تو اسے میں یہ ضرور کہتا کہ آج وہ اپنی ہونے والی بھابھی سے ملنے جا رہی ہے۔

اس روز سرِ شام ہی مجھے عبیرہ کی فون کالز آنا شروع ہو چکی تھیں۔ کیونکہ پچھلی ہر سالگرہ پر میں دن کے آغاز سے رات تقریب کے اختتام تک اسی کے ہمراہ رہتا تھا لیکن آج میں عین اسی وقت پہنچنا چاہتا تھا، جب وہ سجی سنوری بیٹھی میرا انتظار کر رہی ہو گی۔ وہ مجھے فون پر فون کرتی رہی اور میں اسے ٹالتا رہا۔ جی۔ ایم اس وقت میرے ساتھ میرے کمرے میں ہی موجود تھے۔ وہ عبیرہ کے برتھ ڈے پر میرے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو رہے تھے اور عبیرہ کی میرے فون پر آتی کالز کو لے کر مجھے خوب سنا رہے تھے۔ پھر ان کی تیاری کو دیکھتے ہوئے میں بھلا کیسے پیچھے رہتا۔

''کیوں جناب میرا تو وہاں کوئی انتظار کر رہا ہے، آپ یوں پُر تکلف تیاری کے ساتھ کس کے لیے جا رہے ہیں۔''جی ایم میری بات سن کر فقط مسکراتے ہوئے آئینے کے مقابل کھڑے ٹائی کی ناٹ کو اپنی جگہ پر جماتے رہے۔ وہ صحیح معنوں میں ایک Sophisticated انسان تھے۔ آئینے کے سامنے سے ہٹ کر میرے پاس سے گزرتے ہوئے انہوں نے ہاتھ بڑھا کر میرے بالوں کو چھوا جو اب بے ترتیب ہو چکے تھے۔ میں جھٹ سے اٹھ کر ڈریسنگ کے سامنے جا کھڑا ہوا اور بال بنانے لگا تھا۔ تبھی بابا عبدالقادر ماں اور ابا کا پیغام

لے کر آئے تو ان کے کمرے سے نکلتے ہی ہم ان کے تعاقب میں پورچ تک پہنچ گئے تھے۔ جہاں ماں اور ابا پہلے سے کھڑے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ یوں ہمارے پہنچتے ہی سبھی گاڑی میں سوار ہوئے اور مائیکل نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

آج شہر بھر میں دھند کا کوئی نام و نشان نہ تھا۔ ایسا دیکھ کر میرا موڈ کچھ آف ہو رہا تھا۔ مجھے دھند بے حد پسند تھی۔ دھند سے ماحول میں اک عجیب سا افسوں بھر جاتا تھا۔ جو کہ مجھے بہت بھاتا تھا۔ جاڑے میں اکثر ہر طرف چھائے گاڑھے کہر میں، میں اوور کوٹ کے کالر اوپر کانوں تک چڑھائے سگریٹ سلگائے گھر سے پیدل چلتا، کہیں دور نکل جایا کرتا تھا اور جب سے عبیرہ میری زندگی میں آئی تھی میری دسمبر کی ہر دودھیا سفید شام اسی کے سنگ گزرتی تھی اور میں آج بھی اسے چار سُو پھیلے دودھیا سفید آنچلوں کے درمیان ہی دیکھنا چاہتا تھا۔

عبیرہ کے گھر پہنچتے ہی اسے میرے آنے کی خبر ہو چکی تھی اور میری نگاہیں بھی اسے ہی ڈھونڈ رہی تھیں جب مجھے اس کا پیغام فون پر موصول ہوا۔ وہ میرے دیر سے آنے کی وجہ سے خفا تھی، پہلے تو میں نے اسے انتظار کروایا تھا اور اب وہ مجھے انتظار کی سولی پر لٹکانا چاہتی تھی یوں سبھی بیٹھے مہمانوں کے ساتھ میں بھی اس کا انتظار کرنے لگا۔ میری طرح اسے بھی دسمبر کی سردی اور دھند بہت پسند تھی یہی وجہ تھی کہ کسی پانچ ستارہ ہوٹل کو بک کروانے کی بجائے اسی کی خواہش پر گھر کے لان میں ہی سارے انتظامات کئے گئے تھے، ہر میز کے قریب ہی چند فٹ اونچے گیس ہیٹر نصب کر دیئے گئے تھے جن سے نکلنے والی سنہری کرنیں نہ صرف ماحول کو حسین بنا رہی تھیں بلکہ ان سے نکلنے والی حرارت ماحول کو گرما بھی رہی تھی۔

انہی دنوں ماں اور ابا جی ایم کے لیے رشتہ بھی تلاش کر رہے تھے اور ایسی تقریبات ہمارے اونچے گھرانوں کے لیے ایک نادر موقع ہوا کرتی تھیں۔ ماں اور ابا تقریب میں مدعو لوگوں سے بھائی کا تعارف کروا رہے تھے اور بھائی بھی خوش دکھائی دے رہے تھے۔ یکا یک ہی ہلکے قہقہے اور سرگوشیاں بھی تھم گئیں اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے سبھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں جانتا تھا کہ تم ہی ہو، میں اپنی نشست سے اچھل کر اٹھ کھڑا ہوا اور عبیرہ کو دیکھتے ہی مسکاتے ہوئے میرے لبوں سے یہ الفاظ ادا ہو گئے جنہیں میرے سوا کسی نے نہ سنا ہو گا۔

دودھیا سفید پیرہن پہنے وہ کوئی سفید گلاب ہی لگ رہی تھی۔ ڈیزائنر نے تو فقط اس لباس کو تراشا تھا عبیرہ کے جسم پر آتے ہی جیسے اس میں روح پڑ گئی تھی۔ شاید ہی عبیرہ کو آج سے پہلے کسی نے یوں اس روپ میں دیکھا ہو۔ اب سبھی اپنی اپنی نشست پر بیٹھ چکے تھے۔ میں اسے وش کرنے کے لیے آگے بڑھا اور پھر کسی کو دیکھ کر میں وہیں رک گیا۔ داؤدا بھی تک کھڑا تھا اور میں بھی کیسا غیور تھا۔ عبیرہ کو لوگوں کے سامنے برہنہ کھڑا کر کے اب خود کو داد دے رہا تھا۔ طٰہٰ عالم دیکھ ادھر کیسی آگ بھڑک رہی ہے، میں نے قریب پہنچ کر داؤد کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور پھر اسی جگہ سے کھڑے ایک بار عبیرہ کی جانب دیکھا وہ اس وقت میرے ماں، ابا اور بھائی سے ہی مل رہی تھی۔ ماں کے ارد گرد نگاہیں دوڑا کر مجھے تلاش کرنے سے یونہی لگ رہا تھا کہ وہ ان سے میرے متعلق ہی

دریافت کر رہی تھی۔ ادھر میں نے داؤد کے کاندھے پر جو ہاتھ رکھا تو وہ ہڑبڑا کر مڑا، اس کے مڑ کر مجھے دیکھنے پر میں نے طنزاً دو ایک بار اس کے کاندھے کو تھپتھپایا لیکن ایسا کرنے سے شاید انجانے میں، میں اس کے جذبات کو ہوا دے رہا تھا۔ اس کے سینے میں لگی آگ کو بڑھا رہا تھا۔ وہ جواب تک کھڑا عبیرہ کو ٹکٹکی باندھے دیکھے جا رہا تھا، میں اسے یہ احساس دلا رہا تھا کہ وہ میری ہے۔ میرا عبیرہ کو ایک ایسا لباس تحفتاً دینا جو اس کے بدن کے برہنہ ہونے کا سبب بن رہا تھا اور پھر ڈھٹائی بے حیائی کے ساتھ یہ سوچنا کہ یوں لوگ میری قسمت پر رشک کر رہے ہوں گے، کس قدر رذیل پن تھا۔ میرے ایسے فیل کی ایسی ہی سزا ہونی چاہیے تھی۔

عبیرہ۔۔۔ عبیرہ۔۔۔ میں آگے بڑھا، نہ جانے کہاں سے اس قدر شدید دھند چار سُو پھیلنے لگی تھی۔ ابھی تو نہ تھی، میں نے سر گھما کر دائیں بائیں دیکھا، ابھی میرے قریب ہی داؤد کھڑا تھا، تقریب میں مدعو لوگوں کی بھیڑ لگی تھی۔ روشنی اور حرارت کے لیے لگے لیمپس، کرسیاں، میز مجھے وہاں کچھ بھی تو دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ شدید سرد دھند میں جیسے میرا وجود منجمد ہونے لگا تھا۔

میں یہ دیکھ کر بے تاب ہو کر چلانے لگا۔ عبیرہ۔۔۔ عبیرہ۔۔۔ کہاں ہو تم، دیکھو میں یہاں ہوں۔ میں تمہارے گھر کے صحن میں ہی تو کھڑا ہوں پھر تم کہاں چلی گئیں، باقی سب کہاں چلے گئے، میں طٰہٰ عالم ہوں جس سے تم محبت کرتی ہو۔ میں تمہارا طٰہٰ عالم ہوں۔

تم مجھے چھوڑ کر کہاں چلی گئی۔۔۔

باقی سب کہاں چلے گئے۔۔۔

دیکھو میں طٰہٰ عالم ہوں۔۔۔

میں تمہارا طٰہٰ عالم ہوں۔

اللہ اکبر، اللہ اکبر۔۔۔ کہیں دور موؤذن نے صدا بلند کی، میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اشھد ان لا الہ الا اللہ ''میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں'' میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا رکھا تھا۔

میں کب طٰہٰ عالم ہوں؟

میں کب اس نام کے قابل ہوں؟

میں کب طالب ہدایت ہوں۔

میں تو انسان کہلوانے کا بھی حق دار نہیں ہوں۔

کیا انسان ایسے ہوتے ہیں؟

کیا انسان اپنی عزت کو یوں سرِ بازار نیلام کیا کرتے ہیں؟

کیا وہ جسے محبت کرتے ہیں اسے لوگوں کے سامنے یوں نمائش کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

ہر گز نہیں

میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا رکھا تھا، اور اب زار و قطار رو رہا تھا۔

موذن فجر کی اذان دے کر خاموش ہو چکا تھا۔ دور کہیں سے کچھ دیر سے شروع ہونے والی اذان کی مدھم آوازیں بھی اب آنا بند ہو چکی تھیں اور میں بھی رو دھو کر اب یوں شانت ہو چکا تھا جیسے تالاب میں پھینکے پتھر سے پیدا ہونے والی لہریں دھیرے دھیرے کنارے تک پہنچنے سے پہلے ہی مٹ جاتی ہیں۔ فجر کی جماعت میں اب کم ہی وقت رہ گیا تھا۔ میں نے جھٹ سے اٹھ کر وضو کیا اور پھر بابا رب نواز کی دی چادر کو جو کھول کر کاندھوں کے گرد اوڑھا تو وہی لاہوتی سی مسحور کن خوشبو نے میرے ذہن سے سبھی کچھ بھلا دیا تھا۔ چند ثانیے میں اسی خوشبو کے سحر میں جکڑا وہیں کھڑا رہا اور پھر مسجد کی جانب چل پڑا۔

مسجد پہنچ کر فجر کی نماز با جماعت ادا کرنے کے بعد میں وہیں مسجد میں بیٹھ گیا تھا اور پھر اشراق کی نماز ادا کرنے کے بعد میں جو گھر لوٹا تو اپنے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے مجھے ماں کی آواز سنائی دی۔

''رک جاؤطہٰ بیٹا!'' میں وہیں رک گیا لیکن پلٹا نہیں۔

''کیا ابھی تک ہم سے خفا ہو بیٹا؟'' ماں نے میرے قریب آ کر پیار سے میرے چہرے کو اپنے ہاتھوں سے چھوتے ہوئے کہا اور میں سوچنے لگا، آپ سے نہیں ماں، میں تو اپنے آپ سے ہی خفا ہوں۔ مجھے بالکل چپ چاپ کھڑا پا کر وہ خود ہی دوبارہ بولیں۔

''چلو میرے ساتھ میرے کمرے میں آؤ، مجھے آپ سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔'' اور پھر ماں میرا بازو تھامے یوں آگے بڑھی اور میں ان کے ہمراہ یوں چلنے لگا جیسے کوئی ننھا بچہ ماں کی انگلی تھامے ساتھ ساتھ چل رہا ہو۔

اپنے کمرے کی جانب بڑھتے ہوئے ماں مجھ سے کئی باتیں کرتی رہی اور میں ان کی باتوں کا فقط ہاں ناں میں ہی جواب دیتے ہوئے یہ سوچ رہا تھا کہ اس وقت کمرے میں ابا بھی ہوں گے اور ماں مجھے ابا سے ہی ملوانے لے جا رہی تھیں۔ اول تو ابا کے پاس کبھی میرے لیے کوئی وقت ہی نہ ہوتا تھا، اور کبھی جو وہ میرے پاس بھولے سے آ بھی جاتے تو چند سوال پوچھتے جن کے میری طرف سے مناسب جواب نہ ملنے پر الٹے پیروں لوٹ جاتے تھے۔

یکا یک دروازے سے باہر پہنچ کر میں رک گیا۔ ''چلو بیٹا رک کیوں گئے؟'' ماں نے میرے رک جانے پر حیرت سے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ماں کو یونہی ششدر کھڑا چھوڑ کر میں پلٹا مجھے آگے بڑھتا دیکھ کر ماں مجھے روکنے کے لیے چند قدم پیچھے آئی اور پھر مضمحل سی وہیں کھڑی مجھے جاتا ہوا دیکھتی رہی۔

☆☆☆☆☆☆☆

باب 5

ایک ڈیوڑھا، دو ڈیوڑھا تین

اپنے کمرے کی جانب بڑھتے ہوئے میرے ذہن میں یہی چل رہا تھا کہ اگر میں ماں کے ساتھ اندر کمرے میں چلا جاتا تو ابا مجھ سے کیسے پیش آتے۔ ضرور وہ مجھے حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ کر رہ جاتے۔ آخر کو ان کا جواں سالہ بیٹا یوں دنیا جہان سے کٹ کر رہ گیا تھا۔ جوان کی سیاست میں ان کا ایک بازو بنا ساتھ کھڑا رہتا تھا۔ اب خود کو ہی سنبھالنے کے قابل نہ رہا تھا۔

وہ مجھ سے کئی طرح کے سوال کرتے اگر میں انہیں ان سوالوں کے تسلی بخش جواب دیتا چلا جاتا تو پھر وہ مجھے کہتے برخوردار کل فلاں جگہ جلسہ ہے، پرسوں فلاں شہر جانا ہے، اور ترسوں فلاں مجمعے کے سامنے تقریر کرنی ہے۔ یہ سب سنتے ہی مجھے نعروں کا بلند ہوتا شور سنائی دیتا۔ اسپیکروں سے نکلتی میری ہی آواز مجھے بازگشت کی طرح سنائی دینے لگتی۔ میرے اطراف میں دیجور آندھی چلنے لگتی۔ اخبارات کے صفحات ہوا میں گرد کی طرح اڑنے لگتے۔ میرا حلق خشک ہونے لگتا اور کبھی میں اپنا سر تھام لیتا۔

دفعتاً میں چلتے چلتے رک گیا تھا۔ یہ بڑے ابا کے کمرے کا دروازہ تھا۔ میں نے دروازہ دھیرے سے کھولا اور اندر داخل ہو گیا تھا۔ بڑے ابا اس وقت ذرا استراحت کو لیٹے ہوئے تھے۔ ان کے چہرے کی جانب مسکراتے ہوئے دیکھ کر میں ان کے پیروں میں بیٹھ گیا تھا۔ پھر جیسے ہی میں نے ان کے پیر دبانے کے لئے ہاتھ بڑھایا وہ فوراً ہی جاگ گئے۔

"طٰہٰ میاں آج صبح صبح کیسے آنا ہوا؟" انہوں نے آنکھیں بند ہی رکھیں اور مجھے پیر دابنے سے منع کئے بغیر سوال کیا۔ وہ جانتے تھے کہ میں ان کے منع کرنے کے باوجود پیر دابنے سے رکنے والا نہ تھا۔ میں ان کا سوال سن کر بھی چند لمحے خاموش رہا اور وہ بھی آنکھیں بند کئے میرے جواب کے انتظار میں خاموش رہے۔ درحقیقت میں سوچ رہا تھا کہ میں اپنی بات کا آغاز کہاں سے کروں۔

"بابا رب نواز تو یاد ہوں گے بڑے ابا آپ کو۔" میں فقط اتنا کہہ کر پھر سے خاموش ہو چکا تھا اور بڑے ابا میری یہ بات سنتے ہی فوراً اٹھ بیٹھے۔ وہ چادر کو اپنے کاندھوں کے گرد اوڑھتے ہوئے بولے۔

"ایسی برگزیدہ ہستی کو بھلا کون بھلا سکتا ہے۔ دنیا ہر در سے مایوس ہو کر جب ان کے در پر پہنچتی ہے وہی تو پھر امید کی کرن دکھاتے ' ہیں۔ ایک نظر کا کرشمہ ہم نے وہیں پہنچ کر دیکھا تھا۔ ایسے اللہ کے نیک برگزیدہ بندے بھی اللہ ہی کے کرم سے ملتے ہیں۔ شاید

"میاں تمہارا اپنا ہی کوئی نیک عمل تھا جو ہمیں اللہ نے بابا رب نواز سے ملوا دیا۔ تمہیں چارپائی پر ڈال کر ہر طرف سے مایوس ہو کر ان تک جو لے گئے تو نہیں جانتے تھے کہ یہ کرشمہ بھی ہو جائے گا اور آج دیکھو تو وہی پہلے سے طٰہٰ عالم میاں ہمیں اللہ نے لوٹا دیئے۔ بڑے ابا بابا رب نواز کی عقیدت میں سرشار جیسے بھیگ رہے تھے اور میری حالت، ان کی یہ بات سن کر کہ پہلے "طٰہٰ عالم

میاں ہمیں اللہ نے لوٹا دیئے'' بے قرار ہو رہی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ پہلے جیسے طٰہٰ عالم میاں نہیں بڑے ابا بلکہ بابا رب نواز کی دعا سے ملنے والے طٰہٰ عالم میاں۔

''طٰہٰ میاں آج عرصے بعد اچانک سے بابا جی کیسے یاد آ گئے؟'' مجھے چپ پا کر بڑے ابا نے سوال پوچھا تو میں جیسے کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

''آپ کو یاد ہو گا بڑے ابا کہ بابا جی نے بڑی محبت سے اپنی ایک نشانی مجھے سونپی تھی اور پھر کہا تھا کہ جب اچھے ہو جاؤ تو اسے لوٹانے کے بہانے ہی اپنی شکل دکھا جانا۔''

''اور مجھے یاد ہے میاں کہ تم کوئی نشانی لئے بغیر وہاں سے پلٹنے والے کب تھے۔ وہیں ان کے پیروں میں پڑے رہتے اگر بابا رب نواز تمہیں اپنی چادر نشانی کے طور پر رکھنے کو نہ دیتے۔'' بڑے ابا نے میری بات ختم ہوتے ہی جو بات کا آغاز کیا تو گویا میری ہی بات کو جیسے فصاحت سے بیان کر دیا تھا، پھر اس سے پہلے کہ میں انہیں چلنے کے لئے اصرار کرتا انہوں نے خود ہی اپنی خواہش کا اظہار کر ڈالا۔

''میاں میرا بھی بڑا دل چاہ رہا تھا ان سے ملاقات کو۔'' ان کے منہ سے اتنا سننے کی دیر تھی کہ میں بھی جھٹ سے بولا۔

پھر بڑے ابا انتظار کس بات کا ہے۔'' میری یہ بات سنتے ہی بڑے ابا جھٹ سے بولے۔

میاں اٹھو ابھی جاؤ مائیکل کو گاڑی تیار کرنے کو بولو، ہم ناشتہ بھی راستے میں ہی کریں گے۔

''یہ ہوئی ناں بات بڑے ابا۔'' میں نے ان کی بات سن کر خوشی سے کہا تو انہوں نے مسکراتے ہوئے میری پیشانی پر پیار کیا اور میرے کاندھے کو تھپکایا، پھر بڑے ابا چلنے کی تیاری میں لگ گئے اور میں نے کمرے سے نکل کر خوشی خوشی مائیکل کو بابا رب نواز کی طرف چلنے کی خبر دی تو وہ بھی خوشی سے جیسے کھل اُٹھا اور کاندھے پر رکھے رومال سے جھٹ سے گاڑی صاف کرنے لگا۔

مائیکل کو گاڑی صاف کرتے دیکھ کر میں اپنے کمرے کی جانب بڑھا، مجھے بھی لباس تبدیل کرنا تھا۔ لباس تبدیل کرنے کے بعد میں کمرے سے نکلنے لگا تو مجھے یاد آیا میں کچھ بھول رہا تھا۔ میں پلٹا مجھے یاد آ گیا کہ میں نے بابا جی کے لئے کافی سارے عطر خرید رکھے تھے، جو مجھے انہیں تحفتاً دینا تھے۔ الماری میں رکھے ایک بغچہ میں سارے عطر اچھے سے رکھ کر میں بغچہ اٹھا کر باہر آ گیا۔ باہر پہنچ کر میں نے دیکھا بڑے ابا اور مائیکل میرے ہی انتظار میں کھڑے تھے۔ ہم سبھی کے چہرے خوشی سے تمتما رہے تھے۔ یہ اللہ والوں سے ملنے کی خوشی تھی۔ ان سے ملنے کی خواہش ہی ہمیں یوں خوشی سے سرشار کئے جا رہی تھی۔

میں اور بڑے ابا گاڑی میں سوار ہوئے تو مائیکل نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ بڑے ابا نے ہاتھ میں تسبیح لئے اللہ کا ذکر کرنا شروع کر دیا تھا اور میں ابھی سے جیسے مسجد سے ملحقہ اس صحن میں جا پہنچا تھا جہاں بابا رب نواز اپنے ننھے شاگردوں کو تعلیم دیتے تھے اور ساتھ ہی میرے کانوں سے وہ آوازیں ٹکرانے لگی تھیں۔

ایک ڈیوڑھا۔۔۔ڈیوڑھا

دوڈیوڑھا۔۔۔تین

تین ڈیوڑھا۔۔۔چارڈیوڑھا

چارڈیوڑھا۔۔۔؟

میں اس گھڑی بابارب نواز کے قریب فرش پر ہی بیٹھا تھا۔جب وہ سامنے قطار میں بیٹھے اپنے کسی ایک شاگرد کو کھڑے ہو کر ڈیوڑھا کا پہاڑا پڑھنے کو کہہ رہے تھے۔

ایک ڈیوڑھا۔۔۔ڈیوڑھا

دوڈیوڑھا۔۔۔تین

تین ڈیوڑھا۔۔۔چارڈیوڑھا

چارڈیوڑھا۔۔۔چھ

پانچ ڈیوڑھا۔۔۔سات ڈیوڑھا

سات ڈیوڑھا۔۔۔؟

وہ شاگرد بھی جب سات ڈیوڑھا پر رک کر حساب لگانے لگا تو اس کے عقب میں بیٹھے چند شریر قسم کے بچوں کی ہنسی چھوٹ گئی اور میں سوچنے لگا یارب یہ کیا ماجرا ہے ؟ ایک ڈیوڑھا۔۔۔ڈیوڑھا، دوڈیوڑھا۔۔۔تین، میں حیرت زدہ سا بیٹھا پھر سے متوجہ ہو کر بابا جی اوران کے شاگردوں کے درمیان چل رہا تعلیم کا یہ دلچسپ سلسلہ دیکھنے لگا، لیکن اب کی بار بابا جی نے کسی بھی شاگرد کو کھڑا ہو کر ڈیوڑھا کا پہاڑا پڑھنے کا اشارہ نہ کیا۔چند لمحے خاموش رہ کر وہ اپنے شاگردوں سے مخاطب ہوئے۔

"میرے بچو!ڈیوڑھا کا پہاڑا تو تم لوگ سیکھ ہی جاؤ گے پھر اسے رٹا لگا کر یوں فر فر سے پڑھنے بھی لگو گے۔ آپ کے چند ساتھی ایسے بھی ہیں جنہیں اگر میں کہوں تو وہ ابھی سارا پہاڑا سنا دیں لیکن جو اصل بھید تھا اس پہاڑے کے پیچھے وہ کچھ اور تھا۔

آپ اس پہاڑے کو پڑھنے میں ذہن سے کتنا سوچتے ہیں۔اس قدر محو ہو کر آپ ایک مقدار کو دوسری مقدار میں جمع کرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں اور اسی پل وقت کے کسی لمحہ میں آپ ارد گرد کے ماحول سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔آپ کو یہ دھیان ہی کب رہتا ہے کہ آپ کے عقب میں آپ کے اپنے ہی ساتھی آپ پر ہنس رہے ہیں۔اسی پل میں اس برگد کے پھیلے بڑے سے پیڑ پر دیکھو تو کتنے ہی پرندے چہچہا رہے تھے لیکن آپ فقط ڈیوڑھا کے پہاڑے میں مگن ایک مقدار کو دوسری مقدار میں جمع کرنے میں لگے تھے۔پھر ہماری نمازوں سے تو یہ ڈیوڑھا کا پہاڑا اچھا۔ہم نماز میں کھڑے اپنے رب سوہنے کی حمد و ثناء بیان کر رہے ہوتے ہیں تو ساتھ ہی ہمارے ذہن میں دنیا جہان کا حساب کتاب چل رہا ہوتا ہے، کوئی خیال یہاں سے آرہا ہے، کوئی خیال وہاں سے آرہا ہے اور

نماز فقط اٹھک بیٹھک کی مشق بن کر رہ جاتی ہے۔ نماز میں حضوری نہ ہو تو وہ نماز نہیں رہتی اور حضوری پیدا ہوتی ہے توجہ سے، خشوع و خضوع سے۔ ایک ایک آیت کو سمجھ سمجھ کر پڑھنے سے، جیسے آپ بچوں میں سے چند بچوں نے ابھی ڈیوڑھا کے پہاڑے کی مشق کی۔ اب نماز ادا کرنے جائیں تو اس بات کو ذہن میں رکھیے گا۔'' سبھی بچے توانہاک سے باباجی کی نادر باتیں سن ہی رہے تھے مجھے میرے سوال کا جواب بنا پوچھے ہی مل چکا تھا۔ باباجی نے مسکرا کر میری جانب دیکھا تو مجھے لگا جیسے وہ کہہ رہے ہوں میاں پھر کب سنا رہے ہو بنار کے ڈیوڑھا کا پہاڑا۔

مجھے چپ چاپ خیالوں میں گم پا کر پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئے۔

"طہٰ میاں ہم لوگوں نے اپنے لئے کئی مرکز منتخب کر رکھے ہیں اور ہم انہی کے گرد گھومتے چلے جا رہے ہیں۔ جیسے مال، اولاد، حسن، شباب، عزت، شہرت، دفعتاً میں اپنی نشست سے یوں اچھلا اور بوکھلا کر میں نے اپنے اردگرد نگاہ دوڑائی تب مجھے ہوش آیا کہ میں کہیں بہت دور نکل چکا تھا۔ مائیکل کو بے دھیانی میں کہیں روڈ بریکر دکھائی نہ پڑا تھا اور گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ ہوا میں تیرنے لگی تھی، مائیکل نے گاڑی کی رفتار کم کرنے کے بعد ایک بار پھر سے اپنی رفتار سے آگے بڑھا دی تھی۔ ہمارا اب تقریباً نصف سے زیادہ کا سفر طے ہو چکا تھا۔ جب ایک بارونق بازار میں سے گزرتے ہوئے بڑے ابا کہنے لگے کہ ہمیں یہیں رک کر ناشتہ کر لینا چاہئے۔ تب مائیکل نے بڑے ابا کی بات سنتے ہی ایک ریستوران کے پاس گاڑی روک دی تھی۔

ناشتہ کرنے کے بعد تازہ دم ہو کر ہم لوگ پھر سے اپنے سفر پر روانہ ہو چکے تھے۔ بڑے ابا پھر سے ہاتھ میں تسبیح تھامے سیٹ سے ٹیک لگائے آنکھیں موندے ذکر میں مصروف ہو چکے تھے اور میں ونڈ اسکرین سے باہر دیکھ رہا تھا۔ سمندر کی بے قرار موجوں کی طرح انسان دکھائی پڑ رہے تھے۔

"ہم لوگوں نے اپنے لئے کئی مرکز منتخب کر رکھے ہیں، اصل مرکز کو چھوڑ کر ہم فقط انہی کے گرد گھومتے چلے جا رہے ہیں۔'' مجھے بابا رب نواز کے کہے یہ الفاظ یاد آ رہے تھے۔ سچ ہی تو کہا تھا بابا رب نواز نے ہم اصل کو چھوڑ کر لاحاصل کے پیچھے بھاگیں گے تو حاصل فقط پچھتاوا ہی رہ جائے گا۔ جیسے آج پچھتاوا میرا مقدر بن چکا تھا لیکن کسی فورس آف اٹریکشن نے مجھے اپنے مدار سے بالکل خارج نہیں ہونے دیا تھا۔ وقتی طور پر میری رفتار سُست کر دی تھی۔ میرے ضمیر کو مردہ ہونے سے پہلے ہی جگا دیا تھا اور یہ سیلف ایکسائیٹڈ کا کام میرے احساسِ ندامت نے کیا تھا۔

ایسا ہی سوچتے ہوئے ونڈ اسکرین سے باہر دیکھتے ہوئے مجھے اندازہ ہوا کہ اب ہم اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے ہی والے تھے۔ مائیکل نے مسجد کے قریب پہنچ کر گاڑی روک دی اور ساتھ ہی گاڑی کا انجن بھی بند کر دیا تھا۔ میں اور بڑے ابا گاڑی سے اترے آج دھوپ خاصی چمکیلی اور تیز تھی لیکن جنوری کی سرد ہوا میں دھوپ کی کیا چلتی۔ میں اور بڑے ابا آگے بڑھے مائیکل بھی ہمارے ساتھ پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ جب مجھے یاد آیا کہ اصل چیز تو ہم گاڑی میں ہی بھول آئے تھے۔ وہ بقچہ جس میں عطر رکھے تھے اور ایک

چادر، یہ دونوں چیزیں میں نے مائیکل کو گاڑی سے لانے کے لئے واپس بھیج دیا تھا اور خود بڑے ابا کے ہمراہ میں اس اونچی مسجد کی سیڑھیاں چڑھنے لگا جو اس شہر کی خاصی پرانی جامع مسجد تھی۔ شہر کے بیچ و بیچ ہونے کے باوجود مسجد کے اطراف میں کچھ اس قدر پیڑ پودے موجود تھے کہ یہ جگہ کچھ الگ تھلگ سی ہی دکھائی پڑتی تھی۔

مسجد کے وسیع صحن میں اترتے ہی میری ناک کے نتھنوں سے وہی لاہوتی سی مسحور کن خوشبو ٹکرائی اور میرا ذہن جیسے اس جہاں کی ہر چیز سے بے نیاز کسی اور جہاں کی سیر کو نکل گیا تھا۔ جب مجھے بڑے ابا نے ٹوکا، میاں وہاں کہاں جا رہے ہو، راستہ اس طرف ہے۔ مسجد کی عمارت کے بائیں طرف ہی وہ راستہ تھا جو مسجد کے عقب میں جا نکلتا تھا۔ ہم اس راستے سے ہوتے ہوئے اس دوسرے صحن میں جا اترے جو پہلے صحن سے ذرا چھوٹا تھا، لیکن ایک اور فرق بھی تھا اور وہ یہ تھا کہ ابتدائی حصے میں فقط نماز کے اوقات میں ہی رونق دکھائی پڑتی تھی، لیکن عقبی جانب مسجد کے اس حصے میں جہاں بابا رب نواز رونق افروز تھے، دن، رات لوگوں کے آنے جانے کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔

اس صحن کو بھی دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا، ایک جانب بچے تعلیم کے لئے بیٹھتے تھے جبکہ دوسرے حصے میں وہ مصیبت زدہ لوگ بیٹھا کرتے تھے جو نہ جانے کتنے ہی میلوں کا سفر طے کر کے باباجی سے ملاقات کو آتے تھے اور پھر اپنی باری آنے کے انتظار میں وہ یہیں اس حصے میں ڈیرہ جما لیتے تھے۔ بڑے ابا کو میں نے ذرا دیر کو اسی جگہ رکنے کو کہا میں چاہتا تھا کہ مائیکل گاڑی میں سے سامان لے کر آجائے تو ہم اندر چلیں لیکن پھر نہ جانے کس سمت سے ایک ننھے سے بچے نے آکر میرے ہاتھ کو جھنجھوڑا، میں نے جو سر کو گھما کر اس کی جانب دیکھا تو وہ جھٹ سے بولا۔

"باباجی، آپ کو اس طرف یاد فرما رہے ہیں۔" یہ سن کر میں نے مسکا کر اس بچے کے گال کو تھپکا یا تو وہ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے پھر سے کسی سمت میں غائب ہو گیا تھا۔

"لو میاں باباجی کو ہمارے آنے کی خبر ہو گئی۔" بڑے ابا نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا اور ہم جو پہلے سے ہی شوقِ دیدار کو بے قرار تھے، اب ہماری بے تابی اور بڑھ گئی تھی۔ ہم سبھی کچھ بھلا کر آگے بڑھے اور اس نشیبی کمرے کی سیڑھیاں اترنے لگے جو پہلے صحن سے ذرا گہرائی میں تھا۔ آخری سیڑھی سے نیچے قدم رکھنے سے پہلے ہی میری نظر مجمعے میں بیٹھے بابا رب نواز پر پڑی۔ ایک سیکنڈ کے کسی ہزارویں حصے میں مجھے لگا سینکڑوں طرح کی روشنیاں میری قوتِ بصارت سے ٹکرائی اور اگلے ہی لمحے میں ہوش و حواس سے بیگانہ فرش پر جا گرا۔

باباجی کی سحر بھری آواز میرے کانوں سے ٹکرائی نہ جانے میں کتنی دیر تک بے ہوشی میں رہا تھا۔ باباجی کی آواز سن کر میں نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھولیں۔

"ایک تو بھلے آئے ہو میاں اور دوسرا تم اس عمر میں اپنے بڑے ابا کو بڑا پریشان کئے ہوئے ہو۔" بابا رب نواز کی یہ بات سن کر میں نے سر کو جو گھما کر دیکھا تو بڑے ابا مجھے واقعی مضطرب دکھائی پڑے۔

یہ دیکھ کر میں فوراً ہی اٹھ بیٹھا اور بابا رب نواز کے ہاتھوں کو بوسہ دیتے ہوئے میں نے اپنی آنکھوں سے لگالیا۔ اس وقت چند اور بھی عقیدت مند باباجی کے گرد موجود تھے۔ جب چند لمحوں کی خاموشی پاتے ہی میں نے اپنے دل میں اٹھتے سوال کو باباجی کے سامنے کہہ ہی ڈالا۔

"آخر کو ایسا کیا ہوا جو میں یوں اپنے ہوش وحواس سے ہی بیگانہ ہو گیا تھا؟" میرا سوال سن کر باباجی مسکرائے اور بولے۔

"کچھ ایسے انسان بھی ہوتے ہیں جن کے نامہ اعمال میں کوئی طویل ریاضتیں شامل نہیں ہوتیں چاروں طرف سے دنیا داری کے گورکھ دھندوں اور شیطانی پانسوں میں پھنسے کسی روز جو رب تعالیٰ کی طرف سے آئی کسی آزمائش پر پورے اترتے چلے جاتے ہیں۔ صبر، ہمت، حوصلہ اور سب سے بڑی بات جو تقویٰ رکھتے ہیں پھر وہ بارگاہِ خداوندی میں ان اللہ والوں سا مقام پالیتے ہیں جنہوں نے ساری زندگی عبادتوں ریاضتوں میں بیتائی ہوتی ہے۔" باباجی پھر فقط اتنا ہی بول کر خاموش ہو گئے تو میں سوچ رہا تھا کہ یہ میرے سوال کا جواب تو نہ تھا، شاید میں اپنی ناقص عقل وفہم سے باباجی کی یہ پیچیدہ باتیں سمجھنے سے قاصر تھا۔ یونہی باباجی کے پاس بیٹھے ہوئے ایک دم سے میرے ذہن میں خیال آیا کہ مائیکل ابھی تک گاڑی میں رکھی چیزیں لے کر نہیں پہنچا تھا حالانکہ ہمیں باباجی کے پاس بیٹھے کافی وقت بیت چکا تھا۔ پھر میری بے چینی کو جیسے باباجی نے بھانپ لیا تھا۔ میں ان سے اجازت لے کر اٹھا اور سیڑھیاں چڑھتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ ہو سکتا ہے مائیکل اس کمرے سے باہر ہی موجود ہو اور کمرے میں داخل ہونے سے ہچکچا رہا ہو لیکن باہر صحن میں پہنچنے پر وہ مجھے کہیں دکھائی نہ دیا، یونہی دائیں بائیں دیکھتے ہوئے میں مسجد کے بیرونی دروازے تک جا پہنچا اور بیرونی دروازے کی سیڑھیاں اترتے ہوئے جو میری نظر مائیکل پر پڑی تو وہ وہیں مسجد سے باہر سیڑھیوں کے پاس سامان لئے کھڑا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ جلدی سے میری جانب بڑھا۔

"مائیکل تم ابھی تک یہیں کھڑے ہو، میں اور بڑے ابا کب سے تمہارا انتظار کر رہے تھے۔" میری بات سن کر مائیکل معذرت خواہ انداز میں ہچکچاتے ہوئے بولا۔

"صاحب میں مسجد۔۔۔ میں۔۔۔ میں نے سوچا آپ کہیں۔۔۔" وہ جھجکتے ہوئے کھل کر بات نہیں کر پا رہا تھا لیکن میں اس کی بات کا مفہوم سمجھ چکا تھا۔

"مائیکل یہ اللہ تعالیٰ کا گھر ہے جس کے دروازے تو ہر کسی کے لئے کھلے ہیں تمہیں اندر آجانا چاہئے تھا۔ چلو اب آؤ میرے ساتھ۔" وہ ابھی بھی ہچکچا رہا تھا اور مجھے سامان وہیں سے پکڑا دینا چاہتا تھا لیکن اب میں اسے خود اندر لے جانا چاہتا تھا اور اسے ساتھ لے کر سیڑھیاں چڑھتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ مائیکل تو مسیحی تھا۔ ہمارے ہاں تو فرقہ واریت کی کچھ ایسی فضا قائم ہو چکی ہے کہ کسی ایک

فرقے کے مسلمان کسی دوسرے فرقے کی مسجد میں جا کر نماز پڑھنا پسند نہیں کرتے۔ مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ آج ہم کس قدر بٹ چکے ہیں۔ ہم سیڑھیاں چڑھ کر مسجد کے صحن میں پہنچے تو ایک جانب لوگوں کو وضو کرتا دیکھ کر مائیکل رک گیا۔

"صاحب اللہ تعالیٰ کے گھر آ ہی گیا ہوں تو منہ ہاتھ دھولوں۔" مائیکل کی بات سن کر میں مسکرایا اللہ تعالیٰ کے گھر داخل ہوتے ہی سب سے پہلے اس کے ذہن میں طہارت کا خیال ہی پیدا ہوا تھا پھر مائیکل وضو خانہ کی جانب بڑھ گیا تھا اور میں ایک بغچہ جس میں وہ عطر تھے جو میں باباجی کو تحفتاً دینے کے لئے لایا تھا اور ایک چادر جو ان کی امانت تھی اور خصوصاً جو میں انہیں شکریہ کے ساتھ لوٹانے آیا تھا۔ یہ سامان لے کر میں مسجد کے عقبی حصے کی جانب بڑھا پھر عقبی حصے کی سیڑھیاں اتر کر میں باباجی اور بڑے ابا کے پاس پہنچا اور پھر سے سلام کرنے کے بعد باباجی کے پہلو میں بیٹھ گیا۔

باباجی بڑے ابا سے گفتگو میں محو تھے۔ جب ان کا سلسلہ کلام ختم ہوا تو میں نے نہایت محبت سے انہیں عطر سے بھرا بغچہ تحفتاً پیش کیا جسے انہوں نے خوش دلی سے قبول فرمالیا۔ میں نے پھر ان کی دی چادر ان کی جانب بڑھائی جسے دیکھ کر وہ مسکرا دیئے کچھ دیر ایسے ہی چادر کو دیکھتے رہے اور پھر بولے۔

"طٰہٰ میاں چادر تو ہمیں لوٹانے آ ہی گئے، اب کی بار ہمارے پاس ہی ٹھہر جاؤ۔" باباجی کی بات سنتے ہی جیسے میں بھونچکا سا ہو کر رہ گیا تھا۔ یارب میں اس قابل کہاں، مجھے جیسے اپنی سماعت پر یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ باباجی مجھے اپنے ساتھ اللہ کی راہ میں لے جانا چاہتے تھے۔ وہ میرا بخت چمکانا چاہتے تھے اور میں اپنے ہی آپ میں پہیلی بنا تغافل میں پڑا رہا، وہ مجھے کہتے رہے اور میں فقط سنتا رہا۔

"کہاں تک بھاگو گے میاں کسی نہ کسی روز تو ہمارے ساتھ چلنا ہی ہے تمہیں۔" ان کی یہ بات سن کر میں نے بڑے ابا کی جانب دیکھا۔ مجھے لگا جیسے وہ بھی تیار بیٹھے تھے اٹھنے کے لئے، میں نے سر گھما کر باباجی کی جانب دیکھا اب کی بار وہ مسکرا دیئے، انہوں نے اپنا ایک ہاتھ میرے دائیں کاندھے پر رکھا اور نہایت شفقت سے بولے۔

"جیسی تمہاری مرضی میاں یہاں زور زبردستی نہیں چلتی۔" وہ میری حالت کو بھانپ گئے تھے۔ بڑے ابا نے باباجی سے اجازت طلب کی اور میں جیسے بھاری ہوتے قدموں کے ساتھ ان کے ہمراہ چل دیا۔ جیسے میرے وجود میں کوئی گھمسان کی جنگ چھڑ چکی تھی۔ دونوں طرف کی فوجیں توپیں گاڑھے ایک دوسرے پر گولے برسا رہی تھیں اور دونوں ہی قوتیں ہم پلہ تھیں فقط کمزور تھا تو میرا وجود جسے میں گھسیٹتا ہوا بڑے ابا کے ساتھ چل رہا تھا۔ میں کوئی فیصلہ نہ کر پایا تھا، شاید ابھی آزمائش طویل تھی یا میں خود ہی اپنے آپ کو آزمائشوں میں ڈالنے کے لئے آمادہ ہو چکا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆

باب 6

خطاء اور عطاء

بابا رب نواز کی طرف سے ہو کر آنے کے کئی دن بعد تک بھی میں مضطرب سا جیسے کسی کشمکش میں مبتلا رہا۔ ہر گھڑی یہی سوچتا رہا کہ آخر کو ایسا کیا بچا تھا اب میری زندگی میں جس کی خاطر میں نے بابا جی کی بات سنی اَن سنی کر دی اور بڑے ابا کے ساتھ پھر سے گھر چلا آیا۔ بہت سوچتا رہا لیکن مجھے اس سوال کا جواب نہ ملا۔ اب میرے پاس بابا جی کی نشانی وہ کالی چادر بھی نہ تھی جس سے اٹھنے والی سحر زدہ سی خوشبو مجھے غموں سے وقتی نجات دلا کر راحت اور سکون کی ایسی اتھاہ گہرائیوں میں لے جاتی تھی جہاں میں غوطہ زن نہ جانے کس جہاں جا نکلتا تھا۔

اگلے پل ہی میں نے ارادہ کر لیا کہ میں پہلی فرصت میں ہی بازار جا کر ویسی ہی کالی چادر خرید لاؤں گا، اب مجھے چادر اوڑھنے کی عادت ہو چکی تھی اور پھر شام کو بازار جا کر میں ایک کالی چادر لے ہی آیا۔ اسے اپنی پسند کا عطر لگایا لیکن نہ جانے کیوں پھر بھی وہ مجھے پسند نہ آئی اور میں سوچنے لگا کہ بابا جی نے اپنی چادر مجھے ہمیشہ کے لئے کیوں نہ دے دی۔ جانے اس میں بھی کیا بھید چھپا تھا۔ اپنے کمرے میں بیٹھا اس وقت میں یہی کچھ سوچ رہا تھا جب بابا عبد القادر میرے کمرے میں آئے وہ بڑے ابا کا پیغام لے کر آئے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ یومنہ کو اسٹیشن تک چھوڑ آنے کے لئے میں جاؤں۔ وہ بڑے ابا کا یہ پیغام دے کر چلے گئے تو ان کے جانے کے کچھ دیر بعد ہی میں اپنے کمرے سے نکل کر پورچ کی جانب بڑھا تو وہاں پہنچ کر یومنہ کو دیکھتے ہی مجھے یاد آیا میں نے اسے چند روز پہلے ایک عبایا تحفتاً دیا تھا لیکن اب اسے عبایا کے بغیر دیکھ کر میں سوچ رہا تھا کہ میں فقط اتنا ہی کر سکتا تھا، وہ اب سبھی سے الوداعی ملاقات کر رہی تھی۔

جب بابا عبد القادر اس کا سامان اٹھا کر گاڑی میں رکھ رہے تھے۔ وہ سامان گاڑی میں رکھ چکے تو میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور یومنہ کے میرے مد مقابل سیٹ پر بیٹھتے ہی میں نے گاڑی دھیرے سے آگے بڑھا دی تھی، راستہ بھر یومنہ کو چپ چاپ دیکھ کر میں سوچ رہا تھا کہ میں نے اسے عبایا فقط اس لئے لے کر دیا تھا کیونکہ ایسا کرنے کو میرا من چاہا تھا، میرا دل چاہتا تھا کہ میں اسے وہی عزت دوں جس عزت کی وہ عورت ہونے کی وجہ سے حق دار تھی، میں جو اس کے ساتھ ایک غیر محرم تھا، اگر کبھی انجانے میں ساتھ چلتے ہوئے اس کی جانب نگاہ اٹھ جائے تو میری نگاہ اس کے وجود تک نہ پہنچ پائے اور میں ہی کیا اس کے ارد گرد موجود کوئی بھی شخص اس کی جانب دیکھے تو اس کی نگاہ خود ہی پلٹ جائے کہ یہ ایک باحیا باوقار مسلم عورت ہے۔

معمولی علیک سلیک کے بعد راستہ بھر ہم دونوں خاموش ہی رہے اسٹیشن پہنچ کر جو میں نے معلومات حاصل کیں تو ٹرین کی روانگی ابھی پونے دو گھنٹے تاخیر سے ہونا تھی۔ ہم لوگ کافی پہلے اسٹیشن پہنچ چکے تھے۔ میں جو یہ معلومات لے کر واپس گاڑی کے پاس پہنچا تو یومنہ گاڑی سے نکل کر پلیٹ فارم پر موجود بھیڑ میں میرا ہی انتظار کر رہی تھی۔ قریب پہنچ کر میں نے اسے بتایا کہ ابھی ٹرین کی روانگی میں پونے دو گھنٹے پڑے ہیں۔ جسے سن کر وہ کچھ سوچنے لگی تھی اور میں قریب کھڑا سمجھ گیا تھا کہ میری بات سن کر وہ شش و پنج میں پڑی یہی سوچ رہی ہو گی کہ اب اتنا وقت جو وہ مجھے پہلے ہی اسٹیشن لے آئی تھی، تو مجھے اس کے ہمراہ خواہ مخواہ میں ہی انتظار کرنا پڑے گا۔ اسے تاحال خاموش دیکھ کر میں خود ہی بول پڑا کہ میں اسے گاڑی میں بٹھا کر گاڑی روانہ ہونے تک یہاں سے کہیں نہیں جانے والا، میری یہ بات سن کر جیسے وہ کچھ اچھا محسوس کرنے لگی تھی۔ پھر ہم دونوں ہی پلیٹ فارم پر انتظار کرنے والوں کے لئے لگے بینچ کی جانب بڑھے اور پھر جس بینچ پر ہم بیٹھے تھے وہاں پہلے سے ہی ایک معمر شخص بیٹھا کسی کا انتظار کر رہا تھا۔ بینچ پر پانچ، چھ لوگوں کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ اب ہم تینوں ہی یوں بیٹھے تھے جیسے امتحان کے وقت استاد بچوں کے درمیان فاصلہ چھوڑ کر بٹھاتے ہیں۔ مسافروں کی بھیڑ بھاڑ میں سامان کی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقلی کرتے قلی بھی میری توجہ کا مرکز بنے ہوئے تھے اور میرے ساتھ بیٹھی یومنہ بھی شاید اسی بھیڑ کا مشاہدہ کر رہی تھی جب پھر کسی جانب سے ایک عبایا پہنے ہوئے لڑکی ہمارے پاس آئی اور وہ معمر شخص جو ہمارے قریب چپ چاپ بیٹھا تھا، وہ اس کا ایک ہاتھ تھامے اسے اپنے ساتھ لے گئی اور میں انہیں دور تک جاتا دیکھتا رہا۔ جب یومنہ کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

"طٰہٰ آپ یہی سوچ رہے ہوں گے ناں کہ میں نے آپ کا تحفتاً دیا عبایا نہیں پہنا۔" میں اس کی بات پر جس قدر حیران ہو کر اس کی جانب متوجہ ہوا تھا۔ اب اسی قدر متجسس ہو کر اس کی اگلی بات سن رہا تھا۔ "دراصل میں اب تک زندگی کو جیسے جیتی آئی ہوں، میں نے کبھی ایسے کچھ سوچا ہی نہیں، زندگی میں ٹھہرنے کا ایسا سوچنے کا کبھی موقع ہی نہیں ملا۔" اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گئی اور میں دعا کرنے لگا کہ یومنہ اللہ آپ کو کبھی کسی آزمائش میں نہ ڈالے کہ آپ کو زندگی میں ٹھہر جانا پڑے، وہ رب العزت آپ کو سبھی کچھ عطا کر دے بن مانگے۔" میں اس کے لئے دعائیں مانگ رہا تھا اور وہ پھر سے مجھ سے مخاطب تھی۔

"طٰہٰ میں آپ سے جاننا چاہتی ہوں کہ ایسا آپ کی زندگی میں کیا ہوا تھا؟ جس نے آپ کی زندگی کا رخ ہی بدل دیا۔ آپ ہمیشہ سے تو ایسے نہ تھے، آپ سے کوئی شخص بھی ایک بار مل لینے کے بعد یہ ضرور سوچے گا کہ آپ بہت الگ ہیں۔" یومنہ بولتی رہی اور اس کی باتیں سن کر مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے ارد گرد کوئی تیز آندھی چلنے لگی تھی۔ جس میں اُڑ رہے اوراق میرے ماضی کے مختلف ادوار تھے اور پھر میرے لب ہلنے لگے جن سے نکلتی مدھم آواز کو سننے کے لئے یومنہ مجھ سے ذرا اور قریب آ چکی تھی۔

مجھے یاد آ رہا تھا کہ اس روز خوب بارش ہو رہی تھی۔ ایسی موسلا دھار بارش کہ تھمنے کا نام ہی نہ لے رہی تھی اور کہنے والے کہہ رہے تھے کہ ہمارے خاندان کی ہر شادی پر موسم ایسا ہی ہو جاتا تھا۔ غلام مصطفیٰ عالم کی شادی ہونے جا رہی تھی۔ عبیرہ کی سالگرہ پر ماں

اور ابا کی ملاقات ایک ایسے خاندان سے ہوئی تھی جو انہیں ہر لحاظ سے اپنے شایانِ شان لگا تھا۔ لڑکی کسی غیر ملکی یونیورسٹی سے اپنی تعلیم مکمل کر کے لوٹی تھی اور ماں کو ایسی ہی بہو کی تلاش تھی جو انگریزی خوب جانتی ہو اور جب وہ اپنی ہم عصر خواتین سے اسے ملائیں تو وہ اپنی انگریزی سے انہیں خوب مرعوب کر سکیں۔

ہم لوگ جو بے موقع اپنے لئے جشن کا سامان ڈھونڈ لیا کرتے تھے۔ اب ایسے ہی موقعوں پر ایسی ہی راتوں میں تو ہمارے خزانوں کے بند منہ کھلتے تھے۔ پیٹیاں بھر بھر کے پیسہ صرف آج کی رات رقص پیش کرنے والیوں پر نچھاور کرنے کو لایا گیا تھا۔ آتش بازی، دیسی ولایتی سبھی کے لئے سبھی قسم کے انتظامات پورے تھے۔

لیکن ان سبھی قسم کی فضولیات سے اگر کوئی واحد بندہ ناخوش تھا تو وہ فقط بڑے ابا تھے۔ وہ میرے ابا کو بلا کر ایک طرف لے گئے اور انہیں سمجھانے لگے کہ یہ سبھی قسم کی بے ہودگی ہمارے رسم و رواج نہیں، لیکن ابا کہاں ان کی بات سننے والے تھے۔ الٹا انہیں سمجھانے لگے کہ اب ان کا زمانہ نہیں رہا۔ عین اسی وقت رقص و سرور کی محفل اپنے عروج پر تھی۔ میں نے جو مست ہو کر کسی رقص پیش کرنے والی کا بازو تھاما تو دوسرے ہاتھ سے نوٹوں کی ایک گڈی ہوا میں اچھال دی۔ روپوں کی برسات ہونے لگی تھی۔ ایک برسات باہر تھمنے کا نام نہ لے رہی تھی تو دوسری برسات ہم لوگوں نے روپوں کی کر رکھی تھی۔ دفعتاً میری نظر ایک طرف کھڑے بڑے ابا پر پڑی وہ میرے ابا کو ابھی تک مسلسل سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے کیونکہ انہیں یہ فضولیات بالکل پسند نہ تھیں۔ وہ چاہتے تھے کہ خورشید عالم میرے ابا یہ سب ناچ گانا بند کروا دیں۔ میں ایسے ہی مست ماحول میں جھومتا وہاں پہنچا اور بڑے ابا جو برابر میرے ابا کو سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے اور اس بات سے بے خبر تھے کہ میں کب وہاں پہنچا اور پھر میں نے جو انہیں عقب سے اپنی بانہوں کے گھیرے میں لے لیا تو اب وہ چھڑانے کی کوشش میں مجھے سنانے لگے تھے۔ یہ دیکھ کر پاس کھڑے میرے ابا زوردار قہقہے لگانے لگے تھے پھر میں بڑے ابا کو اپنی بانہوں کے حصار سے آزاد کر کے اب انہیں اپنے ساتھ جھومنے گانے کی دعوت دے رہا تھا۔

میں جانتا تھا کہ وہ بھی اپنے بڑے پوتے کی شادی پر کس قدر خوش تھے، ان کا سارا غصہ، ساری خفگی ظاہراً ہی تھی لیکن پھر وہ مجھے بھی سمجھانے لگے تو میں انہیں اپنے ساتھ لے جا کر گھر کے اس خاص حصے میں چھوڑ آیا جہاں انہی کی ٹائپ کے سنجیدہ حضرات بیٹھے ہم آج کی نسلوں پر گفتگو فرما رہے تھے۔ میں فوراً ہی وہاں سے پلٹا میرے سبھی دوست احباب اس طوفانی موسم کی پروا کئے بغیر پہنچ چکے تھے ان سبھی کے بیچ میں خود کو تنہا محسوس کر رہا تھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ عبیرہ ابھی تک نہ پہنچی تھی اور پھر مجھے کسی سے معلوم پڑا کہ داؤد بھی ابھی تک نہ پہنچا تھا۔ یہ جان کر مجھے کچھ عجیب بے چینی کا احساس ہونے لگا کچھ دیر پہلے ہی عبیرہ سے میری بات ہوئی تھی، اس کا کہنا تھا کہ بارش کے تھمتے ہی وہ چلی آئے گی اور جب میں نے اس سے داؤد کے بارے میں پوچھا تو اس نے لاعلمی کا اظہار کیا کہ وہ نہیں جانتی کہ داؤد ابھی تک کیوں نہیں پہنچا پھر میں نے جو داؤد کا نمبر لگایا تو وہ بھی مسلسل آف جا رہا تھا۔ اب میں نے سبھی قسم

کے غلط خیالات کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کی اور پھر سوچا کہ بہت ہو گیا اب یہ سب میں عبیرہ کو خود لینے جاؤں گا اور یہ سوچتے ہوئے میں گاڑی بھی اسٹارٹ کر چکا تھا اور گھر سے نکلنے ہی والا تھا جب عبیرہ کی کال آ گئی۔ میں نے جھٹ کال ریسیو کی اور پھر ساتھ ہی میں نے گاڑی کا انجن بند کر دیا۔ اس کی طبیعت اچانک بگڑ گئی تھی اور وہ کہہ رہی تھی کہ وہ آج نہیں آ پائے گی، یہ سنتے ہی میں گاڑی سے اترا تو ایک لات رکھ کے گاڑی کو رسید کی گویا ایسے میں اپنا غصہ قابو میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اب پھر سے غلط قسم کے وسوسے میرے ذہن میں یلغار مچانے لگے تھے۔ عین اسی لمحے اندر ہال میں گلوکارہ نے جو نیا شوخ سا گانا شروع کیا تو وہاں لگی بھیڑ کی اونچی سیٹیاں اور شور کی آوازیں باہر پورچ تک سنائی دے رہی تھیں۔ میں وہاں سے تیز تیز قدم اٹھاتا ہال میں پہنچا اور پھر مست منچلوں کی بھیڑ میں نہ جانے کہاں سے کیسے ایک بوتل میرے ہاتھ لگ گئی اور پھر میں نے اسے منہ سے لگالیا۔ ہوش میں تو میں پہلے ہی نہ تھا اور میرے ابا بھی نہ تھے، ورنہ بڑے ابا کو بھلا ہمیں یوں سمجھانے کی ضرورت کیوں پیش آتی۔ ہوش میں ہوتے تو کیا یوں لاکھوں روپیہ ناچنے والیوں پر نچھاور کرتے؟ اگر حواس قائم ہوتے تو کیا گھر جیسے پاکیزہ ماحول میں ننگے سر اور بدن والی عورتوں کو نچاتے اور اب پی لینے کے بعد ہوش سے ہی نہیں ہوش و حواس سے بے گانہ ہو کر میں کبھی کسی رقاصہ کا بازو تھام لیتا تو کبھی کسی کے ہمراہ رقص کرنے لگتا تو کبھی مجھے اپنے ساتھ ناچ رہی رقاصہ عبیرہ دکھائی دینے لگتی اور میں یوں کھل اٹھتا جیسے عبیرہ آ گئی ہو اسے یہ احساس ہو گیا کہ طٰہٰ عالم اسے کتنا مس کر رہا ہے اور وہ بھری برسات میں اپنی طبیعت کی خرابی کے باوجود میری خوشی کی خاطر چلتی آئی ہو اور اب ناچ ناچ کر مجھ پر فدا ہوئی جا رہی ہو نشے نے بری طرح سے مجھ سے میرے ہوش و حواس سلب کر رکھے تھے۔

اب میں جو سامنے ناچ رہی رقاصہ کو عبیرہ سمجھ رہا تھا تو اسی خوش فہمی میں لڑکھڑاتے ڈگمگاتے قدموں کے ساتھ جھوم رہا تھا پھر جیسے ہی وہ میرے وجود سے آ لگی میں نے اس کا بازو تھام لیا اور بھیڑ کو چیرتا ہوا آگے بڑھا، ہال سے نکلتے ہی کمروں کی لمبی قطار شروع ہو چکی تھی۔ یہ ہال اور ملحقہ کمرے ہمارے محل نما گھر کا مہمان خانہ تھا۔ میں اسے ساتھ لئے راہداری میں لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ آگے بڑھا، ایک کمرے کے ہینڈل لاک کو گھمایا وہ بند تھا۔ میں اگلے کمرے کی جانب بڑھا ہینڈل گھمایا اور وہ یوں کھلا کہ میں گرتے گرتے سنبھلا۔ کسی عقبی روشن دان سے کمرے میں روشنی آ رہی تھی اور ویسے بھی اب میں ہوش میں ہی کہاں تھا کہ لائٹ آن کرتا۔

صبح جو میری آنکھ کھلی تو بستر پر میں فقط تنہا ہی تھا۔ نشہ اتر چکا تھا، لیکن لباس پہنتے ہوئے میں یہی سوچ رہا تھا کہ عبیرہ اگر میرے ساتھ تھی تو پھر وہ ابھی کہاں ہے؟ لیکن میرا یہ خیال غلط ثابت ہوا وہ رات ہماری طرف آتی ہی کب تھی، یہ بات مجھے گھر کے ملازم سے پتہ چلی تو اب میں اپنا سر تھامے بیٹھا تھا۔ رات بھر میرے ساتھ میرے بستر پر جو تھی وہ عبیرہ نہیں تھی۔ مجھے اپنے آپ پر ہی نہیں عبیرہ پر بھی غصہ آ رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اگلے کئی روز تک میں نے اس سے بات کرنا ترک کر دیا تھا اور جب شادی کی سبھی رسومات اختتام پذیر ہو چکی تھیں، ایک روز داؤد اپنی جیپ پر میرے گھر آ پہنچا۔ عبیرہ اس کے ساتھ ہی تھی، وہ میری عبیرہ کے ساتھ چل

رہی ناراضگی کو لے کر ہمارے درمیان صلح کروانا چاہتا تھا۔ مجھے داؤد سے کسی بھلے کی امید تو نہ تھی، لیکن آج جب وہ میرے اور عبیرہ کے درمیان صلح کروانے کی غرض سے آیا تھا تو مجھے وہ بے حد پیارا لگ رہا تھا۔ میں جو ایک پل بھی عبیرہ کے بغیر رہ نہیں سکتا تھا آج تین، چار روز سے میں نے اس سے بات تک نہ کی تھی، مجھے بھی بس ذرا بہانے کی تلاش تھی۔ داؤد جیسے پہلے سے ہی پروگرام بنا کر آیا تھا۔ ہم تینوں گھر سے نکلے راستے میں دو ایک اور دوستوں کو ساتھ لیا اور ہمارے فارم ہاؤس جا پہنچے۔

فارم ہاؤس پہنچتے ہی سبھی نے پول میں چھلانگیں لگا دیں اور میں عبیرہ کو لے کر ایک طرف کو چل پڑا۔ آج کتنے ہی دنوں بعد ہم ایک ساتھ تھے اور بالکل خاموشی سے ایک ساتھ چل رہے تھے۔

"عبیرہ!"

"ہوں" وہ میرے آواز دینے پر چونکی۔

کیا سوچ رہی ہو تم عبیرہ؟" اس کے یوں چونکنے پر میں نے سوال کیا۔

"نہیں تو۔۔۔ کچھ بھی تو نہیں۔"

"بھائی کی شادی تو اب ہو گئی، اب بتا ہوں میں تو کس روز لینے آؤں تمہیں بینڈ باجے کے ساتھ۔" میں نے ایک دم سے رکتے ہوئے اس کے بالکل سامنے آ کر پوچھا۔ وہ میری بات سن کر نہ تو خوش ہوئی اور نہ ہی اس نے کوئی جواب دیا۔ وہ مجھے یونہی کھڑا چھوڑ کر ایک قدم آگے بڑھ گئی اور میں بھی پلٹ کر اس کے ساتھ ہو لیا۔ ہم لوگ چلتے چلتے کافی آگے نکل چکے تھے۔ تب اس کی خاموشی اور بے اعتنائی پر مجھے ایک دم سے غصہ آ گیا اور میں پھٹ پڑا۔ "عبیرہ" میں نے بلند آواز سے اسے پکارا۔ وہ ششدر سی ہو کر مجھے دیکھنے لگی۔ جب میں نے اپنی بات مکمل کی "تمہیں آخر ہوا کیا ہے؟"

"طہٰ یہ تم کس لہجے میں مجھ سے بات کر رہے ہو۔" میرے غصے سے چلانے پر اس نے حیرت کا اظہار کیا۔

میں آگے بڑھا اور اپنے غصے پر قدرے قابو پاتے ہوئے میں نے اس کے کاندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس کی نگاہوں میں جھانکنے کی کوششیں کی۔

عبیرہ میں فقط یہ چاہتا ہوں کہ جب ہم دونوں ہی راضی ہیں تو پھر شادی میں دیر کیسی؟" وہ میری بات سن کر مجھ سے نگاہیں چرا گئی اور مجھ سے قدرے پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔

"طہٰ میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی۔"

"تم جھوٹ بول رہی ہو، تمہیں وجہ بتانا پڑے گی عبیرہ۔"

"آخر کو کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ بولو۔۔۔" میں نے ایسا گرج دار آواز سے کہا اس پل مجھے نہ جانے کیا ہو رہا تھا جیسے آسمان ٹوٹ پڑا تھا یا زمین میرے پیروں تلے سے کھسکنے لگی تھی۔

"میں وجہ بتانا ضروری نہیں سمجھتی۔" وہ فقط اتنا کہہ کر واپسی کے لئے پلٹ گئی اور میں وہیں ساکت کھڑا حیرت زدہ سا اپنے ذہن میں اٹھ رہے اس سوال کا جواب کھوج رہا تھا کہ آخر کو وہ ایسا کیوں کر رہی تھی؟ میرے ذہن میں اٹھ رہے اس سوال کا جواب بھی فقط وہی دے سکتی تھی، جو یہ کہہ کر پلٹ گئی تھی کہ وہ جواب دینا ضروری نہیں سمجھتی۔ میں کچھ دیر وہیں حیرت سے مجسمہ بنا کر کھڑا رہا اور پھر اسے کافی آگے نکلتا دیکھ کر میں بھی پیچھے چل پڑا۔

جب میں سبھی کے پاس پہنچا تو وہ اس وقت شرارتوں میں مگن تھے۔ میں چپ چاپ ان کے پاس سے گزر جانا چاہتا تھا جب داؤد نے مجھے آواز دی۔ وہ مجھے اپنے ساتھ پول میں فٹ بال کھیلنے کی دعوت دے رہا تھا اور عبیرہ بھی پیروں کو پول میں لٹکائے وہیں کنارے پر بیٹھی تھی۔ میں داؤد کو کوئی بھی جواب دیئے بغیر آگے بڑھ گیا تھا۔ جب کبھی میں بے حد پریشان یا مایوس ہونے لگتا تھا یہیں اسی فارم ہاؤس آکر ولایتی کی جگہ برانڈی پیا کرتا تھا، پول کے پاس ہی فارم ہاؤس کے ریسٹ رومز تھے میں نے اندر پہنچ کر برانڈی کی ایک بوتل نکالی اور اسے گھونٹ گھونٹ پینے لگا۔

"تمہیں وجہ بتانا پڑے گی۔۔۔ عبیرہ؟"

"آخر کو کیا وجہ ہے بولو۔۔۔؟"

میرا ہر گھونٹ پھر سے اس سے وہی سوال دہرا رہا تھا اور اس کا بھی وہی کھرا سا جواب میرے ذہن میں کسی ہتھوڑے کی ضرب بن کے برس رہا تھا۔

"میں وجہ بتانا ضروری نہیں سمجھتی۔" میں اس کے اس کھرے سے جواب کے بدلے خود ہی وجہ کھوجنے لگا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ برانڈی کا تیز نشہ میرے اعصاب پر چڑھنے لگا تھا لیکن میں کسی نتیجے پر پہنچ نہیں پایا کہ اس کے ایسے رویئے کی کیا وجہ ہو سکتی تھی۔ وہ جو میرے بن ایک پل نہیں رہ سکتی تھی۔ میری خواہش جاننے کے بعد خوشی سے پاگل ہوئی جاتی تھی۔ سبھی کو بتاتی پھرتی تھی کہ طٰہ عالم اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اب یوں چند دنوں میں ہی ایسی کیا وجہ بن گئی تھی کہ وہ مجھ سے یوں متنفر ہو رہی تھی۔

داؤد مجھے اور عبیرہ کو یوں ایک ساتھ اس جگہ صلح کروانے کی غرض سے لایا تھا، لیکن اسے کیا پتہ تھا کہ یہاں آکر ہمارے بیچ نازک سا بندھن ہی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہونے لگے گا۔ میں اسی رنج میں گھلتا کافی دیر سے اندر بیٹھا پی رہا تھا۔ جب داؤد میرے پاس آیا، وہ مجھے اب جلد یہاں سے واپس چلنے کا کہہ رہا تھا۔ سورج غروب ہو رہا تھا اور اب ہمیں یہاں سے نکلنا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ وہ گاڑی سٹارٹ کرے میں پہنچ رہا ہوں۔ وہ میری بات سن کر چلا گیا لیکن اس نے مجھ سے یہ تک دریافت نہیں کیا کہ آخر میں جو یہاں عبیرہ سے صلح کرنے آیا تھا اب یوں مجنوں بنا پی کیوں رہا ہوں۔ کاش! اس وقت میں نے اس بات پر ہی غور کر لیا ہوتا تو مجھے میرے سوال کا جواب مل گیا ہوتا۔

میں اپنی جگہ سے اٹھا لیکن خود کو سنبھال نہیں پایا اور لڑکھڑاتے ہوئے گرتے گرتے بچا۔ کمرے میں بکھری میز اور کرسیوں کا سہارا لے کر میں ایک طرف موجود الماری کی جانب بڑھا، الماری کے پاس پہنچ کر میں نے ایک ناگوار ساڈکار لیا اور جیب سے چابی نکال کر لگائی پھر الماری کا دروازہ کھلتے ہی اس میں بنے ایک چھوٹے دراز میں سے میں نے پھر چابی لگا کر ایک ریوالور نکالا، اس میں گولیاں چیک کیں اور پھر اسے اپنی پینٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ بسا اوقات فارم ہاؤس سے نکلنے میں مجھے دیر ہو جاتی تو میں یہاں اپنی حفاظت کے لئے رکھے ریوالور کو واپسی کے لئے اپنے ساتھ رکھ لیا تھا۔ اب اس کام سے فارغ ہوتے ہی میں جو باہر نکلا تو ٹھیک سے چل بھی نہیں پا رہا تھا۔ میں نے دور سے ہی دیکھا داؤد ڈرائیونگ سیٹ پر موجود تھا اس کے مقابل سیٹ پر عبیرہ بیٹھی تھی۔ پچھلی جانب دو دوست بیٹھے تھے جن میں سے ایک مجھ پر نظر پڑتے ہی جیپ سے کود کو میری جانب بڑھا تو اس کا ایک بازو تھامے میں آگے بڑھا، میرے جیپ میں بیٹھتے ہی داؤد نے جیپ آگے بڑھا دی تھی۔ راستہ بھر سبھی آج فارم ہاؤس میں بِتائے دن پر تبصرہ کرتے رہے۔ داؤد کے قہقہے سب سے زیادہ بلند تھے اور میں نشے میں دھت ابھی تک اسی وجہ کو تلاش کرنے میں مگن تھا جو عبیرہ بتانا ضروری نہیں سمجھتی تھی۔

میں اکثر اس کی جانب نگاہ اٹھا کر دیکھ لیتا تھا وہ بھی مجھے میری طرح چپ چاپ کھوئی کھوئی سی بیٹھی دکھائی دی۔

جب کبھی میں اس کی جانب دیکھتا تو وہ یوں ظاہر کرتی جیسے اسے خبر ہی نہ ہو کہ میں اسے دیکھ رہا ہوں اور جب میری نگاہ کسی دوسری جانب ہوتی تو وہ اک نظر مجھے پلٹ کر دیکھ لیتی۔۔۔ کیسے بے بس سے بنے بیٹھے تھے ہم دونوں۔ اب جیپ چھوٹے چھوٹے قصبوں سے ہو کر گزر رہی تھی۔ ہم لوگ نصف سے زائد سفر طے کر چکے تھے۔ رات کے سوا دس ہو رہے تھے اور ان چھوٹے چھوٹے قصبوں کی سبھی دکانیں تقریباً بند ہو چکی تھیں۔

میں اب تک کئی سگریٹ پھونک چکا تھا۔ آخری سگریٹ کو پھینکتے ہوئے میں نے ایک اور سگریٹ ہونٹوں میں دبایا اور جو لائٹر کو جلانے لگا تو اس کا کمزور سا شعلہ سگریٹ کو سلگانے کے لئے ناکافی ثابت ہوا۔ میں نے غصے سے لائٹر ایک جانب ہوا میں اچھال دیا، لیکن کسی اور کے پاس بھی اس وقت کوئی ماچس یا لائٹر نہ تھا۔ میں نے اردگرد نگاہ دوڑائی اور پھر ایک جگہ روشنی دیکھ کر میں نے داؤد کے کاندھے پر ہاتھ رکھا، میں اس کی عقبی جانب اس کے قریب ہی بیٹھا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا، اس نے جیپ دکان کے بالکل قریب سامنے لے جا کر کھڑی کر دی۔

میں جیپ کے رکتے ہی نیچے اترا ایک دوست مجھے سہارا دینے کے لئے اترنے لگا تو میں نے اسے روک دیا۔ میں دکان کی جانب بڑھا دکانوں کی لمبی قطار میں فقط وہ پہلی دکان ہی کھلی پڑی تھی۔ دکان کے سامنے برآمدے کی ملگجی روشنی میں جو میں آگے بڑھا تو مجھ دیکھ کر دکان میں موجود شخص اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا۔ سر پر سفید جالی دار ٹوپی چہرے پر سنت کے مطابق داڑھی، سفید لباس پہنے وہ چوبیس پچیس سالہ خوبصورت نوجوان شخص تھا اور اس وقت اس کے ہاتھ میں قرآن تھا، جسے میرے سامنے ہی اس نے چوم کر

آنکھوں سے لگا کر ایک جانب رکھا اور میری جانب متوجہ ہو کر دیکھنے لگا۔ میں کاؤنٹر کے قریب پہنچا اور جیسے ہی میں نے بولنے کے لئے لب کھولے اس نے میرے منہ سے آتی شراب کی ناگوار بو کو محسوس کرتے ہوئے اپنی ناک پر ہاتھ رکھ لیا۔ اس کی اس حرکت کی پرواکئے بغیر میں نے اسے کہا کہ مجھے ماچس یا لائٹر چاہیے یہ سن کر اس نے ہاتھ اپنے چہرے سے ہٹایا اور یوں غصے اور حقارت سے ایک ہاتھ آگے بڑھا کر جیسے اس نے مجھے دھتکارتے ہوئے وہاں سے ہٹ جانے کو کہا۔ اس کا وہ ہاتھ آگے بڑھا کر مجھے ایسا کہنے کی دیر تھی کہ میں پھر اپنے آپے میں نہ رہا، میری دماغی حالت جو پہلے ہی ابتر تھی اس کی اس حرکت نے مجھے جیسے پاگل بنا کے رکھ دیا اور میں نے اگلے ہی پل جیب میں رکھے ریوالور کو نکالا اور اس پر گولی چلا دی۔

گولی کے چلتے ہی وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھے کاؤنٹر کے دوسری جانب فرش پر جا گرا اور میرا ہاتھ جیسے ابھی تک وہیں ہوا میں ہی معلق تھا جب عبیرہ کی چیخ میرے کانوں سے ٹکرائی میں نے پلٹ کر دیکھا داؤد جیپ سٹارٹ کر چکا تھا، میں تیزی سے لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ جیپ کی جانب بڑھا۔ ابھی میں نے بہ مشکل چند قدم ہی اٹھائے ہوں گے کہ داؤد جیپ لے کر آگے بڑھ چکا تھا۔ میں نے انہیں آواز دینا چاہی لیکن آواز جیسے میرے حلق میں ہی دب کر رہ گئی تھی۔ میں جیپ کے پیچھے دوڑا وہ چند لمحوں میں ہی مجھ سے بہت آگے دور نکل چکے تھے۔ میں کچھ آگے جا کر وہیں ٹھہر گیا اور ریوالور میرے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے جا گرا۔ میں نے اپنے ارد گرد نگاہ دوڑائی گولی کی آواز سننے کے باوجود ابھی تک وہاں کوئی نہیں پہنچا تھا۔ چار سُو پھیلی چاند کی چاندنی میں، میں نے سر گھما کر دکان کی جانب دیکھا وہاں کاؤنٹر کے دوسری جانب فرش پر ڈھیر وہ اجنبی جوان پڑا تڑپ رہا ہو گا یا مر چکا ہو گا، ایسا میں نے فقط سوچا، وہ مجھے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں سٹپٹا کر رہ گیا۔ گھٹنوں پر ہاتھ ٹکائے آگے بڑھتی شاہراہ کی جانب سر کو اٹھائے ہوئے گھٹی گھٹی آواز میں انہیں آوازیں دے رہا تھا۔

"داؤد۔۔۔ عبیرہ۔۔۔ واپس آجاؤ۔۔۔" وہ جو مجھے تنہا چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ انہیں واپس کب آنا تھا اور میں تا حال اسی دکان سے چند گز کے فاصلے پر ہی کھڑا تھا۔ اس سے پہلے کہ کوئی اس دکان تک پہنچتا مجھے اب یہاں سے بھاگنا تھا۔ پہلے جس نشے نے میرے حواس سلب کر رکھے تھے، میرے ہاتھ سے یوں گولی کے چل جانے اور داؤد اور عبیرہ کے مجھے بے یار و مددگار چھوڑ کر بھاگ جانے کے بعد گویا میرے چودہ طبق روشن ہو چکے تھے۔ میرا نشہ ٹوٹ چکا تھا۔ میں اٹھ کر وہاں سے سرپٹ بھاگنے لگا لیکن مجھے جانا کہاں تھا یہ سوچ کر کچھ آگے جا کر میں پھر سے ٹھہر گیا تھا۔ اب دکان کافی پیچھے رہ گئی تھی۔ ایسے قصبے سرِ شام ہی ویران ہو جاتے تھے۔ یہاں سے کسی قسم کی کوئی سواری نہیں مل سکتی تھی اور شہر یہاں سے میلوں دور تھا۔ گھر جانا بھی مناسب نہ تھا، یہ کون سی جگہ تھی میں نے یہ سوچ کر ارد گرد نگاہ دوڑائی پاس ہی ایک دیوار پر کسی اشتہار کے ساتھ وسن پورہ لکھا تھا۔ وسن پورہ میرے ذہن میں ایک دم سے جھماکا سا ہوا۔ مائیکل ہمارا ڈرائیور بھی تو اسی قصبے وسن پورہ کا رہائشی تھا۔ میں کئی بار اسے یہاں اس کے گھر سے لینے آیا تھا۔ یعنی آج رات میں مائیکل کے گھر گزار سکتا ہوں ایسا سوچتے ہی میں دائیں بائیں مڑ کر اس جگہ کی شناخت کرنے لگا۔ مائیکل کے گھر اس کی گلی

میں داخل ہونے سے پہلے بجلی کا ایک بڑا کھمبا آتا تھا، یہ یاد آتے ہی میں بجلی کے تاروں کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ دور الیون کے وی کے بڑے سے کھمبے کے ساتھ ایک برقی قمقمہ روشن دکھائی دے رہا تھا۔ میں تھوڑی ہی دیر میں اس برقی قمقمے کے عین نیچے جا پہنچا تھا۔ میں نے اک نظر سر اٹھا کر دیکھا اس پر ایک عبارت کندہ تھی۔ ''خورشید عالم ایم این اے'' یعنی میں ابا کے حلقہ کی حدود میں ہی تھا۔ میں نے سامنے نگاہ اٹھا کر دیکھا سامنے وہی گلی دکھائی دے رہی تھی جس میں مائیکل کا گھر تھا۔ گلی میں داخل ہونے سے پہلے میں نے ایک بار گردن گھما کر دائیں بائیں دیکھا۔ چار سُو ویرانی سی ویرانی چھائی تھی۔ کوئی بندہ بشر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ فقط چند گز کے فاصلے پر کنٹونمنٹ بورڈ کے رکھے ہوئے کچرا دان کے پاس چند کتے بھونک رہے تھے۔ میں آہستہ سے چلتا ہوا تنگ و تاریک سی گلی میں اتر گیا۔

لیکن اندر گلی میں موجود گھروں میں سے مائیکل کا گھر کون سا تھا؟ اب اس بات نے مجھے شش و پنج میں مبتلا کر رکھا تھا۔ میں فقط دو ایک بار ہی اسے چھوڑنے یا لینے آیا تھا اور ایک بار اس کے ضد کرنے پر میں اس کے گھر چائے پینے آیا تھا۔ اس وقت دن تھا اور اب رات اور میں کسی کا قتل کر کے پناہ ڈھونڈنے آیا تھا۔ گھبراہٹ میں، میں کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا، دو چار گھر چھوڑ کر ایک گھر کے دروازے کے سامنے میں رک گیا۔ گھر کھوجنے میں مجھے جس قدر دشواری پیش آ رہی تھی، اب اس سے کئی گنا کٹھن مجھے دروازے پر دستک دینا محسوس ہو رہا تھا۔ میں دروازہ کھٹکھٹانے کے لئے اپنا ہاتھ اٹھاتا اور ہاتھ مجھے یوں منوں بھاری ہوتا محسوس ہوتا اور پھر دروازے پر دستک دیئے بغیر ہی میں ہاتھ نیچے لے جاتا، اسی کشمکش میں کچھ وقت مزید گزر گیا۔ پھر ہمت جتا کر میں نے دستک دے ہی دی اور میری سوچ کے برعکس میری پہلی ہی دستک پر مجھے اندر سے کئی قسم کی ملی جلی آوازیں آتی محسوس ہوئیں۔ میں نے دوسری بار دستک نہ دی، میں وہیں کھڑا انتظار کر رہا تھا کہ مائیکل ابھی آ کر دروازہ کھولے گا، جب دروازے کی کنڈی کھلتے ہوئے مجھے اندر سے آواز سنائی دی۔ ''ذرا رکنا اجمل پتر۔۔۔ کئی بار کہا ہے اسے گریس دے دو، کتنا دشوار ہو گیا ہے اسے کھولنا۔'' کنڈی کے کھلتے ہی سامنے کھڑے بزرگ شخص نے جیسے مجھے حیرت سے دیکھا۔ میں سمجھ چکا تھا کہ میں نے غلط گھر کے دروازے پر دستک دے دی تھی۔ میں جیسے اپنی غلطی سدھارنے کے لئے جھٹ سے بولا۔ ''باباجی کیا یہ مائیکل کا گھر ہے؟''

''نہیں بیٹا، مائیکل کے گھر کا دروازہ تو یہ ساتھ والا ہے۔'' باباجی نے گھر کی دہلیز سے چند قدم آگے آتے ہوئے کہا۔

''معذرت بیٹا، میں سمجھا میرا بیٹا اجمل آیا ہے۔'' میں آگے بڑھ چکا تھا جب میرے عقب سے باباجی کی آواز مجھے سنائی دی۔ معذرت تو مجھے کرنا چاہئے تھی جو یوں رات کے اس پہر دروازے پر دستک دے کر انہیں تکلیف دی، لیکن میں اس وقت جیسی کشمکش میں مبتلا تھا میں ان باتوں کا بھلا کیا لحاظ کرتا۔ اب میں مائیکل کے گھر کے دروازے سے باہر کھڑا تھا، میں نے جھٹ سے دروازے پر دستک دی اور پھر دوسری تیسری چوتھی دستک کے بعد جو مائیکل نے دروازہ کھولا تو میں دروازہ کھلتے ہی اندر داخل ہو گیا۔ عین اسی لمحے جب

میں فوراً اندر داخل ہوا تھا وہ مجھے پہچان نہیں پایا اور گھبرا کر وہ میری طرف مڑا۔ دروازہ ابھی کھلا ہی تھا، یہ دیکھ کر میں نے پلٹ کر دروازہ خود ہی بند کر کے اسے کنڈی لگا دی۔

"چھوٹے صاحب آپ؟ اس وقت؟ اتنی رات کو؟" وہ مجھے پہچان گیا تھا اور اب حیران ہو کر اس نے مجھ پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی تھی۔ اسی دوران اندر سے اس کی بیوی کی آواز آئی۔

"کون ہے مائیکل؟" رات کے اس پہر دروازے پر ہونے والی دستک سن کر مائیکل کے بیوی بچے بھی جاگ گئے تھے۔ میں نے اک نظر اندرونی دروازے کو دیکھ کر مائیکل کو کاندھوں سے پکڑ کر اسے اپنے سے ذرا قریب کر لیا تھا۔

"مائیکل مجھ سے خون ہو گیا ہے۔"

"کیا بولا صاحب۔" مائیکل کو جیسے میری بات پر یقین ہی نہیں آیا۔ وہ میری بات سن کر اب کچھ خوف زدہ دکھائی دے رہا تھا۔

"صاحب کیسے ہوا یہ سب؟" اس سے پہلے کہ میں اسے مزید کچھ کہتا وہ کانپتا ہوا ارد گرد دیکھنے لگا اور بولا چلو صاحب اوپر چلو۔" وہ مجھے ایک طرف لگی تنگ سی سیڑھی کی طرف لے گیا۔ سیڑھی اوپر ایک کھلی چھت سے جڑی تھی اور اس سے آگے ایک کمرہ بنا ہوا تھا مائیکل مجھے بنا رکے اس کمرے میں لے گیا، اندر پہنچتے ہی اس نے کمرے کی لائٹ آن کی اندر ایک بیڈ پڑا تھا۔ مائیکل کے کہنے سے بھی پہلے میں بیڈ دیکھ کر یوں اس پر جا ڈھیر ہوا گویا میلوں کی مسافت سے ابھی لوٹا تھا۔ پھر مائیکل بھی جیسے میری ذہنی حالت کو سمجھ چکا تھا۔ میرے لیٹتے ہی وہ میری ٹانگیں دابنے لگا، لیکن اس کے ایسا کرنے سے راحت کہاں ملنے والی تھی۔ میں نے اسے منع کر دیا۔ وہ جھٹ سے اٹھا۔

"صاحب آپ کو بھوک لگی ہو گی میں ابھی کھانا تیار کرواتا ہوں۔ صاحب اب آپ ادھر محفوظ ہیں۔ مائیکل ہے ناں آپ کسی قسم کی فکر نہیں کرنا۔" وہ مجھے تسلی دے کر چلا گیا لیکن مجھے اس کے کہے چند بول بھی میری دل جوئی کے لئے بہت بڑے محسوس ہوئے۔ ہاں میں بہت برا تھا، ہر طرح ہر قسم کے گناہوں کا عادی تھا لیکن میں نے آج سے پہلے کسی انسان کا قتل نہیں کیا تھا۔ کسی کی جان نہیں لی تھی اور اب میں ایک بے گناہ معصوم انسان کو یوں موت کے گھاٹ اتار کر یہاں سکون سے بیٹھا تھا۔ یہ خیال آتے ہی میں بے تاب ہو کر اٹھ بیٹھا۔ داؤد نے جو میرے ساتھ کیا تھا وہ بھی میرے لئے کس قدر اذیت ناک تھا۔ میرے ہاتھ سے گولی چل جانے کے بعد بجائے اس کے وہ مجھے خود وہاں سے گاڑی میں اپنے ساتھ کسی محفوظ جگہ لے جاتے داؤد نے گاڑی اسٹارٹ کی اور مجھے وہیں بے یار و مددگار چھوڑ کر فرار ہو گیا۔ عبیرہ بھی تو اس کے ساتھ ہی موجود تھی۔ گولی چلتے ہی عبیرہ کے منہ سے نکلنے والی چیخ میں نے سنی تھی۔ شاید وہ میرے یوں اچانک گولی چلانے پر اور سامنے موجود آدمی کے سینے سے پھوٹتے خون کے فوارے کو دیکھ کر خوف زدہ ہو گئی تھی۔ داؤد کے گاڑی آگے بڑھاتے ہی میں ان کے تعاقب میں دوڑا تھا کہ ہو سکتا ہے داؤد آگے جا کر گاڑی روک دے یا عبیرہ، داؤد کو واپس لوٹنے کو کہے اسے کہے کہ ہمیں طٰہ کو یوں بے یار و مددگار چھوڑ کر نہیں جانا چاہیئے، اس کی مدد کو چلنا چاہیئے لیکن

ایسا نہیں تھا، اگر ایسا ہوتا تو میں وہاں کافی دیر تک کھڑا رہا تھا، جس سمت وہ جیپ لے کر گئے تھے اسی راستے پر چل کے میں مائیکل کے گھر تک آیا تھا لیکن داؤد جیپ لے کر واپس نہیں آیا تھا لیکن میرا دل یہ بات بھی ماننے کے لئے تیار نہ تھا کہ عبیرہ بھی داؤد کے ساتھ مل چکی ہو گی۔ ایسے ہی کئی طرح کے خیالات میرے ذہن میں ابھر رہے تھے جب مائیکل اندر داخل ہوا اس نے پانی کا گلاس میری جانب بڑھایا میں نے چند گھونٹ پی کر اسے ایک طرف رکھ دیا اور وہ یہ کہہ کر وہ کھانا لے کر آتا ہے پھر سے واپس چلا گیا۔

مائیکل کے جانے کے بعد اور پانی پی لینے کے باوجود مجھے کمرے میں گھٹن کا احساس ہو رہا تھا۔ بے چینی اور گھبراہٹ محسوس کرتے ہوئے میں کمرے سے نکلا کمرے کے سامنے کا کھلا حصہ، اس گھر کی چھت تھا اور کمرے کے سامنے چھوٹا سا صحن نما حصہ تھا جس میں ایک جانب چند گملے پڑے تھے۔ کمرے کی مخالف سامنے اونچی جالی دار سیمنٹ کی دیوار تھی۔ شاید اس دیوار کو بھی چھت ڈالنے کے لئے اوپر تک تعمیر کر دیا گیا تھا اور اس دیوار کے عین نصف حصے میں سیمنٹ کی بنی جالی ہوا کی آمد ورفت کے لئے لگا دی گئی تھی۔

جالی دار دیوار میں سے چاند کی چاندنی کا عکس چھت پر بھی ایک جالی کی دیوار بنا رہا تھا۔ میں آگے بڑھا اور جالی دار دیوار کے پاس ہی نیچے بیٹھا سوچنے لگا کہ وہاں اس دکان پر کوئی شخص آیا ہو گا، اسے کوئی چیز خریدنا ہو گی لیکن جب اس نے خون سے لت پت لاش پڑی دیکھی ہو گی تو فوراً پولیس کو اطلاع کر دی ہو گی یا ہو سکتا ہے وہ اس دکان والے شخص کو پہچانتا ہو اور فوراً وہ ان کے گھر تک پہنچا ہو اور پھر اس گھر کے مقیم لوگوں کو وہ منحوس خبر سنائی ہو کہ ان کا بیٹا اب نہیں رہا اور جب نئے دن کا سورج طلوع ہو گا تو سبھی نیوز چینل پر یہ پٹی چل رہی ہو گی کہ ایک سیاسی رہنما کے بیٹے نے ایک جواں سالہ شخص کو موت کے گھاٹ اتار دیا، یوں ابا کا سیاسی کیریئر میری وجہ سے داغ دار ہو جائے گا اور پھر صرف پولیس ہی نہیں بلکہ میرے ابا بھی میری تلاش شروع کر دیں گے۔ وہ جو اپنے ہر عیب اور جرم پر یوں پردہ ڈال لیتے تھے کہ دنیا کو کانوں کان خبر نہ ہوتی تھی، وہ میرے سرِعام قتل پر مجھے کبھی معاف کرنے والے نہ تھے۔

لیکن مجھے تو وہاں گولی چلاتے کسی نے نہیں دیکھا تھا اور یہ طے تھا کہ داؤد، عبیرہ یا میرے دوستوں میں سے کوئی بھی اس حادثے کے بارے میں کہیں کچھ بتانے والا نہ تھا پھر پولیس کو مجھ تک پہنچنے کے لئے کوئی ثبوت بھی تو درکار ہو گا۔ یہ خیال ذہن میں آتے ہی میں اگلے ہی پل ایک دم سے اچھل پڑا اور کھڑے ہو کر اپنی پینٹ کی ساری جیبیں کھنگالنے لگا لیکن ریوالور جہاں گرا تھا، میں اسے وہاں سے اٹھانا بھول گیا تھا اور اب بے بسی اور حیرت کی تصویر بنا میں پھر سے پاؤں پسار کر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا تھا۔ میں نے اپنے جسم کو جیسے بے جان سا ڈھیلا چھوڑ دیا جب عین اسی وقت میرے کانوں سے ایک نسوانی آواز ٹکرائی۔

"امی! آج اجمل بھائی کہاں رہ گئے، اتنی دیر تو انہیں کبھی نہیں ہوئی۔" یہ بات سن کر میں نے بیٹھے بیٹھے سر کو گھما کر دیکھا، سیمنٹ کی جالی دار دیوار سے بالکل نیچے ساتھ والے گھر کا آنگن چاندنی کی مدھم روشنی میں دھندلا سا دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے مائیکل کے گھر آنے سے پہلے غلطی سے اسی گھر کے دروازے پر دستک دی تھی اور اس وقت بھی ایک کمزور بوڑھے باباجی مجھے اجمل سمجھ رہے تھے پھر میری نظریں ابھی اس صحن سے ہٹی ہی تھیں کہ مجھے زور زور سے اسی جانب دروازہ پیٹنے کی آواز سنائی دینے لگی۔ کوئی زور زور سے

ان کا دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ میں نے اسی جانب پھر دیکھتے ہوئے سوچا کہ لگتا ہے، اب اجمل ہی ہو گا جس کا اس گھر بھر کو انتظار رہے۔
میں نے دیکھا وہی کمزور سا بوڑھا شخص دروازے کی جانب بڑھا پھر کوئی لڑکی پیچھے سے دوڑی آئی۔
"ابا آپ دروازہ کھولنے میں بہت دیر کر دیتے ہیں، بھیا ہو گا میں کھولتی ہوں۔" لڑکی کی بات سن کر بوڑھا شخص وہیں صحن کے وسط میں رک گیا۔ لڑکی دروازے کی جانب بڑھی، وہ کچھ بڑبڑا رہی تھی۔
"ایک تو اتنی دیر کر دی آنے میں اوپر سے ذرا صبر نہیں ہو رہا، اچھا بھئی صبر کھولتی ہوں۔" لڑکی نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔
دروازہ کھلتے ہی وہ اپنے سر پر آنچل سنبھالتی پیچھے ہٹ گئی۔
"کوئی سیانا گھر پر ہو تو بیٹی اسے بلاؤ۔" کوئی ادھیڑ عمر آدمی تھا، صحن میں کھڑے بوڑھے شخص نے باہر کھڑے شخص کی آواز سن لی تھی۔ وہ دھیرے دھیرے چلتا آگے بڑھا، باہر کھڑا شخص انہیں آگے بڑھتا دیکھ کر چند قدم آگے چلا آیا۔
"چاچا آپ ہی اجمل کے ابا ہیں۔۔۔ چاچا۔۔۔ حوصلہ رکھنا بڑی بری خبر ہے۔ چاچا تیرا اجمل۔۔۔" وہ جیسے کہتے کہتے رک گیا۔ فاصلہ کچھ اتنا کم تھا کہ ان کے درمیان ہو رہی ساری باتیں مجھے واضح سنائی دے رہی تھیں۔ چاچا حوصلہ رکھنا بڑی بری خبر ہے، باہر کھڑے شخص کے یہ الفاظ سن کر جیسے میرے نیچے اوپر کا سانس وہی رک گیا تھا۔ پھر باہر کھڑے شخص نے اپنی بات مکمل کی۔ "چاچا تیرا اجمل قتل ہو گیا ہے۔" پاس کھڑی لڑکی نے یہ بات سنتے ہی اس زور کی چیخ لگائی کہ میرا دل دہل گیا۔
"اجمل پتر۔۔۔" اجمل کے ابا جو یہ خبر سن کر اک لمحے کو ساکت کھڑے رہ گئے تھے انہوں نے دلخراش آواز سے اپنے اجمل کو پکارا، ایک لمحے کے کچھ حصے میں اسی آنگن میں جہاں جیتے جاگتے اجمل کا انتظار ہو رہا تھا۔ کہرام مچ گیا، اندرونی کمروں سے چند اور خواتین صحن میں آ گئیں۔
"اماں۔۔۔"
"کیا ہوا میرے اجمل پتر کو۔۔۔؟"
"اماں بھائی۔۔۔" کسی پر غشی کا دورہ پڑا، صحن کے وسط میں ماں بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ بوڑھا باپ اور ایک لڑکی اس شخص کے ساتھ باہر کو دوڑے، گلی میں جہاں سے وہ گزر کر جا رہے تھے ان کے رونے اور چیخنے کی آوازیں دور سے بھی آتی سنائی دے رہی تھیں پھر مجھے کسی کے تیز تیز قدموں سے سیڑھی چڑھنے کی آواز سنائی دی۔ میں جھٹ سے ذرا ایک طرف دیوار کے ساتھ چمٹ گیا۔
"مائیکل چاچا۔۔۔ جلدی آئیں، مائیکل چاچا۔۔۔ اجمل بھائی۔۔۔" ایک لڑکی ساتھ والے صحن سے سیڑھیاں چڑھ کر جالیوں والی دیوار سے لگی زور زور سے مائیکل کو پکار رہی تھی۔ شاید مائیکل نے گلی میں رونے چیخنے کی آوازیں سن لی تھی اسی لئے وہ چھت پر نہیں

آیا وہ دروازہ کھول کر اجمل کے ابا کے ساتھ ہی چلا گیا تھا۔ وہ لڑکی چند ایک لمحے ہی وہاں کھڑی روتی مائیکل کو پکارتی رہی اور پھر مائیکل کے نہ آنے پر وہ الٹے پیروں نیچے کو دوڑی۔

"اماں۔۔۔، اماں ہوش کر۔۔۔"

" میرا پتر اجمل نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا، میرا اجمل نہیں۔"

"اماں۔۔۔ بھائی۔۔۔ میرے بھائی کو کچھ نہیں ہوا۔۔۔ اماں۔۔۔ اجمل کو کچھ نہیں ہوا ابا بھائی کو لینے گئے ہیں، دیکھنا۔۔۔ اماں وہ ابھی بھائی کو لے کر آ جائیں گے۔"

یارب یہ اجمل کا ہی گھر تھا۔ میں سر تھامے قدرے جھک گیا۔ رات کی تاریکی میں گونجنے والی دردناک آوازیں میری قوتِ برداشت سے باہر تھیں۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اجمل کے گھر کا چھوٹا سا آنگن لوگوں سے بھر گیا۔ اب تو گھر والوں کے ساتھ ساتھ محلے دار عورتوں کے رونے کی بلند آوازیں بھی آ شامل ہوئی تھیں۔

رات کے سناٹے میں یہ دردناک آوازیں اجمل کی بہنوں اور ماں کی بین کرتی آوازیں مجھ سے برداشت نہیں ہو رہی تھیں۔ میں دیوار کے ساتھ لگا یوں چپکا بیٹھا تھا کہ اب وہاں سے اٹھنے کی بھی سکت مجھ میں نہیں تھی۔ مجھے لگا اگر میں ذرا سا بھی ہلا تو سبھی جان جائیں گے کہ اجمل کا قاتل بھی یہیں اس طرف چھت پر ایک کونے میں دبکا بیٹھا ہے۔ میری حالت ایسی ہو رہی تھی جیسے میں کوئی پتھر کا مجسمہ بن چکا تھا۔ جس میں فقط سننے اور دیکھنے کی صلاحیت موجود تھی۔ گلی میں پھر سے شور بلند ہوا، گھر کے صحن سے خواتین باہر کو دوڑیں، چیخ و پکار آہ و بکا نے جیسے زمین و آسمان ہلا ڈالے تھے۔ میں نے اپنے منوں بھاری جھکے ہوئے سر کو بہ مشکل اٹھایا، تھوڑا بائیں طرف موڑا سامنے صحن میں ذرا کھڑے ہونے تک کی جگہ نہ تھی۔ صحن لوگوں سے بھرا پڑا تھا۔ اب کھلے دروازے سے چارپائی اندر لائی جا رہی تھی۔ سبھی غش کھا کھا کر یوں گر رہے تھے کہ چارپائی کو نیچے رکھنے میں بھی کچھ وقت لگا۔ اب کچھ سمجھ نہیں آتی تھی کہ کون اپنا رو رہا ہے، اپنے پرائے سبھی دھاڑیں مارے اجمل کی چارپائی کے پاس کھڑے رو رہے تھے۔

"اس معصوم نے کسی کا کیا بگاڑا تھا۔" کسی نے یوں درد بھری آواز سے کہا کہ مجھے اپنا کلیجہ چھلنی ہوتا محسوس ہوا۔

"میرے اجمل سے کسی کو کیا دشمنی ہو سکتی تھی، بس ایک بار مل جائے پتہ تو چل ہی جائے گا میرے پتر کے سینے پر گولی چلانے والے کے سینے پر میں اپنے ہاتھوں سے گولیاں برساؤں گا اجمل۔۔۔ اجمل پتر" اجمل کے ابا غش کھا کر بے ہوش ہو گئے اور پھر جب کسی نے ان کے منہ میں پانی ڈالا اور انہیں پھر ہوش آیا تو وہ جیسے بے قابو ہو کر چلانے لگے۔

"میرے اجمل پتر، کو کچھ نہیں ہوا ہٹ جاؤ سب ہٹ جاؤ یہاں سے اجمل کی ماں تُو کیوں روتی ہے کچھ نہیں ہوا تیرے اجمل کو، ثمرہ پتر، نمرہ، زاہدہ، عابدہ تم کیوں روتی ہو، تمہارے بھائی کو کچھ نہیں ہوا یہ تو سو رہا ہے۔ دن بھر آج کام کرتا رہا ہے ناں اسی لئے سو رہا

ہے۔ آرام کرنے دو، اسے سب چپ ہو جاؤ۔۔۔ میرے پتر اجمل کی شادی میں اب چند ہی دن تو باقی ہیں۔ پھر میرا اجمل دلہا بنے گا یوں شان سے نکلے گی اس آنگن سے اس کی بارات میں سارے ارمان پورے کروں گا۔"

"ابا۔۔۔ ماں ابا کو روکو۔۔۔ ابا بس کرو، بھائی اب نہیں ہے۔" یہ سن کر اجمل کے ابا پر پھر غش پڑا اور وہ بے ہوش ہو گئے۔ اس پتھر کے مجسمے کی آنکھوں سے کیوں آنسو جاری ہو گئے تھے کیا پتھر کے مجسمے بھی روتے ہیں؟ کیا وہ قاتل بھی روتے ہیں؟ جو بے دردی سے کسی کو قتل کر دیتے ہیں۔ میری آنکھیں یوں برس پڑی تھیں۔

"ہاں میں سارے ارمان پورے کروں گا۔" اجمل کے ابا ہوش میں آتے ہی وہی آخری جملہ زبان سے دہرا رہے تھے۔

"یارب یہ مجھ سے کیا ہو گیا؟" اجمل کے ابا کے ارمان اب کیسے پورے ہو سکتے تھے۔ ان کی اس بات نے وہاں موجود سبھی لوگوں کو رلا دیا اور اب چند مرد حضرات بھی دھاڑیں مارے رو رہے تھے۔

یارب یہ مجھ سے کیا خطا ہو گئی۔ گھر کا واحد کمانے والا، ماں باپ کا اکلوتا چراغ، چار بہنوں کا واحد بھائی میرے ہاتھوں سے قتل ہو گیا۔ ۔۔ یارب اس گھڑی ان لمحوں میں مجھے کچھ ہو جاتا یا پھر میرے پاس ریوالور ہی نہ ہوتا اگر تھا تو اس میں، میں گولیاں ہی رکھنا بھول جاتا۔ میں آج داؤد اور عبیرہ کے ساتھ فارم ہاؤس ہی نہ گیا ہوتا اور اگر واپسی پر مجھے اجمل کی دکان کے باہر رکنا ہی پڑا تھا تو میں خود دکان پر جانے کی بجائے کسی دوست کو بھیج دیتا۔ کاش ایسا ہوتا تو آج اس آنگن میں صفِ ماتم نہ بچھی ہوتی۔ اجمل کے ابا کے سارے ارمان پورے ہوتے، بہنیں اپنے بھائی کا سہرا سجاتیں اور ماں خوشی سے واری جاتی۔ یارب یہ مجھ سے کیا خطا ہو گئی۔ سر جھکائے تر آنکھوں سے میں یہی سوچ رہا تھا۔ جب مجھے احساس ہی نہ ہوا کب مائیکل میرے پاس آیا اور میرے قریب فرش پر ہی بیٹھا تھا۔ جب مجھے یہ احساس ہوا اور میں نے مائیکل کی جانب دیکھا تو وہ اب مجھے پہلے جیسا نہ لگا جو ابھی چند لمحے پہلے مجھے کہہ کر گیا تھا کہ صاحب آپ کو بھوک لگی ہو گی میں ابھی کھانا لے کر آتا ہوں۔

"یہ کیا کر دیا صاحب آپ نے؟" مائیکل فقط اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا اور میں نے جیسے بے تاب ہو کر مائیکل کے ہاتھ تھام لئے۔ میں نہیں جانتا مائیکل یہ سب کیسے ہو گیا؟ میں نشے میں تھا اور بس پھر۔۔۔" میں جیسے کہتے کہتے رک گیا۔ جب مائیکل بیچ میں ہی بول پڑا۔

"بس کریں صاحب جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا جن کا باغ اجڑنا تھا وہ اب اجڑ گیا۔ مائیکل نے آپ کا نمک کھایا ہے صاحب۔۔۔ آپ یہاں خود کو محفوظ سمجھیں، جب گلی میں، میں نے شور اور رونے کی آوازیں سنیں تو گلی میں پہنچتے ہی میں سب سمجھ گیا تھا۔ اسی لئے میں نے اپنی بیوی کو آگاہ کر دیا تھا کہ وہ گھر کا دروازہ بند ہی رکھے، اب یہاں کوئی نہیں آئے گا صاحب آپ بے فکر ہو جائیں۔" اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا اور میں بھی سر جھکائے نیچے فرش کو گھورتا رہا، جبکہ ہمارے عقب سے لگاتار رونے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں اور

کبھی یہ دلخراش آوازیں اتنی بلند ہونے لگتیں کہ میرا جی چاہتا میں یہاں اس جگہ سے کہیں بہت دور چلا جاؤں۔مائیکل کچھ دیر خاموش رہ کر پھر بولا۔

صاحب آپ کو بھوک لگی ہوگی، آپ کمرے میں چل کر بیٹھیں میں آپ کے لئے کھانا لے کر آتا ہوں۔

"مجھے کھانا نہیں کھانا مائیکل، مجھے یہیں بیٹھے رہنے دو۔" مائیکل کی بات سن کر میں نے آزردہ ہو کر جواب دیا۔مائیکل میری بات سن کر تھوڑی دیر چپ چاپ میرے پاس بیٹھا اور پھر اٹھ کر چلا گیا۔

مائیکل کے اٹھ کر چلے جانے کے بعد میں نے اپنی آنکھیں موند لیں اور سر کو پچھلی جانب دیوار سے ٹکا دیا۔میرے عقب سے ابھی تک درد بھری آوازیں مسلسل آرہی تھیں۔ کبھی اجمل کے ابا اپنے جواں سالہ بیٹے کی میت کے پاس کھڑے یوں اپنا درد بیان کرتے کے رونے کی آوازیں شدید سے شدید تر ہوتی چلی جاتیں۔

پھر آنکھیں بند کئے دیوار سے ٹیک لگائے میں دعائیں کرنے لگا۔یارب یہ سب کبھی حقیقت نہ ہو، ابھی جب میں اپنی بند آنکھیں کھولوں تو اس خواب کی حقیقت سے کوسوں دور کھڑا ہوں یہ درد بھرا اذیت ناک خواب میرے لئے میرے کرتوتوں کا فقط ایک استخارہ ہو میں جاگنے پر اس خواب کو سوچوں تو کانپ اٹھوں اور کبھی پھر شراب کے پاس نہ جاؤں، کبھی یوں کسی بے گناہ معصوم انسان پر گولی نہ چلاؤں، یارب یہ خوفناک لمحے، یہ گھڑیاں حقیقت نہ ہوں۔دفعتاً میرے عقب سے رونے کی آوازیوں بلند ہوئیں کہ جیسے زمین و آسمان ہل کے رہ گئے، شاید اجمل کے کسی رشتہ دار کو جو اطلاع ہوئی تو وہ ابھی پہنچے تھے پھر رات کے باقی حصے میں یہ سلسلہ جاری رہا، جیسے ہی کوئی اجمل کا رشتہ دار اجمل کے گھر کی گلی میں داخل ہوتا وہیں سے رونے چلانے کی بلند آوازیں سنائی دینے لگتیں۔گھر پڑی میت کے پاس اہل وعیال کی رو رو کر آواز بیٹھ چکی تھی تو اب جب وہ کسی کی آمد پر پھٹ پڑتے تو رونے کی یہ دلخراش آوازیں اور بھی دردناک ہو جاتیں۔ کہیں مؤذن نے فجر کی اذان شروع کی، سبھی مرد حضرات عورتوں کو چپ ہونے کی تلقین کرنے لگے اور وہ جیسے اپنے آنچل کو منہ میں دباتے ہوئے اپنے آپ کو قابو میں رکھنے کی کوشش کرنے لگیں۔مؤذن نے اذان ختم کی اور پھر ساتھ ہی مسجد سے اجمل کی نماز جنازہ کا اعلان ہونے لگا پھر میں نے دیکھا چند لوگ غسل کے لئے اجمل کی چارپائی کو اٹھا کر لے جارہے تھے۔بڑی مشکل سے لوگوں نے اجمل کے اماں، ابا اور بہنوں کو سنبھالا اور وہ جیسے اپنے بازو آگے پھیلائے اپنے بھائی کو روکنا چاہتی تھیں۔

مائیکل پھر سے جو میرے پاس آیا تو جیسے مجھے اسی کا انتظار تھا۔اس کے قریب بیٹھتے ہی میں نے اس سے دریافت کیا کہ پولیس کو قاتل کا کوئی سراغ ملا یا کسی ٹی وی چینل پر کوئی خبر چل رہی ہے۔اس نے مجھے بتایا کہ ایسی صورتِ حال میں ٹی وی، آن کرنے کا کسے ہوش ہے اور جہاں تک پولیس کو سراغ ملنے کی بات ہے، تو ابھی تک مقدمہ ہی درج نہیں ہوا لیکن ہاں پولیس پہنچ چکی ہے۔وہ دکان کا بھی جائزہ لے کر اب اجمل کے گھر سے باہر ہی موجود ہیں۔پولیس پوسٹ مارٹم کرنے کا کہہ رہی ہے لیکن جہاں تک میں اجمل کے ابا کو

جانتا ہوں وہ پوسٹ مارٹم کے لئے نہیں مانیں گے۔ مائیکل کچھ وقت کے لئے میرے پاس بیٹھا رہا اور پھر جب اجمل کی میت کو غسل دے کر اسے واپس گھر لایا گیا تو مائیکل میرے پاس سے اٹھ کر پھر چلا گیا۔

نئے دن کا سورج طلوع ہو رہا تھا۔ میں نے تو سوچا تھا اس دن کے طلوع ہوتے ہی چار سُو یہ خبر پھیل چکی ہو گی کہ اجمل کا قاتل مل گیا ہے۔ شہر کے مشہور سیاسی کارکن خورشید عالم کا بیٹا طٰہ عالم ہی اجمل کا قاتل ہے۔ نیوز چینل والے اس خبر کو بریکنگ نیوز بنا کر پیش کر رہے ہوں گے۔ ایک کہرام میرے گھر بھی بپا ہو چکا ہو گا۔

لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ ابھی تک تو تھانے میں اجمل کے قتل کا کیس بھی درج نہ ہوا تھا اور جو پولیس تفتیش کرنے پہنچی تھی جیسے انہیں بھی اجمل جیسے ایک چھوٹے سے عام سے دکان دار کے قتل میں کوئی دلچسپی نہ تھی اور جب پولیس کا رویہ اتنا سرد تھا تو اخباری نمائندے اور میڈیا والے تو ایسے عام لوگوں کے قتل کی خبر کسی اندرونی صفحے کے آخری کونے میں چند سطروں میں شائع کرتے ہیں۔

لیکن اگر مقدمہ درج ہو بھی چکا ہوتا، پولیس کی تفتیشی ٹیم کے ہاتھ میرا گرا ہوا ریوالور لگ بھی چکا ہوتا اور پھر پولیس جان جاتی کہ اجمل کا قاتل کون ہے؟ یوں اگر میڈیا پر بریکنگ نیوز کے طور پر یہ خبر بھی چل رہی ہوتی کہ مشہور سیاسی کارکن خورشید عالم کا بیٹا ہی اجمل کا قاتل ہے اور پھر میں گرفتار بھی ہو چکا ہوتا تو کیا اجمل کو انصاف مل جاتا؟ میرا ذہن اس اٹھتے سوال کا جواب نفی میں دے رہا تھا۔ میری آنکھوں دیکھے ایسے سینکڑوں واقعات تھے۔ ہمارے ارد گرد ہم جیسے سیاسی رہنماؤں کی بگڑی اولادوں سے کئی قتل ہو جاتے اور پہلے پہل یونہی بریکنگ نیوز کے طور پر خبریں چلتیں میڈیا پر ٹاک شوز چلائے جاتے اور کچھ وقت کے گزرتے ہی بات ماضی کا قصہ ہی ثابت ہوتی، کبھی دیت کے نام پر تو کبھی اثر و رسوخ سے ہم جیسوں کے بڑے بڑے گناہوں پر پردے ڈال دیئے جاتے۔

لیکن اب ایسا نہیں ہو گا، اب کوئی اجمل کے قاتل کو پھانسی کے پھندے سے نہیں بچا پائے گا، اب خورشید عالم کا اثر و رسوخ اجمل کے ماں باپ بہنوں کو ہراساں کر کے مجھے معافی نہیں دلا سکتا، میں ایسا اپنے آپ سے عہد لے رہا تھا۔

میں نے اجمل کے گھر کے آنگن کی طرف دیکھا، اب دن خاصا نکل آیا تھا۔ اجمل کی میت کے گرد بہت سے لوگ ہاتھوں میں سپارے اٹھائے قرآن کی تلاوت کر رہے تھے۔ غسل کے بعد اجمل کو سفید کفن دے کر گلاب کے ہار پہنا کر لایا گیا تھا لیکن چہرہ دیکھنے والوں کی اس قدر بھیڑ تھی کہ یہاں اوپر چھت سے بھی اجمل کا چہرہ میں واضح نہیں دیکھ پا رہا تھا۔ پھر ایک جھلک مجھے مل ہی گئی کس قدر نور تھا اس کے چہرے پر سیاہ داڑھی میں دمکتا سپید چہرہ گلابوں کے ہار پہن کر وہ کیسی پُر سکون نیند سو رہا تھا۔ اجمل کے پُر نور چہرے کو دیکھ کر نہ جانے کیسے میرے دل میں ایک خواہش جاگی کہ مجھے اجمل کی نماز جنازہ میں شرکت کرنے کے لئے جانا چاہئے۔

کیسی غیر معقول سی خواہش نے میرے دل میں جنم لیا تھا۔ میں جو اس کا قاتل تھا۔ تو اب اس کی مغفرت کے لئے اس کی نماز جنازہ میں بھی شرکت کا خواہش مند تھا۔ میں جانتا تھا کہ میرے لئے ایسا کرنا، سوچنے جتنا آسان نہیں تھا۔ میں جو کب سے ایک ہی جگہ بے

حس و حرکت پڑا تھا، جیسے میں اپنی جگہ سے ذرا سا بھی ہلا جلا تو مجھے کوئی دیکھ لے گا، کوئی مجھے پہچان جائے گا، کہ یہی اجمل کا قاتل ہے اور یہ اس وقت اجمل کے گھر سے ملحقہ چھت پر چھپا دبکا بیٹھا ہے۔ ایسے میں میرا اجمل کے جنازے کے ساتھ چلنا آسان نہ تھا، پھر اپنے دل اور ارادے کو میں نے یوں مضبوط کرنے کی کوشش کی کہ میں اجمل کی نماز جنازہ ادا کرنے کے بعد وہیں سے سیدھا تھانے جا کر اقبال جرم کر لوں گا۔ خود کو پولیس کے حوالے کر دوں گا، پھر قانون چاہے تو مجھے پھانسی لگا دے اور میری خواہش یہ ہوتی کہ عمر قید میں ہر ہر لمحہ احساس جرم کی اذیت سہنے کی بجائے قانون مجھے اجمل کے قتل کے جرم میں سزائے موت ہی سنائے۔

جنازہ اٹھانے کا وقت ہو رہا تھا، لیکن مائیکل نہ جانے کہاں تھا۔ اس کی مدد کے بغیر میں یہاں سے کیسے جا سکتا تھا۔ میں نے ذرا سر کو گھما کر اجمل کے گھر کے آنگن کا جائزہ لیا سبھی تلاوت کے بعد ہاتھ اٹھائے میت کے لئے دعا کر رہے تھے۔ جیسے ہی سبھی نے دعا کے بعد ہاتھ چہرے کی طرف پھیرے، رونے اور چیخنے کی آوازیں شدید ہو گئیں۔ پھر اجمل کے ابا سب کو چپ کرانے لگے، رات بھر رونے سے ان کا گلا بیٹھ چکا تھا۔

"چپ ہو جاؤ سب۔۔۔ خاموش ہو جاؤ۔۔۔ یہ کوئی رونے کا وقت ہے۔ میرے اجمل کی بارات باہر تیار کھڑی ہے۔ اسے دولہے کی طرح سجاؤ اس کی آج بارات نکلے گی، اس آنگن سے۔ میرے پتر کے کوئی ارمان آج ادھورے نہ رہیں۔"

"اجمل۔۔۔ نہیں اجمل۔" اجمل کے ابا کی بات سن کر وہاں سبھی لوگ یوں تڑپ کر رونے لگے، یہ دیکھ کر وہ پھر سب کو چپ کرانے لگے۔

"میں نے کہا ناں کہ کوئی نہ روئے پھر کیوں روتے ہو سب جاؤ پتر اجمل کا سہرا لاؤ۔" وہ روتی ہوئی اپنی بیٹیوں سے کہہ رہے تھے۔
اجمل کی شادی کی ساری تیاریاں مکمل تھیں فقط دس بارہ دن بعد ہی اس آنگن سے اس کی یوم دھوم دھام سے بارات نکلنا تھی۔ پھر یہ دیکھ کر میرا کلیجہ منہ کو آنے لگا، جب اجمل کی ایک بہن نے اندر سے سہرا لا کر اجمل کے سینے پر رکھ دیا۔ یہ منظر دیکھ کر اجمل کے ابا خود ہی اپنے آپ پر قابو نہ رکھ پائے تھے۔ اب جنازہ اٹھانے کی تیاری ہو رہی تھی اور مائیکل ابھی تک نہیں آیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ آ جائے تو میں اسے کہوں کہ مجھے بھی اجمل کی نماز جنازہ میں شرکت کرنی ہے پھر جیسے یہ سوچ کر مجھے مایوسی ہونے لگی کہ اگر مائیکل بھی جنازے کے ساتھ چلا گیا تو میری یہ خواہش ادھوری ہی رہ جائے گی، ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا جب مائیکل تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا ہوا میری جانب بڑھا۔ "صاحب جنازہ بالکل تیار ہے، میں بس یہی کہنے آیا تھا۔"

مائیکل کی بات ختم ہوتے ہی میں جھٹ سے بولا۔ "مائیکل مجھے اجمل کے جنازہ میں شرکت کرنا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے۔" پہلے تو وہ میری بات سن کر چونکا اور پھر کچھ سوچنے لگا اور بولا۔

"صاحب آپ کو یہاں کوئی نہیں پہچانتا اور ابھی تک کسی کو کچھ علم نہیں کہ اجمل کا قاتل کون ہے، پھر۔۔۔؟" مائیکل کی بات کو بیچ میں ہی کاٹتے ہوئے جیسے میں نے مکمل کیا۔

"ہاں مائیکل پھر یہ ممکن ہے، کیسے بھی ہو مجھے اجمل کے نماز جنازہ میں ضرور شامل ہونا ہے۔

"اچھا ٹھیک ہے، صاحب میں ابھی آتا ہوں۔" مائیکل یہ کہہ کر پھر سے واپس چلا گیا اور جب وہ لوٹا تو اس کے ہاتھ میں وہ رومال تھا جو اکثر حجاج کرام واپسی پر اوڑھے ہوئے ہوتے ہیں۔ "صاحب یہ رومال آپ سر پر اوڑھ لیں اور جب جنازہ گھر سے اٹھایا جائے اور گلی سے کچھ آگے نکل جائے آپ میرے گھر کے دروازے سے نکل کر پیچھے پیچھے چلے آنا۔" اس نے میرے قریب آتے ہی رومال میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ میں نے جھٹ سے رومال مائیکل کے ہاتھ سے لیا اور اسے سر پر یوں اوڑھا کہ اس کے دونوں سروں نے میرے کچھ چہرے کو بھی چھپا لیا تھا۔

اب جو جواں سالہ اجمل کا جنازہ ساتھ والے گھر کے آنگن سے اٹھا تو جیسے ایک قیامت بپا ہو گئی۔ مائیکل مجھے چھوڑ کر نیچے کی جانب دوڑا وہ آخری رسومات میں اہلِ خانہ کے ساتھ رہنا چاہتا تھا۔ وہ اجمل کا قریبی ہمسایہ تھا۔ جنازہ اب گلی میں سے گزر رہا تھا۔ میں نے منوں بھاری ہوتے وجود کے ساتھ مائیکل کے گھر کی نیچے آنگن میں اترتی سیڑھی پر قدم رکھا۔ نیچے آنگن سنسان ویران پڑا تھا اور پھر میں جلدی سے سیڑھیاں اتر کر نیچے اسی دروازے تک پہنچ گیا جہاں سے مجھے گلی میں اترنا تھا اور اجمل کے جنازہ میں شرکت کے لئے جانا تھا۔

وہ لوگ اجمل کا جنازہ اٹھائے اب گلی میں سے گزرتے ہوئے آگے نکل چکے تھے اور میں جو مائیکل کے گھر کے دروازے کے اس جانب کھڑا تھا یہ ہمت ہی نہیں کر پا رہا تھا کہ میں دروازہ کھولوں اور گلی میں قدم رکھ دوں۔ آوازوں سے اب یونہی محسوس ہو رہا تھا کہ گلی میں فقط باقی رہ جانے والی عورتیں ہی کھڑی تھیں جو کہ اجمل کے اہل و عیال کو سنبھالتی انہیں واپس گھر لے جانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اب مجھے ذرا دیر نہیں کرنی چاہئے میں نے جیسے اپنے ارادے کو مضبوط کرنے کے لئے سوچا اور دروازہ کھول کر میں سر جھکائے گلی میں اتر گیا۔

"یا اللہ تباہ و برباد کر دے اسے یا اللہ میرے اجمل کو مارنے والے کو گھڑی گھڑی موت دے، اس کا بھی سکون چھین لے۔" گلی میں اب بہت سی عورتوں کے درمیان اجمل کے گھر کی خواتین کھڑی مجھے ہی بد دعائیں دے رہی تھیں جب میں ان کے پاس سے گزر رہا تھا۔ وہ بے خبر تھیں کہ وہ جس کے لئے بد دعائیں کر رہی تھیں وہ اس وقت انہی کے بیچ میں سے گزر کر جا رہا ہے۔ میں تیز تیز قدم بڑھا کر وہاں سے آگے نکل گیا۔

گلی میں سے نکلتے ہی میں نے سر اٹھا کر دیکھا جنازہ اب کافی آگے نکل چکا تھا۔ مائیکل کے گھر کھڑے مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ باہر لوگوں کی بہت بڑی تعداد موجود ہو گی لیکن جنازہ میں میری سوچ کے برعکس کوئی بہت زیادہ لوگ نہ تھے۔ جنازہ گاہ پہنچ کر میت کو سامنے رکھ دیا گیا اور لوگ قطار در قطار صفیں بنانے لگے۔ میں بھی ایک جگہ صف میں کھڑا ہو گیا۔ جب تمام صفیں مکمل ہو گئیں تو جنازہ پڑھانے کے لئے وہاں موجود قاری صاحب لوگوں سے مخاطب تھے۔

"السلام علیکم بھائیو سب نے باری باری یہاں سے چلے جانا ہے، آج ہم کسی کی نماز جنازہ میں کھڑے ہیں، تو کل ہماری نماز جنازہ پڑھائی جارہی ہوگی۔ بات تو فقط سمجھنے کی ہے۔ یہ دنیا فانی ہے۔ آج ہم یہاں جو بوئیں گے کل وہی وہاں کاٹیں گے، جو یہاں کسی کی حق تلفی کرے گا کل اسے وہاں جواب دہ ہونا پڑے گا۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ جو اس دنیا سے چلا گیا اس کے ذمے اگر کسی کے واجبات ہوں تو اسے معاف کردیں پھر بھی یہاں میت کے اہل وعیال موجود ہیں، کسی نے جانے والے سے کچھ لینا ہو تو وہ جنازہ کے بعد میت کے اہل وعیال سے مل سکتا ہے۔۔۔" قاری صاحب ابھی اپنی بات جاری رکھے ہوئے تھے اور میں کھڑا سوچ رہا تھا کہ اجمل کے ذمے لوگوں کا کوئی قرض ہو یا نہ ہو لیکن میرے ذمے اجمل کا جو قرض تھا وہ تو میں اپنی جان دے کر بھی نہ چکا سکتا تھا۔ میں اجمل کے ابا کو ان کا بیٹا نہیں لوٹا سکتا تھا۔ میں اس کی چار بہنوں کو ان کا لاڈلا بھائی کہاں سے لا کر دیتا۔ اس کی ماں جس پر ابھی تک غشی کے دورے طاری ہوں گے اسے اس کا لال کہاں سے لوٹاتا۔ وہیں جنازہ گاہ میں، میں منوں مٹی تلے جیسے درگور ہو رہا تھا۔ جنازہ اجمل کا نہیں گویا میرا پڑھایا جارہا تھا۔ پھر جنازہ مکمل ہوا لوگ اجمل کے آخری دیدار کے لئے آگے بڑھے لیکن مجھ میں ہمت نہ تھی کہ میں اجمل کی میت تک پہنچتا، میں کچھ دیر اپنی جگہ پر ہی کھڑا رہا اور پھر جنازہ گاہ سے باہر آ گیا۔

جنازہ گاہ قصبے کی سڑک کے ساتھ ہی واقع تھی۔ باہر نکلتے ہی مجھے جنازہ گاہ کے دروازے کے سامنے کئی رکشے کھڑے دکھائی دیئے۔ میں نے آگے بڑھ کر ایک رکشے میں بیٹھتے ہوئے اسے تھانے چلنے کو کہا۔ رکشے میں موجود نوجوان لڑکے نے مجھے ایک بار مڑ کر چونک کر دیکھا اور پھر رکشہ آگے بڑھا دیا۔

"سنا ہے بھائی قتل ہونے والے اس آدمی کے قاتل کا کوئی پتہ نہیں چل سکا۔" میں جو سر جھکائے چپ چاپ بیٹھا تھا۔ سوچ رہا تھا، تھانے جا کر اقبالِ جرم کے بعد میرے اپنے خاندان پر کیا گزرے گی اب رکشہ ڈرائیور کی بات سن کر ایک دم سے چونک پڑا۔ میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا پھر وہ خود ہی بولتا رہا۔

"بھائی وہ بچ نہیں سکتا، قتل کوئی معمولی شے تو نہیں ہوتی۔ سنا ہے، قتل ہونے والے کی تو کوئی دشمنی بھی نہ تھی۔ بے چارہ بے گناہ ہی مارا گیا لیکن بھائی کچھ کہہ نہیں سکتے یہ پاکستان ہے، یہاں ایک ہی دن میں نہ جانے کتنے ہی لوگوں کو قتل کردیا جاتا ہے۔ پر انصاف کس کو ملتا ہے، یہاں۔" وہ یونہی بولتا رہا اور میں چپ چاپ اس کی باتیں سنتا رہا، تھانہ زیادہ دور نہ تھا کچھ ہی دیر بعد اس لڑکے نے تھانے کے گیٹ کے سامنے رکشہ روک دیا۔

"بھائی آپ مرنے والے کے کوئی رشتہ دار ہیں، مجھے بڑا افسوس ہے، سنا ہے، ابھی شادی میں چند دن ہی باقی تھے۔" رکشے میں سے اترتے ہوئے اس کی بات پر میرا دل چاہا میں اسے کہوں میں ہی وہ بے رحم قاتل ہوں جس نے اجمل کو قتل ہی نہیں کیا اس کا گھر ہی اجاڑ دیا۔ میرے کسی بھی بات کا جواب نہ دینے پر وہ مجھ سے پیسے لیتے ہوئے مجھے حیرت زدہ سا کھڑا دیکھتا رہا اور میں تھانے کے گیٹ

کی جانب بڑھ گیا۔ یہ تھانے اور کورٹ کچہری میرے لئے کوئی نئی بات نہ تھی۔ ابا شہر کے ایم این اے تھے۔ بعض اوقات ابا کے اپنے یا لوگوں کے کئی طرح کے مسائل کی خاطر میرا بھی ابا کے ساتھ تھانے کچہری کا چکر لگتا رہتا تھا۔

میں سیدھا ایس ایچ او کے کمرے میں پہنچا۔ وہ اس وقت اپنے ماتحت عملے کو کوئی ہدایات دے رہے تھے۔ میرے سلام کرنے اور ان کے میز کے پاس کھڑے ہونے کے باوجود انہوں نے میری آمد کا کوئی نوٹس نہ لیا پھر کچھ دیر بعد انہوں نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے میری جانب سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ ان کے میری جانب متوجہ ہوتے ہی میں نے خود سے سرزد ہوئے قتل کا اقبال جرم کر ڈالا۔ میرے ایسا کرتے ہی جیسے کمرے میں ایک دم سے سناٹا چھا گیا۔ رات نامعلوم افراد کے خلاف ایف آئی آر اسی تھانے میں درج کی گئی تھی اور پولیس نے تحقیقات کے بعد جس مجرم تک پہنچنا تھا وہ چوبیس گھنٹوں سے بھی پہلے خود ہی چل کر ان تک پہنچ گیا تھا۔ میرے اقبال جرم کرنے تک وہاں موجود کوئی شخص مجھے نہیں پہچانتا تھا کہ میں کون ہوں لیکن جب میرا بیان ریکارڈ کیا جا رہا تھا اور میں نے اپنے ابا کا نام بتایا تو پھر یہ راز نہ رہا۔ سوالات کا سلسلہ کافی دیر تک جاری رہا اور پھر مجھے حوالات میں بند کر دیا گیا۔ میرے پاس موجود سبھی سامان پولیس نے اپنے پاس رکھ لیا۔ ایس ایچ او نے آخری بار مجھے اپنا فون استعمال کرنے کی اجازت دی تو میں نے انکار کر دیا۔ شاید اس لئے کہ مجھ میں خود ہی اپنے ابا یا گھر کے کسی فرد کو اپنے جرم کے بارے میں بتانے کی ہمت نہ تھی۔ مجھے حوالات کے پیچھے ابھی چند لمحے ہی بیتے تھے۔ حوالات کی سلاخوں کے پیچھے کھڑے قتل کا اقبال جرم کر لینے والے مجرم کی دماغی حالت بالکل ایسی ہوتی ہے، جیسے اپنے ہی ہاتھوں خنجر لئے کوئی خود اپنا گلا کاٹنا چاہتا ہو، ہاتھ گلے تک پہنچتا ہو، خنجر کا لمس گلے کی رگوں سے مس ہو رہا ہو، لیکن ہاتھ نہ چلے، میں سلاخوں کے پیچھے ایک کونے میں بیٹھا آنے والے لمحوں کی اذیت کو ابھی سے محسوس کر رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب تک میرے اہلِ خانہ تک یہ خبر پہنچ چکی ہوگی بلکہ ٹی وی چینل پر بریکنگ نیوز سے اجمل کے ابا اور گھر والے بھی اس بات سے آگاہ ہو چکے ہوں گے کہ ان کے بے گناہ بیٹے کی موت کے مجرم نے خود چل کر خود کو پولیس کے حوالے کر دیا ہے۔

مجھے حوالات میں بند ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا جب ابا، بھائی اور مائیکل میرے پاس آ پہنچے تھے۔ انہیں پولیس اسٹیشن سے ہی خبر پہنچ گئی تھی۔ ابا اور بھائی کو دیکھ کر میرے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا اور میرے رخسار آنسوؤں سے بھیگنے لگے۔ میں ان کے سامنے سر نہیں اٹھا پا رہا تھا اور نہ ہی مجھ میں اتنی ہمت تھی کہ میں بھائی اور ابا کے چہروں کی جانب دیکھتا۔ وہ بار بار ایک ہی شکوہ کئے جا رہے تھے کہ میں نے ان سے رابطہ کیوں نہ کیا اور اگر مجھ سے قتل جیسا جرم سرزد ہو ہی گیا تھا تو میں کہیں بھاگ کر چھپ کیوں نہیں گیا۔ اب میں ابا یا بھائی کو کیا بتاتا کہ میں بھاگ کر پناہ ڈھونڈنے تو نکلا تھا لیکن پھر انجانے میں، میں اسی گھر جا پہنچا تھا جس گھر کے گلشن کو میں نے اپنے ہی ہاتھوں سے اجاڑا تھا۔

پھر ایک اور بری خبر مجھے مائیکل سے پتہ چلی، اس نے مجھے بتایا کہ اجمل کے ابا کی آخری خواہش بھی پوری نہ ہو سکی وہ جو چاہتے تھے کہ ان کے لختِ جگر کا پوسٹ مارٹم نہ ہو لیکن نماز جنازہ کے فوراً بعد ہی پولیس وہاں پہنچی اور اجمل کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لئے لے

گئی۔مائیکل کی زبانی یہ سب سن کر مجھے شدید صدمہ پہنچا۔ابھی میں اسی صدمے سے دوچار کھڑا تھا کہ بڑے ابا، ماں اور بھابی کو لے کر پہنچ گئے۔ماں روتی ہوئی میرے پاس پہنچی تھی۔مجھے یوں سلاخوں سے پرے بند دیکھ کر اپنے ہوش وحواس پر قابو نہ رکھ پائی تھی۔

کچھ دیر بعد بھائی اور بھابی ماں کو لے کر باہر چلے گئے اور اب فقط ابا، بڑے ابا اور مائیکل ہی میرے پاس موجود تھے۔میں مسلسل سر جھکائے اپنا سر سلاخوں سے ٹکائے روئے جارہا تھا۔بڑے ابا نے ایک ہاتھ میرے سر پر پھیرا اور کچھ خاموشی کے بعد بولے۔

"میاں یہ سب تو ہونا ہی تھا میں تو تم لوگوں کو سمجھا سمجھا کر تھک گیا، کوئی میری سنتا کب تھا۔میں کہتا رہ گیا کہ فقط حلال کماؤ اور حلال کھاؤ اور تم لوگ اپنی ہی من مرضیاں کرتے چلے گئے۔شریعت کی پابندیوں سے رُوگردانی کرنے کے ایسے ہی نتائج نکلا کرتے ہیں لیکن مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی بیٹا کہ تم نے اقبال جرم کر لیا۔میں تمہارے ساتھ ہوں طٰہٰ بیٹا، تم کوئی کسی قسم کی فکر مت کرنا۔اللہ بہتر کرے گا اور عدالت بھی ایسے مجرموں کے ساتھ رعایت کیا کرتی ہے جو اپنے جرم کا خود اقرار کر لیتے ہیں۔''میرے ابا تو اب بھی مجھے فقط بھاگ جانے کہیں چھپ جانے، اپنا اثر ورسوخ استعمال کرنے اور کسی طرح سے باہر ہی باہر معاملے کو نپٹا لینے کا درس دے رہے تھے لیکن بڑے ابا کی باتیں سن کر مجھے احساس ہو رہا تھا کہ ہم واقعی غلطی پر تھے۔ہم جو حلال وحرام کی تمیز کئے بغیر زندگی گزار رہے تھے تو ایک روز تو اس نے اپنا اثر دکھانا ہی تھا۔

اگلے چند گھنٹوں میں ابا نے میری ضمانت کے لئے ہر ممکن کوشش کر لی، لیکن میری ضمانت منظور نہ ہو سکی۔مائیکل سے مجھے پتہ چلا کہ پولیس اسٹیشن سے باہر اخبار اور ٹی وی چینل کے نمائندوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی اور یہ بھی ابا کی کوششوں سے ہوا تھا کہ وہ اب تک مجھ تک نہیں پہنچ پائے تھے۔ابا نہیں چاہتے تھے کہ اخباروں یا نیوز چینل کے ذریعے لوگ میرا بیان سن پائیں۔وہ ہر ممکن طریقے سے اپنے سیاسی کیریئر کو بچانے کے لئے سرگرداں تھے۔

میں ایک بار پھر سے تنہا ہو گیا تھا سبھی مجھے حوصلہ رکھنے کی تلقین کرتے ہوئے واپس چلے گئے تھے اور میں اب سلاخوں کے پیچھے بیٹھا دعائیں کرنے لگا تھا کہ یارب اجمل کے ابا یا اس کے گھر کے کسی فرد سے میرا سامنا نہ ہو۔اگر وہ میرے سامنے آجائیں تو میرے پاس ان کے کسی سوال کا کوئی جواب نہ ہو گا۔میں فقط ان کے بیٹے کا ہی نہیں ان سبھی کا مجرم تھا جن سے میں نے ایک بیٹا، ایک بھائی چھین لیا تھا۔میں جیل کے ننگے فرش پر لیٹا یہی سوچ رہا تھا، میرے اوپر روشن دان سے آنے والی روشنی کی بیم اب غائب ہو چکی تھی، آج کے دن کا سورج غروب ہو رہا تھا۔میرے مقدر میرے عروج کا ستارہ ڈوب رہا تھا۔

رات اور پھر دن بھر جاگتے رہنے سے میرے دماغ کی رگوں سے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔جیل کے ننگے فرش پر ہاتھ کا سرہانہ بنا کر لیٹنے سے جیسے مجھے کچھ بہتر محسوس ہو رہا تھا اور پھر نہ جانے کس گھڑی میری آنکھ لگ گئی۔کمرہ عدالت میں، میں کٹہرے میں کھڑا تھا۔اجمل کے وکیل نے تمام ثبوت جج صاحب کے سامنے رکھ دیئے اور پھر وہ بھری عدالت میں مجھ سے میرے جرم کا اقرار لینے لگا۔

میں نے ذرا نگاہ اٹھا کر دیکھا میری ماں کمرہ عدالت میں ہاتھوں سے آنچل اٹھائے گڑ گڑا کر اللہ سے دعائیں مانگ رہی تھی۔ ابا اور بھائی کے دل کی حرکت جیسے بے ترتیب ہوئے جا رہی تھی اور بڑے ابا کے ہاتھ میں موجود تسبیح میں چلنے والے موتی اب تیز تیز گرنے لگے تھے۔ میرا بیان وہی تھا، میں نے اپنے جرم کے اقرار کو جج صاحب کے سامنے دہرایا تو میرا ایسا کرنا میرے خاندان پر قیامت بن کر ٹوٹا۔ جج صاحب نے مجھے سزائے موت سنا کر قلم توڑ دیا۔ اب مجھے پھانسی پر چڑھانے کے لئے تختہ دار تک لے جایا جا رہا تھا پھر مجھے تختہ دار پر کھڑا کر کے میرے چہرے کو سیاہ کپڑے سے ڈھانپ دیا گیا اور میرے چارسُو جیسے مہیب سا سناٹا گہرا اندھیرا چھا گیا۔ پھانسی کے پھندے کو میرے گلے میں ڈالا گیا تو پھانسی کے پھندے کی رسّی کے لمس نے میرے وجود سے جیسے ابھی سے روح کھینچ لی تھی۔ میرے پیروں تلے سے ابھی تختہ نہیں سرکا تھا جب مجھے شور سنائی دینے لگا۔ اس شور میں مجھے ماں کے رونے کی آواز بھی سنائی دی اور ساتھ ہی کسی کے شکرادا کرنے کی آواز بھی سنائی دی تو مجھے تعجب ہوا۔ میں یہی سمجھا شاید یہ آواز اجمل کے خاندان کے کسی فرد کی ہو گی لیکن پھر ایک ساتھ مجھے کئی آوازیں آنے لگیں۔ اگلے ہی پل میری آنکھ کھل گئی۔ اب سلاخوں سے باہر اپنے خاندان بھر کو کھڑا دیکھ کر میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

ماں، ابا، بھائی، بھابی، بڑے ابا، مائیکل، ابا کے چند قریبی دوست احباب اور ہمارے رشتہ دار ایک بڑی تعداد سلاخوں سے باہر موجود تھی۔ وہ سبھی بے حد خوش تھے اور شکرانے کے الفاظ بار بار ان کے لبوں پر جاری تھے اور مجھے یوں لگ رہا تھا کہ میں ایک خواب سے کسی دوسرے خواب میں جا اترا ہوں، ابھی چند ثانیے پہلے میں کسی خواب میں تختہ دار پر کھڑا اپنے پیروں تلے سے تختہ سرکنے کا انتظار کر رہا تھا اور اب اگلے ہی پل میرے اہل و عیال خوش دکھائی دے رہے تھے، پھر بڑے ابا کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ ''طٰہٰ بیٹا اجمل کے اہلِ خانہ نے تمہیں اپنے بیٹے کا خون معاف کر دیا ہے۔ اجمل کے ابا نے خود تھانے آکر بیان دیا ہے کہ وہ اور اس کے اہلِ خانہ تمہیں اپنے بیٹے کا خون معاف کرتے ہیں۔ بیٹا اللہ نے تمہیں نئی زندگی بخش دی۔'' بڑے ابا کی بات سن کر خوشی تو دور کی بات میرے لئے اس بات پر یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا، چند گھنٹوں میں ہی اجمل کے ابا نے تھانے پہنچ کر بیان دے دیا کہ وہ اپنے اکلوتے جواں سالہ بیٹے کے قاتل کو معاف کرتے ہیں، ایسا کیسے ممکن تھا، مجھے اپنے ابا پر شک ہونے لگا۔ میری نگاہوں کے سامنے ابا کا سارا اثر و رسوخ گھومنے لگا۔ دولت، روپیہ، پیسہ، دھمکیاں، اسلحہ، دہشت، اجمل کے اہلِ خانہ میرے ذہن میں گھومنے لگے۔ اجمل کے کمزور بوڑھے والدین، جواں سالہ بہنیں ان کی عزت و آبرو، مجھے اپنے ابا سے شدید نفرت ہونے لگی تھی۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ ابا نے ضرور اجمل کے اہل و عیال پر یہ بات واضح کر دی ہو گی کہ ان کے میرے خلاف بیان دینے پر ان کے ساتھ کیا معاملہ ہو سکتا تھا۔

مجھے بتایا گیا کہ فقط آج کی رات مجھے حوالات میں گزارنا پڑے گی۔ اس کے بعد نئے دن کے سورج کے طلوع ہوتے ہی میں بری ہو جاؤں گا۔ میں جس نے ایک بے گناہ کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا، میں ہمیشہ کے لئے اس کیس سے بری ہو جاؤں گا، کیونکہ اجمل

کے اہلِ خانہ نے مجھے معاف کر دیا تھا۔ ایسا مان لینا میرے لئے ناممکن تھا اور حقیقت کیا تھی اب یہ جاننے کے لئے میں بے تابی سے سلاخوں کے پیچھے تڑپ رہا تھا۔ مائیکل اجمل کا ہمسایہ تھا، مجھے اس سے معلوم پڑ سکتا تھا کہ حقیقت کیا تھی لیکن سبھی کے ساتھ ساتھ اب وہ بھی میرے پاس سے جا چکا تھا۔

یہ ایک رات اور اس کا ایک ایک لمحہ میرے لئے پھانسی پر جھول جانے سے بھی زیادہ اذیت ناک تھا۔ میں طٰہٰ عالم جس نے خود پولیس اسٹیشن پہنچ کر اقبالِ جرم کر لیا تھا اور اب میں چاہتا تھا کہ قانون مجھے میرے جرم کی کڑی سے کڑی سزا دے، اقبالِ جرم کرنے کے فقط چند گھنٹوں میں ہی رہا ہونے جا رہا تھا۔

میں جو کسی ایک کونے میں بیٹھتا تو بے تاب ہو کر اٹھ بیٹھتا اور اس چند گز کے قید خانے میں اِدھر سے اُدھر چکر کاٹنے لگتا اور پھر یونہی چکر کاٹتے کاٹتے ایک دم سے بیٹھ جاتا، ایسے ہی بے تابی سے تڑپتے ہوئے اٹھتے بیٹھتے میں نے رات گزار دی۔

نئی صبح کا سورج طلوع ہوا تو صبح سویرے ہی بھائی اور مائیکل میرے لئے ناشتہ لے کر آ پہنچے۔۔۔ اور میری تو جیسے بھوک پیاس ہی مٹ چکی تھی۔ بھائی مجھے ناشتہ کرنے کو کہتا رہا اور میں ناشتہ کرنے کی بجائے ایک ہی بات اس سے پوچھتا رہا کہ اجمل کے اہلِ خانہ نے مجھے معاف کیوں کر دیا۔ بھائی جواب میں وہی باتیں کرتا رہا جو میں پہلے بھی سن چکا تھا اور جن پر یقین کرنا میرے لئے تقریباً ناممکن تھا۔

بھائی اور مائیکل کے آنے کے چند ایک گھنٹے بعد ہی ابا بھی آ پہنچے تھے۔ اجمل کے ابا کے بیان کے بعد آج مجھے ضمانت پر رہا کر دیا گیا تھا لیکن اس کیس کو مکمل ہونے اور قانونی اور کاغذی کارروائی میں ابھی چند دن مزید درکار تھے۔ پھر پولیس اسٹیشن سے باہر قدم رکھتے ہی مجھے احساس ہوا کہ سیاسی لیڈر یا مشہور ہونا بھی کس قدر عذاب دہ ہوتا ہے۔ یہی جرم میری جگہ کسی عام سے شخص نے کیا ہوتا تو فقط اخبار کے کسی اندرونی صفحے پر ایک چھوٹی سی خبر لگتی جسے لوگ پڑھنا بھی گوارہ نہ کرتے لیکن میرا معاملہ اور تھا۔ میں ایک سیاسی لیڈر کی اولاد تھا اور اب میڈیا کے ہاتھ جو میرے قتل کی خبر لگی تو وہ اسے لوگوں کے سامنے جیسے کوئی دلچسپ کھیل بنا کر پیش کر رہے تھے۔ لمحہ لمحہ بھر کی خبریں منظرِ عام پر لائی جا رہی تھیں اور پھر چوبیس گھنٹوں میں ہی مجھے معافی مل جانے اور چھوٹ جانے نے میڈیا میں ہلچل ہی مچا دی تھی اور ہر طرف انصاف انصاف کی آوازیں گردش کر رہی تھیں۔

بڑی مشکل سے ابا میڈیا والوں کے سوالوں سے بچا کر مجھے گھر لے کر پہنچے تھے اور گھر پہنچتے ہی انہوں نے جو کچہری بٹھائی تو اب ان کی عدالت میں، میں مجرم بنا بیٹھا تھا۔ انہیں اپنا سیاسی مستقبل صاف ڈوبتا دکھائی دے رہا تھا۔ اسی پیچ و تاب میں وہ بولتے چلے جا رہے تھے اور میں سر جھکائے فقط سننے کے سوا کیا جواب دے سکتا تھا۔ الیکشن قریب تھے۔ ابا اب کی بار بھی شکست ماننے والے نہ تھے لیکن مجھ سے سرزد ہو جانے والے جرم اور اس کی میڈیا کو خبر ہو جانے کے بعد اب ابا کو اپنی ہار واضح دکھائی دے رہی تھی۔

بڑے ابا، بھائی، ماں سبھی جیسے مومی مجسمے بنے بیٹھے تھے اور ابا تھے کہ چپ ہونے کا نام ہی نہ لے رہے تھے۔ بڑے ابا کوئی بات کہنے لگتے تو جیسے وہ پھر سے ایک دم سے بھڑک اٹھتے۔ ''اتنی بڑی غلطی اس سے کیسے سرزد ہو سکتی ہے، پچھلے کئی سالوں سے میرے ساتھ

رہتے ہوئے اس نے مجھ سے یہی سب سیکھا ہے، ہم لوگوں کی چھینکیں تک لوگ گنتے ہیں اور یہ برخوردار قتل جیسا جرم کرنے کے بعد اقبال جرم کرنے پولیس اسٹیشن جا پہنچے۔ جیسے ان کے پھانسی چڑھ جانے سے لواحقین کو انصاف مل جائے گا۔ ہو جاتی ہیں، غلطیاں انسانوں سے ہی ہوتی ہیں، لیکن ہر کام کا کوئی ڈھنگ ہوتا ہے۔ چار بہنوں کا بھائی، بوڑھے ماں، باپ انہیں تمہاری پھانسی نہیں چاہیے میاں انہیں سہارا چاہئے اور وہ روپوں سے ملتا ہے اور تم چلے سیدھے پھانسی چڑھنے، پھر تم نے ایک بار بھی کسی کو آگاہ کرنا تک مناسب نہ سمجھا۔'' ابا رکنے کا نام ہی نہ لے رہے تھے اور مجھے ابا کی باتوں سے کچھ کچھ یقین ہونے لگا تھا کہ ابا نے اجمل کے لواحقین سے مل کر باہر ہی باہر کچھ معاملہ طے کر لیا ہو گا یا انہیں دبا لیا ہو گا۔ ابا کی لگائی کچہری میں بیٹھے ہوئے میری حالت کو دیکھ کر بڑے ابا جو اتنی دیر سے ابا کی باتیں برداشت کئے جا رہے تھے ایک دم سے اٹھ کھڑے ہوئے اور پھر جو انہوں نے تپ کر ابا کو چپ ہو جانے کو کہا تو ایک بار جیسے کمرے میں سناٹا چھا گیا وہ مجھے اپنے ہمراہ لئے میرے کمرے تک چھوڑ کر آرام کرنے کا کہہ کر چلے گئے لیکن ان کے جاتے ہی جیسے تنہائی میرے لئے عذاب بن گئی تھی میں نے تو سوچا تھا کہ میرے اقبال جرم کی خبر اجمل کے ابا اور اس کے گھر کے دیگر افراد جب سنیں گے تو انہیں اک راحت تو نصیب ہو گی، اب اپنے لخت جگر کو کھو کر ان کے سینے میں ایک ہی آگ بھڑک رہی ہو گی کہ کیسے بھی ان کے بیٹے کا قاتل اپنے انجام کو پہنچ جائے لیکن پھر یہ کیسے ممکن ہوا کہ انہوں نے مجھے معاف کر دیا، ابا کی باتوں نے میرے وہم کو مزید یقین میں بدل دیا تھا اور میں اب سوچ رہا تھا کہ آخر ابا نے ایسا کیا کیا ہو گا کہ فقط قتل کے چند گھنٹوں بعد ہی اجمل کے ابا تھانے پہنچ کر مجھے معاف کر دینے کا بیان ریکارڈ کروا گئے۔

اسی راز کو جاننے کے لئے میں بے تاب تھا اور گھر آنے کے بعد سب سے پہلے میں اس سلسلے میں مائیکل سے ملا لیکن مائیکل کا حال بھی کچھ میرے جیسا ہی تھا۔ وہ اجمل کا ہمسایہ تھا، اس کے باوجود بھی وہ اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا، پھر جیسے وہ مضطرب ہو کر بولا۔ ''اجمل کے ابا جان گئے ہیں کہ میں آپ کے گھر کا ڈرائیور ہوں۔'' یوں وہ اب مائیکل سے بھی سیدھے منہ بات نہ کرتے تھے۔ میں نے مائیکل سے التجا کرتے ہوئے کہا کہ وہ کیسے بھی مجھے اجمل کے ابا سے ملوا دے۔ اجمل کے ابا سے مل کر میں ان کے پیر پکڑ لوں گا اور ان سے معافی طلب کروں گا، پھر ان سے معلوم کروں گا کہ آخر کیا وجہ تھی کہ انہوں نے مجھے اپنے بیٹے کا خون معاف کر دیا۔ مائیکل نے میری بات سن کر ہامی بھر لی تو میں نے مائیکل کو اسی وقت اس کام کے لئے روانہ کر دیا اور جب تک مائیکل واپس نہ لوٹا میں بے تابی سے اس کا انتظار کرتا رہا۔ مائیکل نے واپس لوٹتے ہی مجھے مشورہ دیا کہ میں اجمل کے ابا سے نہ ملوں، اس نے اجمل کے ابا سے مل کر ان کی شدید نفرت اور غصہ دیکھ لیا تھا اور ان کی ذہنی حالت سے مجھے آگاہ کر دیا تھا۔ ایسے میں اگر میں ان کے سامنے جاتا ہوں تو ان کے بیٹے کا غم جو ابھی تازہ ہی تھا اپنے بیٹے کے قاتل کو سامنے کھڑا پا کر انہیں کس قدر اذیت پہنچے گی یہ خیال ذہن میں آتے ہی میں خود بھی اضطراب میں مبتلا ہو رہا تھا۔

لیکن پھر سوچتا ہوں کہ اگر میرے سوال کا جواب مجھے کسی سے مل سکتا تھا تو وہ فقط اجمل کے ابا ہی تھے اور جہاں تک ان کے غم کے تازہ ہونے کی بات تھی تو وہ برسوں گزرنے کے بعد بھی میرے ان کے سامنے آجانے پر ویسا ہی ہرا ہو جاتا اور وہ مجھ سے ویسا ہی رویہ اختیار کرتے جیسا وہ میرے آج ان سے ملنے پر ان کا مجھ سے نفرت انگیز رویہ ہوتا۔ یہی سوچ کر میں نے فیصلہ کیا کہ میں کسی سے بھی کچھ کہے بغیر خود اجمل کے ابا سے جا کر ملوں گا۔

اسی مقصد سے اگلے ہی روز میں گاڑی لے کر نکلا اور اجمل کے گھر کی اسی گلی سے باہر جا کھڑا ہوا جس گلی میں اجمل کا گھر تھا پھر وہاں گلی سے باہر کھڑے گلی سے نکلتے کسی بھی شخص کو دیکھ کر میں یوں چونک جاتا جیسے وہ اجمل کے ہی گھر کا کوئی فرد ہو۔ وہاں کھڑے میرے ارد گرد سے گزرتے لوگوں کی نظر جب مجھ پر پڑتی تو میں جیسے کانپ اٹھتا اور سوچنے لگتا کہ کہیں یہ لوگ مجھے پہچانتے تو نہیں۔ ابھی میں ایسی ہی کشمکش میں مبتلا تھا جب ظہر کی اذان ہونے لگی اور پھر اگلے ہی پل مجھے اجمل کے ابا گلی میں سے نکلتے دکھائی دیئے۔ ان پر پہلی نظر پڑتے ہی میں سر تا پا کانپ اٹھا۔

میں جو ارادہ کر کے آیا تھا کہ اجمل کے ابا کے سامنے آتے ہی میں ان کے پیروں میں گر کر ان سے معافی طلب کروں گا۔ اب اپنی جگہ بے حس و حرکت یوں کھڑا تھا جیسے میرے پیروں تلے تار کول کی ابھی تازہ گرم گرم تپتی تہہ بچھی ہو اور میں تار کول سے چپکے پیروں کو چاہ کر بھی اپنی جگہ سے ہٹا نہ پا رہا ہوں۔ میں اسی تذبذب میں مبتلا فقط اسی جگہ کھڑا رہا اور وہ میرے سامنے سے گزر کر مسجد تک جا پہنچے، سڑک پار کر کے دوسری جانب ہی وہ مسجد تھی جس میں وہ نماز ادا کرنے گئے تھے۔ میں جو ان سے ملنے کا سوچ کر آیا تھا تو اب ان سے ملے بغیر واپس کیسے لوٹ جاتا، گاڑی وہیں چھوڑ کر میں بھی سڑک پار کر کے مسجد کے پاس جا پہنچا اور مسجد کے دروازے سے باہر کھڑا میں اجمل کے ابا کے نماز ادا کر کے باہر نکلنے کا انتظار کرنے لگا۔

تھوڑی ہی دیر بعد نمازی حضرات نماز ادا کرنے کے بعد ایک ایک کر کے مسجد سے نکلنے لگے تھے۔ میں مسجد سے نکلتے ہر شخص کو بے تابی سے دیکھنے لگتا اور بالآخر مجھے اجمل کے ابا بھی ہاتھوں میں جوتا اٹھائے مسجد سے باہر آتے دکھائی دیئے۔ انہوں نے جوتے کو مسجد سے باہر رکھا اور پھر وہ جوتا پہن کر جیسے ہی آگے بڑھے لا محالہ میں نے آگے بڑھ کر جھک کر ان کے ایک پیر کو پکڑ لیا۔ میرے اچانک ایسا کرنے پر وہ بوکھلا کر میری جانب متوجہ ہوئے۔

"بیٹا کون ہو پاؤں چھوڑو۔۔۔ چھوڑو بیٹا۔" انہوں نے فقط ایک بار مجھے دیکھا تھا جب اس قتل والی رات میں نے غلطی سے مائیکل کے گھر کی بجائے انہی کے گھر کے دروازے پر دستک دے دی تھی۔ شاید رات ہونے یا بینائی کی کمزوری کی وجہ سے وہ مجھے پہچان نہ پائے تھے اور جب وہ پولیس اسٹیشن معافی کا بیان دینے آئے تھے تب بھی انہوں نے مجھے نہ دیکھا تھا لیکن اس سب کے باوجود جانے انہیں میرے وجود سے میری شخصیت سے کیسے یہ معلوم پڑ گیا کہ میں وہی ان کے بیٹے کا بے رحم قاتل ہوں، پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے ان کے چہرے کے تاثرات بدلنے لگے تھے۔ میں نے بھی ان کے پیر نہ چھوڑے لیکن مجھے وہ الفاظ نہیں مل رہے تھے جن

سے میں انہیں بتا سکوں کہ میں ہی وہ بدنصیب ہوں جس نے ان کا گلشن ویران کر دیا۔ میرے ان کے پیر پکڑنے کے بعد کچھ لوگ ہمارے ارد گرد حیرت سے کھڑے مجھے ایسا کرتے دیکھنے لگے تھے لیکن مجھے اس وقت نہ تو ان لوگوں کی پروا تھی اور نہ ہی اتنا ہوش تھا کہ میں ان لوگوں کی طرف دھیان دیتا۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے لب کھولے۔

میں وہی آپ کا مجرم ہوں بابا جی۔'' انہوں نے یہ سنتے ہی ایک جھٹکے سے اپنا پاؤں میرے ہاتھوں کی گرفت سے آزاد کروالیا اور اب ان کے چہرے کی جانب دیکھنے کی مجھ میں ہمت نہ تھی۔ میں جوان کا مجرم تھا تو مجرموں کی طرح اپنا سر جھکائے ہی رکھا اور پھر اپنے ہاتھ جوڑتے ہوئے ان کے سامنے گڑگڑانے لگا۔

''میں معافی کے قابل نہیں ہوں میں آپ کا آپ کے بیٹے کا مجرم ہوں تو آپ نے مجھے معاف کیوں کیا؟''

''میں نے کب تمہیں معاف کیا، میرے ہاتھ فیصلہ ہوتا تو اسی جگہ لے جا کر تمہارے سینے میں گولیاں برساتا جہاں تم نے میرے اجمل کو مارا تھا۔ تمہیں میں نے نہیں میرے اجمل نے معاف کیا ہے۔''

''اجمل نے معاف۔۔۔ لیکن اجمل تو۔۔۔'' میں اجمل کے ابا کی بات سن کر بھونچکا سا ہو کر سوچ رہا تھا، جب وہ تند و تیز لہجے میں پھر سے مجھ سے مخاطب ہوئے۔

''یہی سوچ رہے ہوناں کہ اجمل تمہیں کیسے معاف کر سکتا ہے، اجمل تو اب اس دنیا میں ہی نہیں۔ کل ظہر کے بعد اسی جگہ چلے آنا جہاں تم نے میرے معصوم بیٹے کی جان لی تھی۔ تمہیں تمہارے اس سوال کا جواب وہیں آ کر مل سکتا ہے۔'' وہ اتنا کہہ کر آبدیدہ سے ہو کر آگے بڑھ گئے اور میں جو فقط اپنے ایک سوال کا جواب ڈھونڈنے آیا تھا۔ اب بے حس و حرکت کھڑا سینکڑوں سوالوں تلے آدبا تھا۔ اجمل کے ابا نے مجھے معاف نہیں کیا وہ تو بدلے کی آگ میں ویسے ہی جھلس رہے تھے۔ ان کا بس چلتا تو وہ ابھی مجھے گولیوں سے بھون ڈالتے۔ انہوں نے مجھے معاف نہیں کیا تھا بلکہ مجھے اجمل نے معاف کیا تھا یہ کیسے ممکن تھا؟ اجمل کے جنازہ میں، میں نے خود شرکت نہ کی ہوتی تو شاید میرے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوتا کہ اجمل میں ابھی زندگی کی رمق باقی تھی لیکن ایسا ممکن نہ تھا اور اب سوال یہ تھا کہ پھر اجمل مجھے کیسے معاف کر سکتا ہے اور اس سوال کا جواب مجھے تب مل سکتا تھا جب میں اجمل کے ابا کے کہنے کے مطابق اسی جگہ اسی دکان پر ظہر کے بعد پہنچ جاؤں۔ جہاں نشے کی حالت میں مجھ سے گولی چل جانے سے اجمل چل بسا تھا۔

گھر پہنچ کر بھی اجمل کے ابا کے کہے الفاظ میرے دماغ پر ضربیں لگاتے رہے اور میں سوچتا رہا کہ آخر وہاں وہ اسی جگہ مجھے بلا کر ایسا کیا بتانا چاہتے تھے۔ جس سے مجھے یہ معلوم پڑ جائے گا کہ مجھے اجمل کے ابا نے نہیں بلکہ اجمل نے معاف کیا ہے۔ پھر میں سوچنے لگا کہ اجمل کے ابا مجھے وہ بات وہیں کھڑے بھی تو بتا سکتے تھے۔ آخر انہوں نے وہ بات بتانے کے لئے اسی جگہ کو کیوں منتخب کیا۔ شاید وہ مجھے اسی جگہ بلا کر اذیت دینا چاہتے تھے۔ احساس دلانا چاہتے تھے کہ میں نے کیسے ان کے معصوم بیٹے کی جان لی۔ یہ خیال آتے ہی میں جیسے ابھی سے پسینے میں شرابور ہونے لگا تھا۔ ایک سوال نے پہلے ہی مجھے اضطراب میں مبتلا کر رکھا تھا اور اب اجمل کے ابا سے

مل کر میں کسی اضطرابِ مسلسل میں مبتلا ہو چکا تھا۔ میں یہ بھی سوچتا کہ اجمل کے ابا نے پولیس اسٹیشن پہنچ کر بیان تو دے ہی دیا ہے اور میں اب قانون کی گرفت سے بھی آزاد ہو چکا ہوں تو مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ میں اپنے ان سوالوں کے جواب ڈھونڈتا پھروں، اپنا سکھ چین غارت کروں لیکن مجھے اجمل کی ماں، بہنوں کی بددعا لگ چکی تھی جو مجھے کسی کروٹ چین نہ لینے دیتی تھی۔ شاید اسی لئے میں ظہر کے بعد اجمل کے ابا کے کہنے کے مطابق اسی جگہ دکان پر جا پہنچا جہاں انہوں نے مجھے بلایا تھا۔

میں نے گاڑی دکان کے سامنے کھڑی کر دی جہاں اس رات داؤد نے اپنی گاڑی کھڑی کی تھی۔ میں نے گاڑی سے اترنے سے پہلے ایک نظر دکانوں کی لمبی قطار کی جانب دیکھا، اب دن کے وقت تمام دکانیں کھلی ہوئی تھیں، میں نے گاڑی سے نیچے قدم رکھا سامنے اجمل کی دکان پر چند گاہک کھڑے تھے۔ میں وہیں ٹھہر کر گاہکوں کے جانے کا انتظار کرنے لگا پھر مجھے اجمل کے ابا دکھائی دیئے وہ اجمل کی طرح ویسی ہی جالی دار سفید ٹوپی پہنے ہوئے تھے۔ اجمل کی طرح ان کے چہرے پر بھی داڑھی تھی فرق صرف اتنا تھا کہ عمر کے اس حصے میں ان کے تمام بال سفید ہو چکے تھے۔ گاہک کب کے جا چکے تھے اور میں ابھی تک وہیں کھڑا تھا۔ جیسے خود میں ہمت جمع کر رہا تھا۔ وہاں کھڑے میں کئی بار اس منظر کو دیکھ چکا تھا، جب میں نشے کی حالت میں اس دکان پر آیا تھا۔ اجمل اس وقت قرآن مجید کی تلاوت کر رہا تھا، مجھے دیکھ کر اس نے قرآن مجید کو چوم کر آنکھوں سے لگایا اور پھر ایک جانب رکھ دیا۔ میں نے جو ماچس یا لائٹر مانگنے کے لئے اپنے لب ہلائے تو اسے میرے منہ سے آتی شراب کی بو ناگوار گزری، اس نے حقارت سے دھتکارتے ہوئے مجھے وہاں سے چلے جانے کو کہا اور ماچس دینے سے انکار کر دیا۔ یہ دیکھ کر اگلے ہی پل میں نے ریوالور اپنی جیب سے نکال کر اس پر گولی چلا دی۔ یہ خیال پھر سے ذہن میں آتے ہی مجھے لگا جیسے ابھی میرے کانوں نے پاس ہی کھڑی گاڑی میں موجود عبیرہ کی چیخ سنی ہو، وہ اس رات میرے گولی چلاتے ہی ڈر گئی تھی۔ ایسے ہی خیالات کو جھٹکتے ہوئے بھاری ہوتے قدموں کے ساتھ میں دکان کی جانب بڑھا۔ میرے کاؤنٹر کے پاس پہنچتے ہی اجمل کے ابا مجھے دیکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے ہاتھ میں قرآن مجید تھا۔ مجھے دیکھ کر اٹھتے ہوئے ان کے چہرے کے تاثرات میرے بیان سے باہر تھے۔ اس قدر شدید غصے اور حقارت سے انہوں نے مجھے دیکھا کہ میں نے اپنا سر جھکا دیا۔ انہوں نے ہاتھ میں پکڑے قرآن مجید کو چوم کر آنکھوں سے لگا کر ایک طرف رکھا اور پھر کاؤنٹر سے کچھ اٹھانے کے لئے جھکے اور جب وہ سیدھے ہوئے تو یہ دیکھ کر جیسے میرے پیروں تلے سے زمین ہی نکل گئی کہ ان کے ہاتھ میں وہی ریوالور تھا جس سے اس رات میں نے ان کے بیٹے اجمل پر گولی چلائی تھی۔ تو یہ پولیس کے ہاتھ اس لئے نہ لگا کہ یہ ریوالور اجمل کے ابا کے پاس تھا۔ میں یہ سب کچھ سوچ رہا تھا۔

”میں نے تمہیں معاف نہیں کیا۔“ فقط اتنا کہہ انہوں نے ٹریگر دبا دیا۔ پہلی گولی کے لگتے ہی میں لڑکھڑا گیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ریوالور میں بچی باقی کی تمام گولیاں بھی انہوں نے میرے سینے میں اتار دیں۔ میں زمین پر گر اتڑپنے لگا۔ میرا رُواں رُواں گولیوں سے چھلنی ہو چکا تھا اور میں ان اذیت ناک لمحوں میں اپنی روح کے جسم سے جدا ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ اجمل کے ابا نے اپنے بیٹے

کے خون کا بدلہ لے لیا۔ انہوں نے مجھے وہاں بلا کر اپنے سینے کی آگ کو بجھا لیا لیکن میں ابھی تک زندہ کیسے تھا؟ اجمل کے ابا نے تو سارا ریوالور مجھ پر خالی کر دیا، پھر ابھی تک مجھ میں جاں کیسے باقی تھی، میں سانس کیوں لے رہا تھا۔ میں ان لمحوں کی اس اذیت کو ابھی تک سہہ رہا تھا اور میری روح تھی کہ میرے تن کا ساتھ چھوڑنے کے لئے تیار ہی نہ تھی اور میں اس قدر اذیت میں جیسے ایڑیاں رگڑنے لگا دفعتاً میری آنکھ کھل گئی۔ آنکھ کھلتے ہی میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا، پسینے سے شرابور اب میں اپنے ہاتھوں سے اپنے سینے کو ٹٹولنے لگا۔ ابھی تو اجمل کے ابا نے گولیاں برسا کر میرے سینے کو چھلنی کیا تھا۔ ہوش میں آنے کے چند لمحوں تک بھی جیسے میں اس بھیانک خواب کی گرفت میں رہا۔

پھر کئی دن تک میں اس خیال سے کوسوں دور رہا کہ مجھے اپنے کسی سوال کے جواب کی خاطر اجمل کے ابا سے جا کر ملنا چاہئے، اسی دوران عدالتی کارروائی بھی مکمل ہو گئی اور مجھے اجمل کے قتل کی معافی مل جانے کی وجہ سے ہمیشہ کے لئے اس کیس سے بری کر دیا گیا۔ ابا کے الیکشن مزید قریب آ چکے تھے یہی وجہ تھی کہ ان کے دن رات اب اسی مہم جوئی میں گزرنے لگے تھے لیکن انہوں نے مجھے فی الحال اپنی سیاست سے الگ ہی رکھا تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ میں ان کے ہمراہ عوام کے سامنے جاؤں تو لوگ میرے ہاتھوں ہوئے قتل سے متعلق سوالات اٹھانے لگیں اور جس حادثے کو وہ عوام کی نظروں سے اوجھل رکھنا چاہتے تھے، ان کی یادداشت سے اسے مٹانا چاہتے تھے وہ میرے یوں سامنے آتے رہنے سے بار بار چرچے میں ہی رہتے۔ ابا کو فقط اپنے الیکشن کی پروا تھی میری اس وقت ذہنی حالت کیسی ہو رہی تھی اس بات کی تو گھر میں کسی کو بھی کوئی پروا نہ تھی۔ ماں، ابا کی سیاست میں برابر کی شریک تھیں۔ وہ خواتین کی نمائندگی کرتی، ابا کے ہمراہ رہتیں، بھائی کی شادی ہو گئی تھی اور بڑے ابا کی اب سنتا کون تھا۔ میں اپنے ہی آپ میں جیسے گُم کہیں بہت دور نکلتا چلا جا رہا تھا اور اس بات کا جیسے کسی کو ادراک ہی نہ تھا۔

یونہی خیالوں ہی خیالوں میں، میں کئی بار خود کو پھانسی پر لٹکا چکا تھا۔ یوں موت کا خوف دھیرے دھیرے میرے اعصاب سے اترنے لگا تھا اور پھر ایک روز میں گاڑی لئے اپنے اس سوال کا جواب جاننے کے لئے کہ آخر یہ کیسے ممکن تھا کہ جو شخص اب اس دنیا میں ہی نہیں اس نے مجھے معاف کر دیا، میں اجمل کی دکان پر جا پہنچا تھا۔ میں نے گاڑی دکان کے سامنے کھڑی کی اور جب میں گاڑی سے اترا تو چند گاہک دکان پر موجود تھے، میں ان کے جانے کا انتظار کرنے لگا۔ نہ جانے کیوں مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ سبھی کچھ ویسا ہی ہو رہا تھا جیسا میں نے خواب میں دیکھا تھا۔ یہ سوچتے ہوئے مجھے وہاں کھڑے کچھ وقت بیت گیا تو گاہک بھی اب اپنی ضروریات کی اشیاء لے کر جا چکے تھے۔ میں بھاری ہوتے قدم اٹھاتے آگے بڑھا جیسے میں سوچ رہا تھا کہ اجمل کے ابا اگلے ہی لمحے مجھ پر گولیاں برسا دیں گے، میں خوابوں کی تعبیر یا ان کی حقیقت سے بالکل بے خبر تھا لیکن اس رات دیکھے خواب سے خوفزدہ بھی بہت تھا۔ اب میں کاؤنٹر کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا۔ میں اجمل کے ابا کو سلام کہنا چاہتا تھا لیکن میرے ہونٹ ایک دوسرے میں پیوست اب ہلنے سے

بھی قاصر تھے۔ اجمل کے ابا مجھے اپنے سامنے کھڑا پا کر ایک دم سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے ہاتھ میں قرآن مجید تھا۔ انہوں نے اسے چوما اپنی آنکھوں سے لگایا اور ایک طرف کو رکھ دیا لیکن پھر وہ کاؤنٹر کی جانب جھکے نہ تھے۔

"کیوں، یہاں اس جگہ آتے ہوئے خوف آرہا تھا؟ بڑے دن لگا دیئے یہاں تک آنے میں، یہی وہ جگہ ہے ناں اسی جگہ جہاں میں کھڑا ہوں یہیں میرا اجمل کھڑا تھا، اس روز اور وہاں اس جگہ جہاں تم آج جیتے جاگتے کھڑے ہو اس روز بھی کھڑے تھے اور پھر تم نے میرے اجمل۔۔۔" وہ اپنے بیٹے کو یاد کرتے ہوئے جیسے اپنے آپ پر قابو نہ رکھ پائے تھے۔ میں انہیں کیا کہتا میں انہیں کیا دلاسہ دیتا۔ میں ان کے زخموں پر مرہم کیا رکھتا، میں ہی تو گھاؤ لگانے والا تھا۔ ان کی ایسی باتیں میرے وجود پہ بھی نشتر برسا رہی تھیں اور میں فقط سر کو جھکائے سنتا چلا جا رہا تھا۔ پھر وہ اپنے سامنے موجود کاؤنٹر کی طرف جھکے اور اسی لمحے مجھے لگا جیسے میرا سانس چلنا رک گیا تھا لیکن در حقیقت خوف سے میں نے خود ہی اپنا سانس اس لمحے روک رکھا تھا، مجھے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے اس رات دیکھا خواب اب بس سچ ہونے ہی والا تھا لیکن میں یہ دیکھ کر اب حیرت زدہ سا کھڑا تھا کہ اجمل کے ابا نے جب کاؤنٹر سے جھکے سر کو اٹھایا تو ان کے ہاتھ میں کوئی ریوالور نہ تھا، بلکہ ایک پرانا میلا سا گرد آلود اخبار تھا۔

"بڑی حیرت ہوئی تھی تمہیں یہ سن کر کہ اجمل تمہیں کیسے معاف کر سکتا ہے لیکن اب دیکھو اپنی آنکھوں سے دیکھو۔" انہوں نے یہ کہتے ہوئے اخبار کا رخ پلٹ کر میرے سامنے کر دیا۔ خون سے لکھا تھا۔ معاف اجمل کے دستخط کے ساتھ۔ میں جو ریوالور تانے اس کے سامنے کھڑا تھا پھر وہ ایک لمحے کا بھی کچھ وقت لگا ہو گا جب ٹریگر کے دبتے ہی خون کا ایک فوارہ اس کے وجود سے پھوٹ نکلا میں اس کا مجرم بھی اس کے سامنے کھڑا تھا وہ قاتل بھی اس کے سامنے کھڑا تھا جس نے ایک بے گناہ ہی نہیں بلکہ ایک معصوم انسان پر گولی چلا دی۔ اس کا قصور فقط اتنا ہی تھا ناں کہ اسے میرے منہ سے آتی شراب کی بو ناگوار گزری تھی اور اس نے مجھے حقارت سے دھتکارتے ہوئے وہاں سے چلے جانے کو کہا تھا اور میں نے اگلے ہی پل اس پر گولی چلا دی اور وہ میرے ہی بہائے خون کی بوندوں سے معاف لکھتا رہا، میں کس قدر حقیر تھا، اس نے ثابت کر دیا تھا۔ میں وہاں اجمل کے ابا کے سامنے اک پل مزید نہ ٹھہر سکا۔ میں لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ اپنی گاڑی کی جانب بڑھا اور میرے عقبی جانب سے ان کی آواز نے میرا پیچھا کیا۔

"میرے اجمل نے تمہیں معاف نہ کیا ہوتا تو میں خود اپنے ہاتھوں سے اپنے اجمل کا بدلہ لیتا، میں تمہیں کبھی معاف نہ کرتا، میں نے تمہیں معاف نہیں کیا بلکہ میرے اجمل نے تمہیں معاف کیا ہے۔" میں وہاں سے گاڑی لے کر گھر پہنچا اور سیدھا اپنے کمرے میں آ کر کنڈی لگا کر دیر تک روتا رہا اور میری نگاہوں کے سامنے وہی مناظر چلتے رہے جب میں نے اجمل پر گولی چلائی تھی کس قدر اذیت ناک وہ لمحے ہوں گے جب اپنے جسم کے گولی سے چھلنی ہوئے اعضاء سے رِستے خون اور ان کی تکلیف دہ ٹیسوں کی پروا کئے بغیر وہ اخبار کے ٹکڑے پر انگلی سے "معاف" لکھتا رہا اور پھر یہ بھی ثابت کرنے کے لئے کہ وہ معاف اس نے اپنے پورے ہوش و حواس میں لکھا تھا سامنے اپنے دستخط بھی دیئے۔ اس قدر ایذا دینے والے شخص کو اور اپنے ہی قاتل کو اپنی سانسوں کی ڈوری ٹوٹنے

سے پہلے وہ معاف بھی کر گیا۔ اجمل مجھے کیسے معاف کر سکتا تھا یارب اس نے مجھے معاف کیوں کیا؟ میرے ذہن میں یہی سوال بار بار اٹھتا رہا میں جو رو رہا تھا تو پھر قہقہے لگانے لگا اجمل نے مجھے معاف کر دیا، اپنے ہی قاتل کو معاف کر دیا۔ میں نے جو اس پر گولی چلائی تھی اس کے ماں ابا سے ان کا جواں سالہ اکلوتا بیٹا چھین لیا اس کی بہنوں سے ان کا اکلوتا بھائی چھین لیا اور اجمل نے مجھے معاف کر دیا لیکن اجمل نے مجھے کیوں معاف کیا؟ اسی سوال کو دہراتے دہراتے میں سو جاتا اور جب اٹھتا تو میرے لبوں پر یہی کلمات ہوتے۔ مجھے اجمل کے ابا نے معاف نہیں کیا بلکہ مجھے اجمل نے معاف کیا ہے، لیکن اجمل نے مجھے معاف کیوں کیا، میں تو اس کا قاتل تھا، اس کا مجرم تھا پھر اس نے مجھ پر یہ احسان کیوں کیا؟

ایسے ہی کئی دن تک سورج طلوع اور غروب ہوتا رہا اور میں اسی حالت میں اپنے کمرے میں پڑا رہا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا رہا میں شعور سے اپنے لاشعور میں جا اترا اور وہاں بھی یہی سوال مجھے ستاتا رہا۔ ابا الیکشن کی تیاریوں میں مگن شہر شہر گھومتے رہے ماں اور بھائی بھی ان دنوں ابا کے ساتھ ہی رہتے ایسے میں کسی کو میرا خیال ہی نہ گزرا کہ میں کہاں ہوں، کس حال میں ہوں، ایک روز بڑے ابا کو جو میرا خیال آیا تو وہ میرے کمرے کی طرف آئے اور پھر جب میں نے آنکھ کھولی تو اپنے پاس سب سے پہلے جسے دیکھا وہ بڑے ابا ہی تھے۔ نہ جانے کتنے ہی روز بعد میں آج ہوش میں آیا تھا اور میرے لبوں پر وہی کلمات تھے۔ ''مجھے۔۔۔ اجمل کے ابا نے۔۔۔ معاف ۔۔۔ نہیں کیا۔۔۔ بڑے ابا۔۔۔ مجھے اجمل نے۔۔۔ معاف کیا ہے۔'' وہ میرے ٹوٹے پھوٹے الفاظ سن کر میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لئے رو پڑے۔ ''مجھے بڑے ابا۔۔۔ اجمل نے معاف کیا ہے۔'' بڑے ابا نے اگلے ہی پل بے اختیار مجھے اپنے سینے سے جو لگایا تو میں اپنے خشک حلق سے نکلتی گھٹی گھٹی آواز میں رو رہا تھا پھر بڑے ابا کی آواز مجھے جیسے کہیں دور کنوئیں کی گہرائی سے آتی محسوس ہوئی۔ میں نیم بے ہوشی میں انہیں ڈاکٹر کو پکارتا ہوا سنتا رہا اور پھر بے ہوش ہو گیا اور جب پھر دوبارہ مجھے ہوش آیا تو گھر کے سبھی لوگ میرے ارد گرد موجود تھے۔ اپنے بازو میں درد محسوس کرنے پر میں نے اپنے بائیں جانب دیکھنے کی کوشش کی تو مجھے احساس ہوا کہ مجھ میں اتنی سکت بھی نہ بچی تھی کہ میں اپنا سر ہی ہلا پاتا۔ بڑی مشکل سے جو میں نے اپنی گردن کو ذرا سا خم دیا تو مجھے پتا چلا کہ بازو پر لگی ڈرپ سے مجھے خون دیا جا رہا تھا۔ میری نظر جو خون کی بوتل پر پڑی تو ایک دم سے وہ اخبار کا وہی ٹکڑا بن گئی جس پر اجمل نے مرنے سے پہلے اپنے خون سے معاف لکھا تھا۔ مجھے لگا میرے جسم میں قطرہ قطرہ اترنے والا خون اسی اخبار میں سے ٹپ ٹپ گر رہا تھا۔ میں نے ذرا اپنے جسم کو ہلانے جلانے کی کوشش کی لیکن میں ایسا نہ کر سکا، میرے لب جواب کانپتے ہوئے ہلنے کی جستجو میں تھے۔ میں ان سے یہی کہنا چاہتا تھا کہ مجھے اجمل کے ابا نے معاف نہیں کیا، مجھے اجمل نے معاف کیا ہے۔ ان دنوں بڑے ابا دن رات میرے سرہانے بیٹھے رہتے اور مجھے ذرا ہوش آتا تو وہ مجھ سے باتیں کرنے لگتے، میں جو بھی بولتا وہ میری ہر بات سنتے اور مجھے تسلیاں دیتے رہتے۔ ان کی اللہ کے حضور گڑ گڑا کر مانگی دعاؤں اور تیمارداری سے میں جلد ہی اٹھنے بیٹھنے کے قابل ہو گیا تھا۔ وہ میرے پاس بیٹھ کر قرآن کی تلاوت کرتے اور پھر مجھ پر پھونکوں سے دم کرتے رہتے، جلد ہی میں ہسپتال سے گھر منتقل ہو گیا تھا۔

الیکشن اب قریب آ چکے تھے۔ بڑے ابا کے علاوہ گھر کے سبھی لوگ ان دنوں بے حد مصروف تھے۔ گھر سے ملحقہ ہی الیکشن سیل تھا لیکن اب الیکشن کے قریبی دنوں میں گھر بھی الیکشن سیل بنا ملاقات کے لئے آئے حضرات سے بھرا رہتا تھا۔ بڑے ابا جو تیمار داری کے لئے ہمہ وقت میرے پاس کمرے میں ہی رہتے تھے اور فقط ایک مخصوص وقت میں ہی وہ مجھے اپنے ساتھ چہل قدمی کے لئے لے جاتے تھے۔ ایک روز یوں ہوا کہ وہ کافی دیر تک کمرے میں میرے پاس نہ آ سکے۔ وہ مجھے سوتا چھوڑ کر چلے گئے تھے لیکن ان کے جانے کے بعد جو میری آنکھ کھلی تو پھر مجھے نیند نہ آ سکی، میں جو اٹھ بیٹھا تھا تو کچھ دیر دائیں بائیں دیواروں سے ہی باتیں کرتا رہا۔ اب مجھے کمرے میں گھٹن محسوس ہونے لگی تھی۔ میرے قریب کوئی بھی نہ تھا اور میرے لبوں پہ یہی کلمات تھے کہ۔۔۔ مجھے اجمل کے ابا نے معاف نہیں کیا، وہاں اس وقت مجھے تسلی دینے والا کوئی نہ تھا شاید اسی لئے میں نے دروازہ کھولا اور پھر راہداری میں سے ہوتا ہوا جو کھلے صحن میں پہنچا تو سامنے لان میں میری نظر اپنے ابا پر پڑی وہ اس وقت الیکشن کے سلسلے میں آئے اپنے چند خاص مہمانوں سے ملاقات کر رہے تھے۔ ان میں سے چند ایک شہر کی مشہور شخصیات تھیں۔ اپنے ابا پر نظر پڑتے ہی میں تیز تیز قدم بھرتا ان کے پاس جا پہنچا۔ وہاں پہنچتے ہی میں زور زور سے چلانے لگا۔ "ابا۔۔۔ ابا میں آپ کو بتانے آیا ہوں کہ مجھے اجمل کے ابا نے معاف نہیں کیا۔" یہ سنتے ہی میرے ابا کے ساتھ وہاں بیٹھے سبھی لوگ حیرت سے مجھے تکتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ "ابا مجھے بتانا ہے، مجھے بتانے دو۔" ابا میرا بازو تھامے مجھے وہاں سے میرے کمرے کی طرف لے جانا چاہتے تھے۔ میں نے ایک جھٹکے سے اپنا بازو چھڑایا۔

ابا! مجھے اجمل نے معاف کیا، انکل آپ کو پتہ ہے، مجھے کس نے معاف کیا۔۔۔؟ مجھے اجمل نے معاف کیا ہے۔۔۔ ابا مجھے اجمل نے" معاف کیا ہے۔۔۔ مجھے اجمل کے ابا نے معاف نہیں کیا۔" ابا جو میری ایسی حالت کو لوگوں سے پوشیدہ رکھنا چاہتے تھے۔ میں ان کے لئے شرمندگی کا باعث بن رہا تھا۔ ابا کے ساتھ ساتھ اب چند ملازم بھی آ گئے، وہ سبھی مل کر اب مجھے دیکھتے ہوئے میرے کمرے کی طرف لے جا رہے تھے اور میں تھا کہ ان کے قابو میں ہی نہ آ رہا تھا۔ میں ان کی گرفت سے آزاد ہو کر پھر سے ابا کے مہمانوں سے جا مخاطب ہوتا اور وہ میری ایسی حالت دیکھ کر ایک دوسرے سے چہ میگوئیاں کر رہے تھے پھر یہ شور سن کر کہیں سے بڑے ابا وہاں آن پہنچے اور وہ مجھے تسلیاں دیتے میری باتوں کا جواب دیتے ہوئے مجھے میرے کمرے میں لے آئے۔ ڈاکٹر اب گھر پر ہی میرے علاج کے لئے مامور تھے، میرے کمرے میں پہنچنے کے کچھ دیر بعد ہی ڈاکٹر صاحب نے مجھے انجکشن لگایا تو اس کے زیر اثر مجھ پر نشہ سا طاری ہونے لگا اور یوں میں پھر سے غنودگی میں اترنے لگا۔ ایسی ہی حالت میں پھر کئی دن گزر گئے اور مجھے پتہ ہی نہ چلا جب انہی دنوں میں ابا کے الیکشن ہار جانے کی وجہ سے سارے گھر پر جیسے پژمردگی سی چھا گئی تھی۔ ابا نے یہ الیکشن جیتنے کے لئے اپنا روپیہ پیسہ اور دن رات لگا دیئے تھے لیکن کامیابی اس بار کسی اور کا مقدر تھی۔

میرے ہاتھوں ہونے والے قتل اور پھر میڈیا میں جس طرح سے اسے اچھالا گیا تھا، یہ بھی ابا کی ہار میں ایک بڑی وجہ ثابت ہوا تھا پھر میری دماغی حالت کے بگڑنے سے بھی ان کی ساکھ متاثر ہوئی تھی۔

بڑے ابا کی دیکھ بھال اور اعلیٰ ترین ڈاکٹرز کی خدمات سے میری حالت روز افزوں بہتر ہو رہی تھی اور پہلے جو میں ایک ہی بات کو دہراتا رہتا تھا اب اس کی جگہ خاموشی نے لے لی تھی لیکن ایسا نہ تھا کہ اب میں کچھ سوچتا نہ تھا بلکہ ظاہراً دکھائی پڑتے سکوت کے پیچھے دراصل ایک تلاطم بپا تھا۔

اکثر میں بیٹھا سوچتا کہ قانون اگر مجھے کوئی سزا دیتا تو وہ میرے لئے سزائے موت ہوتی، پھانسی کے پھندے سے جھول کر چند لمحے میرے پیر ہوا میں جھولتے اور میں چاہتا کہ مجھے کوئی سہارا مل جائے، کوئی فرش میرے ہوا میں لہراتے پیروں تلے آجائے، جو مجھے ان لمحوں کی اذیت سے بچالے اور اسی کشمکش میں میری گردن یوں لمبی ہو جاتی اور پھر میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہر قسم کی اذیت سے آزاد ہو جاتا، لیکن اجمل نے میرے لئے جس سزا کا انتخاب کیا تھا، وہ اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے ہر ہر لمحہ سزائے موت تھی۔ قانون مجھے فقط ایک سزائے موت دیتا، لیکن اجمل میرے لئے چوبیس گھنٹوں کے حساب سے ایک ایک پل میں سینکڑوں سزائے موت منتخب کر گیا تھا۔ سانس لیتے ہوئے ہر ہر پل مرنا کس قدر تکلیف دہ چیز ہوتی ہے۔ اس اذیت کو سہتے ہوئے کبھی میرا جی چاہتا میں خود پھانسی لے لوں یا اجمل کے ابا کے پاس جاؤں اور ان سے کہوں کہ وہ مجھے اپنے بیٹے کی موت کے بدلے اپنے ہاتھوں سے مار دیں۔ اسی ارادے سے ایک روز میں ان کے پاس جا پہنچا لیکن پھر اجمل کے ابا میرے سامنے اخبار کا وہی گرد آلود ٹکڑا لے آئے جس پر اجمل سانسوں کی ڈوری ٹوٹنے سے پہلے اپنے خون سے معاف لکھ گیا تھا۔

اس سارے عرصے میں داؤد اور عبیرہ نے ایک بار بھی مجھ سے ملنے کی کوشش نہ کی تھی۔ داؤد کو تو میں اسی روز پہچان گیا تھا جب وہ مجھے تنہا چھوڑ کر جیپ اسٹارٹ کر کے فرار ہو گیا تھا لیکن نہ جانے کیوں مجھے عبیرہ کو لے کر ایک امید باقی تھی کہ ہو سکتا ہے، میری چاہت کا ابھی کوئی اثر اس میں باقی ہو، پھر اپنے درد کو ذہنی اضطراب کو بیان کرنے کے واسطے میں نے عبیرہ سے ملنے کی کوشش کی۔ پہلے تو میں فون کرتا رہا لیکن اس کا نمبر بند ملا اور پھر جب اس سے اس کے گھر جا کر ملنے کی کوشش کی تو مجھے جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ بھی داؤد کے ساتھ مل چکی تھی اور پھر میرے درد میں جب عبیرہ کی بے وفائی کا درد بھی آملا تو میں ایک دم سے بکھر گیا، میری اب کی بار جو حالت بگڑی تو ہر گزرتے دن کے ساتھ ساتھ بگڑتی ہی چلی گئی۔

شہر کے ایک بڑے ہسپتال کے وی آئی پی روم میں میرے بے حس و حرکت پڑے وجود میں ڈرپس لگائی جاتی رہیں، ہر روز نیا ٹیسٹ ہوتا اور اس ٹیسٹ رپورٹ کا رزلٹ نیگیٹو ہی ملتا۔ ڈاکٹر مجھے لاحق مرض کو کھوجنے میں ناکام ہو چکے تھے۔ پھر بھی مجھے بہتر نگہداشت کے لئے ہسپتال سے گھر منتقل نہیں کیا گیا تھا اور جیسی میری حالت تھی ایسے میں ڈاکٹر مجھے چلے جانے کی اجازت بھی نہ دے سکتے تھے۔ میرے ابا جو میرے علاج کے لئے روپیہ پیسہ پانی کی طرح بہا رہے تھے اب مجھے علاج کی خاطر بیرون ملک لے

جانے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن ڈاکٹر حضرات نے انہیں یہی مشورہ دیا کہ اب اس حالت میں مجھے علاج کے لئے بیرون ملک لے جانے میں میری جان کو خطرہ ہو سکتا ہے۔ یہی وہ دن تھے جب بابا عبد القادر ایک روز بڑے ابا سے ملے اور انہیں بتایا کہ وہ ایک اللہ والے کو جانتے ہیں جن کے پاس بڑی تعداد میں خلقِ خدا آتی ہے اور وہ جس کے لئے دعا فرما دیتے ہیں، اللہ اسے شفا عطا کر دیتا ہے۔ بابا عبد القادر بڑے ابا سے یہ کہتے ہوئے رو پڑے۔ بچپن سے انہوں نے اپنے ہاتھوں سے ہم دونوں بھائیوں کو پالا پوسا تھا۔ اب مجھے یوں موت کے منہ میں جاتا دیکھ کر وہ اپنے جذبات پہ قابو نہ رکھ پائے تھے۔ بابا عبد القادر کی بات بڑے ابا کے دل کو لگی تھی۔ جہاں انہوں نے ہر طرح کے علاج آزما لئے اور بہتری کی کوئی امید نظر نہ آتی تھی اب یوں بابا عبد القادر کے کسی اللہ والے کا نام لینے پر جیسے ان کے دل میں ایک امید کی کرن جاگی تھی۔

پہلے وہ مجھے ہسپتال سے گھر لے آئے اور جب مجھے گھر منتقل کیا گیا تو گھر کے لوگوں کی حالت ایسی تھی جیسے ہسپتال سے میری لاش گھر پہنچی ہو۔ ماں اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ پائی تھیں۔ بھائی، بھابی، ابا، عبد القادر، مائیکل، بڑے ابا سبھی میری قریب المرگ حالت کو دیکھ کر یوں رو پڑے جیسے انہیں میرے بچنے کی اب کوئی امید دکھائی نہ دے رہی تھی۔ مجھے یہ سب یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں بے حس و حرکت پڑا خواب میں لاشعوری کیفیت میں یہ سب دیکھ رہا تھا۔ جیسے میرے ذہن کے سلولائیڈ پر یہ سبھی خاکے پرچھائیوں کی طرح ابھر رہے تھے۔

بڑے ابا نے سبھی کو دعا کرنے کو کہا اور انہیں بتایا کہ وہ مجھے کسی اللہ والے کے در پر لے جا رہے تھے۔ مجھے اسٹریچر پر ڈال کر گاڑی میں سوار کیا گیا اور جاتے جاتے بڑے ابا نے اماں سے ایک بار پھر کہا کہ وہ میرے لئے دعا کریں، ایسا کہتے ہوئے بڑے ابا بھی جیسے آبدیدہ ہو گئے تھے۔ سفر لمبا تھا اور یوں وہ ماں کو ساتھ لے جانا نہیں چاہتے تھے ابا اور بھائی کو بڑے ابا نے اس لئے روک دیا تھا کہ وہ اللہ والے کے در پر فقیروں کے بھیس میں جانا چاہتے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ابا اور بھائی بڑی بڑی عالیشان گاڑیوں میں لمبی قطاریں بنا کر ان کے ہمراہ چلیں۔

پھر جو سفر کا آغاز ہوا اور ایک طویل سفر کے بعد ہم اپنی منزل مقصود پر پہنچے تو میرے اسٹریچر کو بابا رب نواز کے حجرے سے باہر کھلے صحن میں رکھ دیا گیا۔ وہاں پڑے کچھ ہی لمحوں میں مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے وجود میں جل رہی آگ ایک دم سے سرد پڑ گئی ہو۔ دفعتاً میری قوت سماعت سے کچھ آوازیں ٹکرائیں۔ "باباجی آ گئے۔۔۔ باباجی آ گئے۔" میں نے جیسے ہی یہ آوازیں سنیں نہ جانے کہاں سے ایک ایسی لاہوتی خوشبو میرے نتھنوں سے داخل ہو کر میرے دل و دماغ میں سکون و راحت کی ایسی اتھاہ گہرائیوں میں جا اتری جو میرے بیان سے باہر تھیں۔

مجھے نہیں یاد کہ بابا رب نواز میرے سرہانے کھڑے کیا پڑھ کر دم کرتے رہے، جب میری آنکھ کھلی اور میرے لب ہلے تو میری زبان پر وہی کلمات تھے۔ "اجمل نے مجھے معاف کیوں کیا؟" بڑے ابا مجھے اپنے بازوؤں کے سہارے اٹھا کر بٹھائے ہوئے تھے اور جو

ہستی میرے روبرو براجمان تھی ان کے لبوں پر اک ایسی ملکوتی مسکراہٹ تھی جسے دیکھتے ہی میں ایک دم سے یوں دھاڑیں مارے رونے چلانے لگا تھا اور میرے لبوں پر وہی کلمات تھے۔ ''کہ اجمل نے مجھے معاف کیوں کیا؟'' بابا رب نواز دھیرے سے ذرا سے میرے قریب آئے اور میرے سر پر ہاتھ رکھ کر آہستہ سے جو کلمات انہوں نے کہے میں انہیں سن کر یوں چپ ہو گیا جیسے کسی سوالی کی جھولی یوں بھر دی گئی ہو کہ پھر وہ آسودہ حال ہو کر لوٹا دیا گیا ہو۔

''بہت بھوک لگ رہی ہو گی میرے بچے۔'' انہوں نے بدستور مسکراتے ہوئے یوں اپنائیت سے میری جانب دیکھ کر کہا اور ساتھ ہی اپنے کسی شاگرد کو آواز دی اور وہ وہیں سے اپنے ہاتھ میں ایک مٹی کا کوزہ لے کر حاضر ہو گیا۔ بابا رب نواز نے اپنے ہاتھوں سے اس پر بندھے کپڑے کو ہٹایا۔ ''لو میاں کھاؤ بھوک بھی مٹ جائے گی اور کمزوری بھی رفع ہو جائے گی۔'' میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ ان کے ہاتھ سے مٹی کا کوزہ لیا، بھوک اس قدر شدید تھی کہ کوزہ گود میں رکھتے ہی میں نے ہاتھ کوزے میں ڈالا، ٹھنڈی خوشبودار فرنی جیسی کوئی چیز جو میرے ہاتھوں کو لگی تو میں اپنے ارد گرد کے ماحول سے بے نیاز ہو کر اسے کھانے میں جت گیا۔ چہرے اور کپڑوں کی پروا کئے بغیر میرا ہاتھ اس وقت ہی رکا جب کوزہ پوری طرح سے خالی ہو چکا تھا اور میں اپنی انگلیوں کو چوستے ہوئے صاف کر رہا تھا۔ وہ طہٰ عالم جو کانٹی نینٹل کھانوں کا عادی تھا اور پھر کھاتے ہوئے کیا مجال جو ہاتھ کھانے کو چھو تا کانٹے، چاقو اور ٹشو کا استعمال کس ناز و انداز سے کرتا تھا آج وہی طہٰ عالم بابا رب نواز کے حجرے سے باہر کھلے صحن میں مٹی کے کوزے میں ہاتھ ڈالے فرنی کھاتے ہوئے اپنے ہاتھوں کو زبان سے صاف کر رہا تھا۔ بڑے بڑے عظیم و عالیشان محلات میں رہنے والوں اور بڑی بڑی گاڑیوں میں گھومنے والوں کو بھی رب العزت کو انسان ہونے کا احساس دلانا اچھے سے آتا ہے۔ اپنی زبان سے انگلیاں صاف کرتے ہوئے میں نے پہلی بار اپنے گرد و نواح پر ایک نظر دوڑائی فقط میں ہی اسٹریچر پر موجود نہ تھا بلکہ میرے ارد گرد سینکڑوں لوگ موجود تھے سبھی کھلے صحن میں فرش پر بیٹھے تھے، میری نظر بڑے ابا پر پڑی وہ میرے عقب میں ہی کھڑے تھے اور ان کے ہمراہ بابا عبدالقادر بھی موجود تھے۔ انہوں نے اشارتاً میرا حال دریافت کیا۔ انہیں دیکھ کر مجھے یوں لگا کہ وہ مجھے بھلا چنگا بیٹھا دیکھ کر خوشی سے اپنے اوپر قابو نہ رکھ پائے تھے۔ میں اٹھنا چاہتا تھا بڑے ابا اور بابا عبدالقادر دونوں آگے بڑھے، میں آج کئی روز بعد اپنے پیروں پر یوں کھڑا ہو سکا تھا اور اب بے اختیار روتے ہوئے کبھی بڑے ابا تو کبھی بابا عبدالقادر کے گلے لگ جاتا تھا۔ یونہی کافی دیر تک میں روتا رہا۔

ہم لوگ یہاں عصر کے بعد پہنچے تھے اور اب سورج غروب ہو رہا تھا۔ آج میرے زوال کا یہ آخری سورج غروب ہو رہا تھا۔ آج مجھے اپنے سوال کا جواب مل گیا تھا، بڑے ابا کہنے لگے کہ بابا جی کا پیغام ہے کہ میں ابھی سے نماز بھی شروع کر دوں۔ اب مغرب کا وقت ہونے والا تھا۔ بڑے ابا اپنے ساتھ میرے چند کپڑے بھی لائے تھے۔ فرنی کھاتے ہوئے میرے کپڑے خراب ہو چکے تھے۔ میں نے لباس تبدیل کیا اور پھر بڑے ابا اور بابا عبدالقادر کے ساتھ میں نے بھی وضو کرنے کے بعد بابا رب نواز کے ساتھ جماعت کے

ساتھ ادا کی۔ مجھے اس روز ادا کی نماز کا ایک ایک سجدہ زندگی بھر نہیں بھول سکتا۔ میرے احساسِ ندامت سے بہائے آنسوؤں نے مجھے یوں سر تاپا بھگو ڈالا تھا اور سلام پھیرتے ہی میں خود کو یوں ہلکا محسوس کرنے لگا تھا جیسے منوں بھاری کوئی بوجھ میرے دل و دماغ سے اتر گیا ہو۔

دفعتاً میرے کانوں سے ریل گاڑی کی چیختی چنگھاڑتی آواز ٹکرائی۔ ٹرین پلیٹ فارم چھوڑتے ہوئے دھیرے دھیرے آگے نکل چکی تھی۔ یومنہ میرے ساتھ بینچ پر بالکل خاموش بیٹھی تھی۔ نہ ہی وہ ٹرین کے چھوٹ جانے پر بوکھلا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور نہ ہی میں اپنی جگہ سے ہلا تھا۔ ہم دونوں ہی کچھ وقت تک چپ چاپ خاموشی سے اپنی جگہ پر بیٹھے رہے، جیسے ابھی تھوڑی دیر پہلے ہم برسوں کے سفر سے لوٹے تھے اور کچھ وقت کے لئے پاؤں پسار کر ذرا استراحت کو بیٹھے تھے۔

یومنہ آپ کی ٹرین تو چھوٹ گئی۔" اب کی بار میں جو یومنہ سے مخاطب ہوا تو وہ یوں بوکھلا کر میری جانب متوجہ ہوئی اسے وہیں اسی" حالت میں بیٹھا چھوڑ کر میں یہ پتہ کرنے نکل گیا کہ اگلی ٹرین کی روانگی کن اوقات میں ہوگی پھر پتہ کرنے پر مجھے معلوم ہوا کہ آج کے دن جہانیاں آباد کے لئے یہ ٹرین کی روانگی کا دوسرا وقت تھا اور اب اگلی ٹرین کی روانگی چھ سے آٹھ گھنٹوں کی تاخیر سے ہوگی۔ جسے سن کر مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ میں جو اپنا یادوں کا پٹارا کھولے بیٹھ گیا تھا تو میری وجہ سے یومنہ کی ٹرین چھوٹ گئی اور اب واپس اسی جانب بڑھتے ہوئے جہاں بینچ پر یومنہ بیٹھی میرا انتظار کر رہی تھی، میں سوچ رہا تھا کہ اب کیا ہونا چاہئے؟ میری وجہ سے جو اس کی ٹرین چھوٹی تھی تو اب مجھے ہی اس مسئلے کا کوئی حل نکالنا تھا۔ چھ سے آٹھ گھنٹے اب ہم یہیں اسٹیشن پر نہیں گزار سکتے تھے اور واپس لوٹ جانے کا خیال بھی مجھے مناسب نہ لگا تھا اور جب میں یومنہ کے پاس پہنچا، میں فیصلہ کر چکا تھا کہ میں خود اپنی گاڑی پر اسے جہانیاں آباد تک چھوڑنے جاؤں گا۔

اس کے پاس پہنچ کر میں نے اسے اگلی ٹرین کی روانگی کا وقت بتایا اور ساتھ ہی اپنی تجویز پیش کی تو میری بات سن کر جیسے وہ میری تجویز پہ غور کرنے لگی تھی۔ اسے یونہی خیالوں میں گم چھوڑ کر میں گاڑی کی جانب بڑھا اس کا سامان ابھی تک میری گاڑی میں ہی رکھا تھا۔ میں نے گاڑی اسٹارٹ کر کے ہارن بجایا تو وہ گویا چونکتے ہوئے گاڑی کی جانب بڑھی اور بنا بات کئے پچھلا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی اور میں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ چھ سے آٹھ گھنٹے کی تاخیر سے اگلی ٹرین نے روانہ ہونا تھا جبکہ یہاں سے جہانیاں آباد چار سے پانچ گھنٹے کی مسافت پر تھا۔

اب میں گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے یہی سوچ رہا تھا کہ نہ جانے میرے ماضی کی داستان سن کر یومنہ میرے بارے میں کیا سوچتی ہو گی۔ وہ اب سے پہلے سنی سنائی باتیں ہی سنتی آئی تھی اب میری زبانی میرا ماضی جان کر اسے کیسا لگا ہو گا، پھر میں نے سوچا میں اس سے پوچھوں کہ اسے میری ساری داستان سننے کے بعد مجھ سے خوف تو محسوس نہیں ہو رہا، لیکن میں نے محسوس کیا کہ جیسے وہ پچھلی نشست پر بیٹھی بیٹھی سو چکی تھی۔ مجھے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے دو سوا دو گھنٹے ہو رہے تھے لیکن اس بیچ اس نے کوئی بات نہ کی تھی۔

آگے بڑھتے ہوئے ایک جگہ پٹرول ڈلوانے کی غرض سے میں نے جو بریک لگائی تو مجھے اس کا سوال سن کر اس کی موجودگی کا احساس ہوا۔ وہ اس جگہ کا نام پوچھ رہی تھی جس جگہ ہم اس وقت کھڑے تھے۔ میں نے اسے جگہ کا نام بتایا اور اسے کہا کہ ہم گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے تک اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ جائیں گے۔ پٹرول ڈلوانے کے بعد میں اس کے لئے پٹرول پمپ سے ملحقہ کینٹین سے کچھ کھانے پینے کی اشیاء خرید لایا اور پھر خود بھی ایک ٹن پیک کھول کر پیتے ہوئے میں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ گھنٹے ڈیڑھ کے اندر ہی میں یومنہ کے گاؤں جہانیاں آباد میں داخل ہوا تو مجھے اس سے یہ پوچھنے کی ضرورت نہ تھی کہ چچا کا یہاں گھر کون سا تھا۔ چچا کی کئی ایکڑ پر پھیلی حویلی گاؤں میں داخل ہوتے ہی دور سے ہی دکھائی پڑتی تھی۔

یومنہ سے بڑی آمنہ کا جو ماں نے رشتہ لینے سے انکار کر دیا تھا تو اس سے بھی پہلے میرے ابا اور چچا کے کچھ اختلافات موجود تھے شاید اسی لئے انہوں نے بیٹی کے رشتہ سے ہی پرانی رنجشوں کو مٹانے کی کوشش کی تھی لیکن تب ماں نے اس رشتے سے انکار کر دیا تھا تو تعلق پھر سے پرانے انداز سے ہی آگے بڑھتے رہے۔ میں نے گاڑی گھر سے پہلے کچھ فاصلے پر ہی روک دی اور یومنہ سے کہا کہ وہ اب مجھے اجازت دے۔ میری یہ بات سنتے ہی جو وہ پہلے سارا راستہ چپ چاپ بیٹھی رہی تھی اب ایک دم سے غصے سے پھٹ پڑی اور تب تک اس نے گاڑی سے نیچے قدم نہ رکھا جب تک میں نے گھر چلنے کے لئے ہامی نہ بھر لی۔ لامحالہ میں نے گاڑی آگے بڑھا تو دی لیکن میں سوچتا رہا کہ جانے چچا مرزا میرے یوں غیر متوقع طور پر یومنہ کو چھوڑنے کے لئے آنے پر کیسا محسوس کریں گے اور پھر اگلے ہی لمحے نے مجھے احساس دلا دیا کہ میں نے یومنہ کو گھر چھوڑنے کے لئے آنے میں کتنی بڑی غلطی کر دی تھی۔ گھر پر اس وقت صرف چچا اور چچی ہی تھے۔ میرے اپنے سگے چچا سے زیادہ اخلاق سے تو مجھے چچی ملی تھیں۔ انہوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا، مجھے دعا دی اور چچا یومنہ کو ساتھ لئے آگے بڑھتے ہوئے جو سرزنش کر رہے تھے تو وہ دبی دبی آوازیں میرے کانوں نے واضح سنی تھیں، وہ بار بار اس سے یہی پوچھ رہے تھے کہ وہ ٹھیک تو ہے اور اگر اس کی ٹرین چھوٹ ہی گئی تھی تو اسے گھر سے اس کا کوئی بھائی لینے آ جاتا، ایسی کیا مصیبت آن پڑی تھی اگلے روز بھی آیا جا سکتا تھا، میں چچی کے ساتھ ساتھ کچھ فاصلے پر ہی چچا اور یومنہ کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا اور میرا جی اس وقت یہی چاہ رہا تھا کہ میں الٹے پیروں یہاں سے لوٹ جاؤں لیکن میں فقط یومنہ کا دل رکھنے کی خاطر یہ سب برداشت کرتا رہا۔ چچی نے مجھے ایک ملازم کے ساتھ ایک طرف مہمان خانے کی جانب بھیج دیا۔ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بے حد شرمندہ لگ رہی تھیں۔ وہ جان گئی تھیں کہ یومنہ اور چچا کے بیچ ہونے والی باتیں میں نے سن لی تھیں پھر وہ خود بھی چچا اور یومنہ کے ساتھ چلی گئیں اور میں ملازم کے ساتھ مہمان خانے میں چلا آیا۔ مستطیل نما ایک لمبے ہال میں دو بستر لگے تھے جن میں سے ایک پر بیٹھتے ہی بیزاری سے میں اٹھ کھڑا ہوا اور اب کمرے میں ایک سرے سے دوسرے سرے کی طرف ٹہلتے ہوئے مجھے تھوڑا ہی وقت گزرا تھا جب میرے دونوں چچا زاد بھائی اور ایک ملازم ہاتھوں میں ٹرے اٹھائے اندر داخل ہوئے۔

"لاؤ بھئی پانی دو مہمان کو۔" اندر داخل ہوتے ہی فرزند نے کہا اور پھر فرزند اور دلدار دونوں بھائیوں نے مجھ سے مصافحہ کیا اور گھر کے لوگوں کا حال پوچھنے لگے۔ وہ دونوں بھائی مجھ سے عمر میں چھوٹے تھے لیکن شاید گاؤں کے ماحول کا اثر تھا یا بے فکری کی زندگی نے انہیں کچھ اس طرح سے بڑھا پھیلا دیا تھا کہ وہ عمر میں مجھ سے بڑے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ میرے سگے چچازاد تھے لیکن آج برسوں بعد میں ان سے مل رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ دوریاں، مسافتیں فاصلے چاہے کتنے ہی طویل کیوں نہ ہوں اگر دلوں میں سچا خلوص ہو تو یہ دوریاں، مسافتیں، فاصلے کوئی معنی نہیں رکھتے لیکن اگر دلوں میں ہی نفرتوں کی فصلیں کھڑی کر رکھی ہوں تو قربتیں بھی ان فصیلوں کو پھلانگ کر دلوں تک نہیں پہنچ سکتیں۔

ان کے رویے سے اگر مجھے یہ احساس ہو رہا تھا کہ انہیں مجھ سے مل کر کوئی کسی قسم کی خوشی محسوس نہ ہوئی تھی تو مجھے بھی ان کے درمیان بیٹھ کر کوئی بہت اچھا محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ میں ان سے واپسی کے لئے کسی محفوظ راستے کے بارے میں دریافت کرنے لگا جسے سن کر دلدار نے بتایا کہ رات ہوتے ہی یہ علاقے بالکل غیر محفوظ ہو جاتے ہیں۔ یوں میرے لئے اب فوراً واپسی کے دروازے بند ہو گئے تھے اور میرا جی وہاں اک پل ٹھہرنے کو نہ چاہ رہا تھا۔ میں ان دونوں بھائیوں کے ساتھ بیٹھا بھی جیسے گھٹن محسوس کر رہا تھا۔ جب ایک ملازم کھانا لے آیا۔ فرزند اور دلدار دونوں نے کھانا میرے ساتھ ہی کھایا اور کچھ دیر مزید بیٹھ کر وہ چلے گئے۔ کھانے کے بعد میں کافی دیر تک جاگتا رہا کہ ہو سکتا ہے کہ چچا، چچی یا یومنہ میں سے کوئی مجھے وہاں ملنے چلے آئیں لیکن جب کافی دیر تک وہ نہیں آئے تو میں سونے کی غرض سے لیٹ گیا۔ ایک طویل سفر طے کر کے آنے کے باوجود مجھے وہاں چچا کی حویلی کے اس لمبے مستطیل نما کمرے میں نیند نہیں آ رہی تھی۔ ٹھہر ٹھہر کر مجھے یومنہ کا خیال آنے لگا کہ چچا یومنہ سے خفا ہو رہے ہوں گے میں جانتا تھا کہ چچا مجھے کوئی اچھا انسان نہیں سمجھتے تھے۔ وہ یہ سوچتے تھے کہ میں ایک قاتل ہوں اور ایک قتل جیسے فعل کے مرتکب مجرم کے ساتھ وہ اپنی بیٹی کا اٹھنا بیٹھنا کبھی گوارا نہ کر سکتے تھے۔ ان کے پھر مجھ سے ملنے نہ آنے کے پیچھے بھی یہی وجہ تھی۔

چچا طبیعت کے کچھ زیادہ ہی سخت واقع ہوئے تھے فقط آمنہ کے رشتے کی وجہ ہی ہمارے خاندانوں کے درمیان رنجش کی وجہ نہ تھی اس سے پہلے جب چچا نے مستقل طور پر گاؤں میں ہی سکونت اختیار کر لی تھی تب انہیں ان زمینوں پہ کام شروع کرنے کے لئے کافی رقم درکار تھی، وہ چاہتے تھے کہ شہر میں موجود اپنا حصہ وہ فروخت کر دیں اور اس پیسے سے وہ کام شروع کر لیں لیکن جب بڑے ابا کو چچا مرزا کی یہ خواہش پتہ چلی تو وہ بہت خفا ہوئے۔ وہ چاہتے تھے کہ اگر چچا زمینوں کی دیکھ بھال کے لئے اپنے خاندان کے ساتھ گاؤں چلے ہی گئے ہیں تو وہ شہر میں موجود پراپرٹی فروخت نہ کریں، لیکن چچا بضد رہے، ان دنوں ابا نے نیا نیا سیاست میں قدم رکھا تھا، میرے ابا کو بھی پیسے کی ضرورت تھی، وہ اتنی رقم چچا کو نہیں دے سکتے تھے کہ جس سے وہ گاؤں میں اپنا کام آرام سے جاری رکھ سکیں۔ انہی دنوں چچا نے سب کی مخالفت کے باوجود اپنے حصے کی پراپرٹی فروخت کر دی تھی اور تبھی سے دلوں میں چاہت کی جگہ

نفرتوں نے لے لی تھی۔ جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بھی کم نہ ہوئی تھیں اور آج یومنہ کو یہاں چھوڑنے کے لئے آنے کے بعد میں نے انہیں محسوس بھی کیا تھا۔

رات دھیرے دھیرے آگے بڑھتی رہی پھر رات کے آخری پہر اچانک ٹرین کی سیٹی کی آواز سن کر میری آنکھ کھل گئی تھی۔ جہانیاں آباد کا ریلوے اسٹیشن گاؤں کے قریب ہی تھا۔ گاڑی مسافروں کو لینے پل دو پل رکی اور پھر سیٹی بجاتی آگے بڑھ گئی۔ میں نے اٹھ کر وضو کیا اور فجر کی نماز ادا کرنے لگا۔ نماز ادا کرنے کے بعد مجھے احساس ہو رہا تھا کہ رات بھر جاگتے رہنے کی وجہ سے میری آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں۔ میں نماز کے بعد پھر سے بستر پر ذرا استراحت کو لیٹ گیا اور پھر لیٹتے ہی مجھے نیند آگئی تھی۔ ابھی مجھے آنکھ لگے تھوڑا ہی وقت گزرا تھا جب ایک ملازم نے مجھے آکر جگا دیا۔ وہ میرے لئے ناشتہ لایا تھا۔ گاؤں میں لوگ صبح سویرے ہی ناشتہ کر لینے کے عادی ہوتے ہیں لیکن مجھے ابھی کوئی بھوک محسوس نہ ہو رہی تھی۔ ملازم ناشتہ رکھنے کے بعد چلا گیا لیکن پھر مجھے دوبارہ نیند نہ آئی۔ میں نے جو وقت دیکھا تو اب سوا نو ہو رہے تھے۔ میں جو کہ اس طرح کے ماحول میں رہنے کا عادی نہ تھا تو میں رات کو ہی واپس لوٹ جانا چاہتا تھا پھر مجبوراً جو مجھے یہاں رات بسر کرنا ہی پڑی تو اب میں مزید رکنا نہ چاہتا تھا۔ میں نے پھر جھٹ سے اٹھ کر منہ ہاتھ دھویا اور ناشتہ کرنے کی غرض سے جو ٹرے پر سے کپڑا ہٹایا تو نیچے ایک تہہ لگا کاغذ کا ٹکڑا پڑا تھا۔ اسے دیکھتے ہی میں نے اسے کھولا۔ ''صبح بہ خیر''۔ اوپر آدھے صفحے پر بڑا سا درج تھا۔ جسے دیکھ کر میں مسکایا تو یہ یومنہ تھی پھر میں نیچے کی سطریں پڑھنے لگا، وہ مجھ سے معذرت خواہ تھی اور اپنے ابا کی طرف سے بھی معافی مانگ رہی تھی۔ میں نے اس صفحے کو اپنی جیب میں رکھا اور ناشتہ کرنے لگا۔

میرے ناشتہ کر لینے کے تھوڑی دیر بعد ہی چچی میرے کمرے میں آئیں، وہ مجھ سے بڑے اخلاق سے دریافت کرنے لگیں کہ مجھے یہاں رات بسر کرنے میں کسی قسم کی کوئی پریشانی تو پیش نہیں آئی۔ ان کے ایسا دریافت کرنے سے ہی جیسے میری رات بھر کی تھکن اتر گئی تھی اور میں سوچنے لگا کہ خوش اخلاقی بھی کیسا حسین زیور ہے۔ خوش اخلاق انسان فقط دو میٹھے بولوں سے کسی بھی انسان کو جیت سکتا ہے۔ پھر وہ مجھے اپنے ہمراہ لئے باہر نکلتے ہوئے بتانے لگیں کہ میرے چچا اور دونوں بھائی صبح ہی کھیتوں میں چلے جاتے ہیں اور پھر دوپہر کے قریب ہی لوٹتے ہیں۔ وہ مجھے ان کے لوٹنے تک رکنے کا کہنے لگیں تو میں نے معذرت کر لی۔ مہمان خانے سے نکل کر اب ہم حویلی کے احاطے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ حویلی کے سامنے پھیلے وسیع رقبے کو کئی قسم کے پیڑ پودے اور پھولوں سے سجایا گیا تھا۔ جو کہ حویلی کے حسن کو مزید بڑھا رہا تھا۔ ہم ذرا اور آگے بڑھے تو دور بڑے بڑے پنجروں کی لمبی قطار کے پاس یومنہ کھڑی مجھے دور سے ہی دکھائی دی۔ وہ پرندوں کو دانہ ڈال رہی تھی۔ چچی مجھے بتانے لگیں کہ یہ سارے پرندے یومنہ کی فرمائش پر ہی رکھے گئے ہیں اور حویلی کے وسیع رقبے پر پھیلے پیڑ پودوں کی دیکھ بھال بھی یومنہ ہی اپنی زیر نگرانی کرواتی ہے۔ ہمارے ذرا قریب پہنچتے ہی اس نے بھی ہمیں آتا دیکھ لیا تھا۔ وہ ہاتھ میں پکڑی دانے دنکنے والی ٹرے نیچے رکھتے ہوئے ہماری طرف بڑھی پھر یومنہ اور

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



میں باتیں کرنے لگے اور چچی یہ کہہ کر چلی گئیں کہ وہ چائے لے کر آتی ہیں۔ چچی کے جانے کے بعد ہم تھوڑی دیر وہیں بیٹھے رہے پھر یومنہ مجھے اپنے پرندے دکھانے لگی۔ پنجروں کے پاس سے گزرتے ہوئے میں نے جو ایک ہاتھ پینٹ کی جیب میں ڈال رکھا تھا تو وہ کاغذ کا ٹکڑا ابھی میری جیب میں ہی تھا جو صبح یومنہ نے ناشتے کے ساتھ بھیجا تھا اسے جیب سے نکال کر میں نے یومنہ کی طرف بڑھا دیا اور وہ ایک دم سے رک کر جیسے سراسیمہ سی ہو کر مجھے تکنے لگی۔ میں نے اسے سمجھایا کہ چچا کا ایسا رویہ کوئی نئی بات تو ہے نہیں۔ اسے اس حوالے سے پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں، پھر اس کا ذہن بٹانے کے لئے میں نے ایک سوال کر دیا کہ وہ جاگنگ والی یومنہ اور اس گاؤں کا ماحول کوئی میل نہیں کھاتا، جسے سن کر وہ مدھم سا قہقہہ لگاتی ہوئی بولی کہ یہاں حویلی کے اس حصے میں کسی غیر مرد کو آنے کی اجازت نہیں اور حویلی کے سامنے بنے لمبے ٹریک پر وہ بچپن سے ہی جوگنگ کرتی چلی آ رہی ہے وہ اس حصے میں آزادی سے جو چاہے کریں کھیلیں کودیں یا جوگنگ کریں۔ اس کی بات سن کر میں سوچ رہا تھا کہ وہ بالکل صحیح کہہ رہی تھی۔ عورت جتنی آزاد گھر کی چار دیواری میں ہوتی ہے وہ اسے باہر کی دنیا کی نام نہاد آزادی میں نہیں مل سکتی۔ تھوڑی دیر میں ہی چچی چائے لے آئی تو پھر چائے کے بعد میں نے ان سے اجازت چاہی تو وہ مجھے آج کا دن بھی رک جانے کو کہتی رہیں اور میں نے جواب میں انہیں شہر آنے کی دعوت دے دی۔ پھر ان کی دعائیں لیتے ہوئے میں وہاں سے واپسی کے لئے چل پڑا۔

بڑے ابا کو میں نے گزری رات میں ہی ساری صورتِ حال سے آگاہ کر دیا تھا کہ کیسے ٹرین کے چھوٹ جانے کی وجہ سے اب میں خود یومنہ کو گاؤں چھوڑنے چلا آیا ہوں، انہیں میری یہ بات سن کر خوشی ہوئی تھی کیونکہ وہ یومنہ کے تن تنہا لمبے سفر کو پسند نہیں کر رہے تھے۔ یوں انہیں اب تسلی ہو گئی تھی کہ میں خود یومنہ کو گاؤں چھوڑنے چلا آیا تھا۔ میرے گھر پہنچتے ہی بڑے ابا مجھے اپنے کمرے میں لے گئے اور بڑی الفت سے اپنے صاحبزادے مرزا عالم اور گھر کے دیگر ایک ایک فرد کا نام لے کر ان سے متعلق پوچھتے رہے۔ میں نے انہیں چچا مرزا کے میرے ساتھ رکھے سرد رویے کے بارے میں کچھ نہ بتایا بلکہ انہیں کہا کہ وہ تو سبھی سے ملنے کے لئے تڑپ رہے ہیں۔ گاؤں پہنچ کر وہ کاموں میں ایسے پھنسے ہیں کہ انہیں مہلت ہی نہیں ملتی جو وہ آ کر بڑے ابا سے مل ہی لیں اور فرزند اور دلدار تو میرے ساتھ ہی آنا چاہتے تھے کہ انہیں بڑے ابا سے ملنے کی اس قدر خواہش تھی۔ بڑے ابا میری باتیں سن کر اس قدر خوش ہوئے کہ خونی رشتوں کی تڑپ سے ان کی آنکھیں چھلک پڑیں پھر وہ مجھ سے پوچھنے لگے کہ یومنہ کب تک واپس لوٹے گی۔ میں نے انہیں بتایا کہ اسے یونیورسٹی کی طرف سے فقط ایک ہفتہ کی ہی چھٹی ملی ہے، یوں وہ ایک ہفتہ گاؤں میں گزار کر واپس آ جائے گی پھر وہ مجھے اپنے کمرے میں جا کر آرام کرنے کو کہنے لگے اور میں ان کی اجازت سے اپنے کمرے میں چلا آیا۔ چچا مرزا عالم کے تلخ رویے کو ان سے چھپا کر میں نے اچھا ہی کیا۔ اگرچہ میری کہی باتوں میں سچائی نہ تھی لیکن ایسا جھوٹ جس سے آپس کے رشتوں میں وقتی پیدا ہو جانے والی دوریاں مٹتی ہوں بولنے میں مجھے کوئی حرج محسوس نہ ہوا بلکہ میں سوچنے لگا کہ ہو سکتا ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ چچا کے رویے میں واقعی تبدیلی آ جائے اور جیسے آج بڑے ابا انہیں معاف کیے بیٹھے ہیں تو وہ بھی کسی روز

سبھی پرانی رنجشیں بھلا کر بڑے ابا کے پاس چلے آئیں اور یوں رشتوں کی پہلی سی بہاریں پھر سے لوٹ آئیں۔ پہلی سی بہاروں سے مجھے ایک دم خیال آیا کہ مجھے چچا صفدر کی طرف گئے ہوئے بھی کافی دن بیت چکے تھے اور وہ بھی اتنے خوددار تھے کہ میرے کبھی دیر کر دینے کے باوجود بھی انہوں نے مجھے فون کر کے کبھی یاد دہانی تک نہ کروائی تھی۔ پچھلے کئی برسوں سے ان کے خاندان کی کفالت کا ذمہ میں اپنے سر لیے ہوئے تھا۔ ایسا میں کوئی ثواب کمانے کی غرض سے تو نہیں کر رہا تھا بلکہ یہ بھی میں اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لئے کر رہا تھا۔

مجھے یاد آ رہا تھا اس روز میں اپنے کسی کام کی غرض سے گھر سے نکلنے ہی والا تھا جب بھابی غصے کے عالم میں مجھے تیزی سے گھر میں داخل ہوتی دکھائی دیں۔ میں تیزی سے اپنی گاڑی سے نکل کر بھابی کی جانب بڑھا۔ وہ اپنی گاڑی پر گئی تھیں اور اب بنا گاڑی کے گھبرائی ہوئی غصے کے عالم میں واپس آ رہی تھیں۔ میں سمجھ گیا تھا کہ ان کے ساتھ باہر کوئی مسئلہ پیش آیا ہو گا اور میرے خیال کے بالکل عین مطابق جب وہ میرے قریب پہنچیں تو مجھے دیکھتے ہی وہ گھبرائی ہوئی مجھے بتانے لگیں کہ باہر کسی اجنبی شخص نے ان کے ساتھ بدتمیزی سے پیش آتے ہوئے کچھ نازیبا الفاظ بھی کہے ہیں، وہ اپنی گاڑی اس کی گاڑی کی سامنے ہی چھوڑ کر آ گئی تھیں اور یہ سارا معاملہ گھر کے خاص دروازے کے سامنے ہی پیش آیا تھا۔ بھابی نے جس انداز میں مجھے یہ سب بتایا تھا، میں سنتے ہی جیسے اپنے آپے میں نہ رہا ان کے ہاتھ سے گاڑی کی چابی لے کر میں نے جو باہر کی جانب چند قدم بڑھائے تو رک کر پلٹا اور کچھ سوچ کر اپنے کمرے کی جانب دوڑا اور پھر جو میں کمرے سے باہر آیا تو میرے ہاتھ میں ریوالور تھا، گھر کے خاص دروازے سے باہر قدم رکھتے ہی وہ مجھے بھابی کی گاڑی کے پیچھے موجود اپنی گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا دکھائی دیا۔ اس نے بھی مجھے اپنی جانب بڑھتا ہوا دیکھ لیا تھا۔ وہ فوراً باہر نکلا اتنے میں، میں اس کے قریب پہنچ چکا تھا۔ وہ مجھ سے کچھ بات کرنے کے لئے بولتا اس سے پہلے ہی میں نے ریوالور اس کی ٹانگ پر رکھ کر فائر کر دیا اور اسے وہیں تڑپتا چھوڑ کر میں نے بھابی کی گاڑی اسٹارٹ کی اور گاڑی پورچ میں لے جا کر دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ جیسے میرے لئے یہ عام سی بات تھی۔

اسے سڑک پر بے ہوش پڑا دیکھ کر کسی راہ چلتے شخص کو اس پر رحم آیا تو اس نے اسے ہسپتال پہنچا دیا اس کا نام صفدر تھا۔ وہ کسی ڈاکٹر صاحب کے ہاں ڈرائیور تھا اور اس وقت وہ ڈاکٹر صاحب کے بچوں کو سکول سے لینے جا رہا تھا۔ صفدر کے ہوش میں آنے کے بعد پولیس نے صفدر کا جو بیان لیا تو میرے خلاف ڈاکٹر صاحب نے مقدمہ درج کروا دیا۔ مجھے گھر آ کر گرفتار کرنے سے پہلے ہی پولیس کا ابا سے رابطہ ہو گیا تھا۔ ابا اس وقت ایم این اے تھے اور جب انہیں اطلاع ہوئی تو وہ خود پولیس اسٹیشن پہنچ گئے تھے اور میں اپنے فارم ہاؤس پر عیاشیوں میں مگن تھا۔ جب ابا ڈاکٹر صاحب سے ملے تو ان سے صفدر کی حالت کے بارے میں دریافت کیا جس پر انہوں نے شدید غصے اور برہمی کا اظہار کرتے ہوئے ابا کو بتایا کہ گولی اس قدر قریب سے ٹانگ کو لگی تھی کہ جس سے ہڈی کو شدید نقصان پہنچا تھا ہو سکتا ہے، صفدر کی ٹانگ ہی کاٹنا پڑ جائے۔ ابا نے ڈاکٹر صاحب سے جن کے ہاں صفدر ملازم تھا اور جنہوں نے صفدر

کی طرف سے مجھ پر مقدمہ درج کروایا تھا ان سے صفدر کی مالی حیثیت کے بارے میں دریافت کیا۔ وہ گاؤں سے تعلق رکھتا تھا اور یہاں شہر میں وہ کسی جگہ کرائے کے مکان میں رہائش پذیر تھا۔ ابا نے ڈاکٹر صاحب کو سمجھایا کہ ان کے ڈرائیور نے بھی ان کی بہو کے ساتھ کس طرح سے تلخ کلامی کی لیکن جو بھی ہوا بہت برا ہوا۔ اب بہتر یہی ہے کہ معاملہ مل بیٹھ کر ہی سلجھا لیا جائے۔ ہم صفدر کے علاج کے سارے اخراجات برداشت کرنے کے لئے تیار ہیں۔ آپ مقدمہ واپس لے لیں، لیکن ڈاکٹر صاحب کسی صورت بھی مقدمہ واپس لینے کو تیار نہ تھے پھر شاید پولیس کے رویے سے تنگ آ کر یا ابا کے اثر ورسوخ کو دیکھتے ہوئے انہوں نے چند ہی روز بعد ابا کی بات مان لی لیکن پھر وہی ہوا جس کا ڈاکٹر صاحب کو خدشہ تھا، صفدر کی ایک ٹانگ کاٹنا پڑی اور وہ زندگی بھر کے لئے معذور ہو کر رہ گیا۔ وہ اپنے دو معصوم بچوں کا واحد کفیل تھا۔ وقت گزرتا چلا گیا اور صفدر ہسپتال سے گھر منتقل ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب کے ہاں ڈرائیور کی جو نوکری وہ کر رہا تھا وہ تو کب کی چھوٹ گئی اب ڈاکٹر صاحب اور میرے ابا جنہوں نے صفدر کے علاج کے اخراجات برداشت کرنے کی ہامی بھری تھی اب صفدر کے ہسپتال سے گھر منتقل ہوتے ہی گویا، وہ اس کی ذمہ داریوں سے بری الذمہ ہو گئے تھے۔ چاہئے تو یہ تھا کہ صفدر کی معذوری کے بعد اب وہ مستقل طور پر اس کی مالی امداد کا ذمہ اٹھا لیتے لیکن جب مقدمہ ختم ہو گیا، صفدر کا چل رہا ڈاکٹری علاج بھی مکمل ہو گیا تو پھر جیسے انہوں نے صفدر سے اپنا پیچھا چھڑا لیا اور جب کافی عرصے بعد مجھے صفدر کا خیال آیا تو بڑی تگ ودو کے بعد اسے ڈھونڈتا ہوا میں اس تک پہنچا تھا۔ اس کی بیوی لوگوں کے گھروں میں کام کاج کرتی تھی اور خود صفدر بھی کوئی نہ کوئی ایسا چھوٹا موٹا کام تلاش کر لیا کرتا تھا جو وہ وہیل چیئر پر بیٹھے بیٹھے آسانی سے کر لیا کرتا تھا لیکن اس ساری کسمپرسی کے باوجود اس نے اپنے بچوں کو متاثر نہ ہونے دیا تھا۔ اس کے دونوں بچے اسکول جاتے تھے اور جب میں اسے ڈھونڈتا اس تک پہنچا تو مجھے اس کی اس بات نے بے حد متاثر کیا تھا۔ میں نے اس سے مل کر اپنے کیے کی معافی طلب کی تو اس نے مجھے یہ کہہ کر معاف کر دیا کہ معاف کر دینے والا بدلہ لینے والے سے افضل ہوتا ہے۔ آج اسی افضل انسان کے ہاں جانے سے پہلے میں نے ایک شاپنگ سنٹر پر رک کر اس کے بیوی بچوں کے لیے تحفے تحائف اور کھانے پینے کی چند اشیاء خریدیں اور اس کے گھر جا پہنچا، بچے میری آمد پر خوشی سے شور مچاتے ہوئے میرے ارد گرد آ کھڑے ہوئے اور میں ان کے لیے خریدے تحفے تحائف انہیں دینے لگا۔ یونہی اکثر جب میں صفدر کی طرف آتا تو بچے مجھے اپنے ہوم ورک کی کاپیاں بھی دکھاتے اور میں انہیں شاباش دیتا کہ وہ یونہی من لگا کر تعلیم حاصل کرتے رہیں۔

صفدر سے اجازت لے کر میں اس کے گھر سے نکلا تو یہ سوچتا ہوا جا رہا تھا کہ اگر اس روز میں غصے کے عالم میں صفدر پر گولی نہ چلاتا تو وہ آج اپنی ٹانگ سے محروم بھی نہ ہوا ہوتا پھر اس کا جرم کیا تھا بات تو فقط اتنی ہی تھی کہ بھابھی کان سے فون لگائے کسی سے باتیں کیے جا رہی تھیں اور صفدر کی جو گاڑی پیچھے آ رہی تھی اسے گزرنے کے لیے راستہ چاہیے تھا۔ اسے ڈاکٹر صاحب کے بچوں کو اسکول سے لینا تھا اور وہ بھی جلدی میں تھا۔ بھابھی نے گھر کے سامنے گاڑی سڑک کے بیچ ہی روک دی اور جب صفدر اپنی گاڑی سے نکل کر ان

سے اپنی گاڑی سامنے سے ہٹانے کو کہنے لگا تو وہ غصے کے عالم میں ایک دم سے بھڑک اٹھیں اور اسے دھمکیاں دینے لگیں کہ تم مجھے جانتے نہیں ہو کہ میں کون ہوں۔ صفدر راستہ مانگنے کے لیے فقط ہارن بجاتا رہا تھا اور اس بات کا وہ برا مان گئی تھیں۔ صفدر دیکھ رہا تھا کہ بھابھی فون پر باتیں کرتی ہوئی جا رہی ہیں، اس نے بھی انہیں سنا دیں کہ اگر فون سننا ہی ہے بی بی جی تو آپ گاڑی ایک طرف روک لیں اور پھر چاہیں تو جتنی مرضی باتیں کرتی رہیں۔ صفدر کی ایسی باتیں سنتے ہی بھابھی غصے سے بے قابو ہو کر گاڑی وہیں سڑک کے وسط میں ہی چھوڑ کر اندر چلی آئی تھیں اور جو باتیں انہوں نے مجھے بتائی تھیں ان میں کتنی صداقت تھی یہ مجھے صفدر کی باتیں سن کر بعد میں اندازہ ہوا تھا لیکن اب صفدر کی ایک ٹانگ اسے واپس تو نہیں مل سکتی تھی، دولت، پیسے، رتبے کے گھمنڈ میں ایسی کتنی ہی بیگمات ہوتی ہوں گی، ایسے کتنے ہی طالم ہوتے ہوں گے جو بنا سوچے سمجھے بنا تصدیق کیے کہ آخر غلطی کس کی ہے، کتنے ہی لوگوں کو اپنے ظلم کا نشانہ بنا ڈالتے ہوں گے۔ ان کا اثر و رسوخ تو انہیں قانون کی گرفت سے بھی بچا لیتا ہو گا لیکن وہ یہ نہیں سوچتے ہوں گے کہ ان کے ایسے قبیح فعل سے کتنے چولہے سرد پڑ جائیں گے کتنے بچے تعلیم سے محروم رہ جائیں گے، نہیں تو اللہ تو یہ سب دیکھ ہی رہا ہے۔ دولت، پیسہ، رتبہ بھی اسی نے دے رکھا ہے اور وہی جب چاہے تو انسان کو اپنی ان نعمتوں سے محروم کر دے۔

میں ایسا ہی سوچتا گھر پہنچا تو پورچ میں ایک نئی گاڑی کھڑی دیکھ کر میں سوچنے لگا کہ کوئی مہمان آئے ہوں گے پھر میرے اپنی گاڑی سے اتر کر اسے لاک کرتے ہی مجھے رومی میاں اپنی جانب دوڑتے ہوئے آتے دکھائی دیئے اور دور لان تک جو میں نے نگاہ دوڑائی تو وہاں واقعی گھر کے اپنے افراد کے علاوہ مجھے چند اجنبی چہرے بھی دکھائی دیئے۔ رومی میاں نے میرے پاس پہنچتے ہی مجھے بتایا کہ آج یومنہ آنٹی واپس آ گئی ہیں اور ماں مجھے اس طرف بلا رہی ہیں۔ میں رومی میاں کے ساتھ ساتھ ہی چلتا ہوا ان کے قریب پہنچا تو تعارف سے مجھے معلوم پڑا کہ یہ یومنہ کی والدہ کی طرف سے کوئی دور کے انکل آنٹی تھے جو کہ یہیں شہر میں عرصہ دراز سے مقیم تھے اور چند روز پہلے وہ گاؤں جو رشتہ داروں سے ملنے گئے تھے تو اب واپسی پر چونکہ یومنہ کو بھی یہیں آنا تھا تو وہ ان کے ہمراہ ہی چلی آئی تھی۔ مہمان کچھ دیر بیٹھ کر رخصت ہو گئے اور پھر ماں بھی اٹھ کر اندر چلی گئی تو اب فقط یومنہ ہی میرے پاس بیٹھی تھی۔ میں نے یومنہ سے گھر کے سبھی افراد کا حال دریافت کیا اور پھر میں بھی وہاں سے اٹھنے ہی والا تھا جب یومنہ کی بات سن کر میں دوبارہ واپس بیٹھ گیا۔ وہ مجھ سے جاننا چاہتی تھی کہ اس روز بابا رب نواز سے ہوئی پہلی ملاقات میں انہوں نے میرے کانوں کے قریب دھیرے سے ایسا کیا کہا کہ پھر مجھے میرے سوال کا جواب مل گیا تھا، یومنہ کی بات سن کر میں اسے بتانا ہی چاہتا تھا کہ جب عصر کی اذان شروع ہو گئی۔ یومنہ مجھے اٹھتا دیکھ کر سمجھ گئی تھی کہ اب اذان کی آواز سن کر میں وہاں رکنے والا نہ تھا یہی وجہ تھی کہ وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی اور میں نے اسے اشارتاً ہی جواب دیا کہ میں اسے اس سوال کا جواب بعد میں دوں گا اور میں وہیں سے مسجد چلا گیا۔

مسجد سے جب میں نماز ادا کر کے گھر پہنچا تو مجھے بڑے ابا نے اپنے کمرے میں بلایا اور وہ کہنے لگے کہ ان کی تبلیغی جماعت کسی دوسرے شہر جا رہی ہے اور وہ اپنے ہمراہ مجھے بھی لے جانا چاہتے تھے۔ میں نے خوشی خوشی ہامی بھر لی۔ ہم مغرب کے بعد ہی اپنا ساز

وسامان اٹھائے گھر سے چل پڑے تھے۔ ہمیں تین روز تک اس شہر میں ٹھہرنا تھا اور بڑے ابا اکثر مجھے ایسے تبلیغی دوروں پر اپنے ہمراہ لے جایا کرتے تھے اور میرا من بھی اب ایسے تبلیغی دوروں میں خوب لگتا تھا۔ اپنے شہر سے باہر دوسرے شہر میں ہمیں دو تین دن گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا اور پھر ہم دادا پوتا واپس گھر لوٹ آئے تھے، لیکن گھر پہنچتے ہی ہمیں ماں سے جو بات پتہ چلی اسے سن کر بڑے ابا کے ساتھ ساتھ مجھے بھی تعجب ہوا۔ ماں نے بتایا کہ یومنہ کے جو انکل اور آنٹی اسے یہاں چھوڑ کر گئے تھے وہ آج صبح دوبارہ آئے تھے اور ان کا کہنا تھا کہ ان کی کوئی اولاد تو ہے نہیں تو وہ چاہتے ہیں کہ یومنہ اب انہی کے پاس رہنے آجائے اور باقی تعلیم وہ وہیں ان کے پاس رہ کر مکمل کرلے۔ اور اس سلسلے میں وہ یومنہ کے والد اور والدہ سے بھی بات کر چکے ہیں۔ بڑے ابا نے جو یہ بات سنی تو وہ بہت خفا ہوئے۔ میں ان کے پاس ہی کھڑا تھا، انہوں نے اسی وقت مجھے کہا کہ میں ان کی فون پر چچا مرزا سے بات کرواؤں لیکن میں نے ٹال مٹول سے کام لیتے ہوئے انہیں اس وقت روک دیا تھا۔ وہ بھی اپنی جگہ صحیح تھے۔ بھلا اپنے سگے خونی رشتوں کو چھوڑ کر چچا اپنی صاحبزادی کو دور کے جاننے والوں کے ہاں کیوں بھیج رہے تھے لیکن میں سمجھ گیا تھا کہ ایسا سب میری وجہ سے ہو رہا تھا، اس روز جو میں یومنہ کو گھر چھوڑنے گیا تھا تو اس بات کو لے کر چچا خفا ہو گئے تھے۔ چچا کو میرا یومنہ کو گھر چھوڑ کر آنا پسند نہ آیا تھا اور یہ سب میری اسی خطا کی وجہ سے ہو رہا تھا لیکن پھر پاس ہی کھڑی ماں کی بات سن کر میں ششدر رہ گیا تھا۔ جیسے مجھے اپنی سماعت پر ہی یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ بڑے ابا سے کہہ رہی تھیں کہ انہیں لگتا ہے کہ مرزا بھائی صاحب یومنہ کے لیے ہمارے طٰہٰ کو پسند کر رہے ہیں، اس روز طٰہٰ یومنہ کو گھر تک چھوڑنے بھی تو گیا تھا اور پھر بھائی صاحب اور بھابھی نے طٰہٰ کو وہیں ٹھہرا لیا تھا یوں وہ چاہتے ہوں گے کہ یومنہ اس گھر میں جہاں طٰہٰ بھی موجود ہے مزید نہ ٹھہرے۔" ماں کی ایسی سوچ جان کر میں دنگ رہ گیا تو اب بڑے ابا کی باتیں سن کر میں ایک بار پھر سے حیران ہو رہا تھا۔ وہ ماں سے کہہ رہے تھے کہ انہیں یومنہ بیٹی بہت پسند ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ مرزا سے بات کرکے وہ طٰہٰ کے لیے اس کا ہاتھ مانگ لیں۔ یوں ماں نے بھی بڑے ابا کی بات سن کر خوشی خوشی ہامی بھر لی اور میں سوچ رہا تھا کہ آمنہ کم پڑھی لکھی تھی اور بھائی اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے اور اب ان کا بیٹا معمولی پڑھا لکھا تھا اور یومنہ ماسٹر کر رہی تھی اور خوبصورت بھی تھی شاید ماں کو مجھ میں کوئی خامی دکھائی ہی نہ دیتی تھی بھلا میرے جیسے شخص سے کوئی اپنی بیٹی کا رشتہ کیونکر جوڑے گا۔

اگلے ہی روز یومنہ کے آنٹی اور انکل اسے لینے آگئے تھے میں اپنے کمرے میں ہی تھا جب ماں نے بابا عبدالقادر کے ہاتھ پیغام بھجوایا کہ یومنہ جا رہی ہے۔ میں باہر پہنچ کر اس سے مل لوں۔ یہ سنتے ہی مجھے یاد آیا کہ ابھی یومنہ کے پوچھے سوال کا جواب بھی تو مجھے دینا تھا میں نے اسی وقت قلم اٹھایا اور جواب تحریر کرکے رقعہ اپنی جیب میں رکھ لیا۔ یومنہ چند ہی دنوں میں جیسے ہمارے گھر کا ایک اہم فرد بن گئی تھی اور اب یوں اچانک اس کے چلے جانے کی خبر نے جیسے سبھی کے ساتھ ساتھ مجھے بھی اداس کر دیا تھا۔ میں اپنے کمرے سے نکلا اور جو پورچ میں پہنچا تو آنٹی کے ساتھ ہی انہی کی طرح ایک اور لڑکی عبایا پہنے کھڑی تھی میں نے اسے بھی سلام کیا اور اب

میری نگاہیں یومنہ کو ڈھونڈ رہی تھیں جو مجھے کہیں نہ دکھائی دی میں نے سوچا ہو سکتا ہے وہ ابھی کمرے میں ہی ہو اپنا سامان پیک کر رہی ہو، ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا جب میرے عقب سے مجھے یومنہ کی آواز سنائی دی میں نے پلٹ کر جو دیکھا تو جیسے میرے دل کی دھڑکنیں بے قابو ہو گئیں۔ آنٹی کے ساتھ عبایا پہنے کوئی اور نہیں بلکہ یومنہ ہی کھڑی تھی۔ اس نے آج ہمارے گھر سے جاتے ہوئے میرا تحفتاً دیا ہوا عبایا پہن رکھا تھا۔ میں جو ابھی تک حیرت زدہ سا کھڑا تھا تو وہ مجھی سے مخاطب تھی۔

"آپ پوچھیں گے نہیں طٰہٰ آج اس گھر سے جاتے ہوئے میں نے آپ کا تحفتاً دیا عبایا کیوں پہن رکھا ہے۔" اس کی بات کا جواب میں نے فقط اپنے چہرے کے تاثرات سے دیا تو وہ کہنے لگی۔ "طٰہٰ میں یہ دکھانا چاہتی ہوں کہ مجھے اس گھر میں آکر کیا حاصل ہوا اور میں جو اس گھر میں فقط چند روز ہی گزار کر یہاں سے جا رہی ہوں تو میں اس گھر سے کیا لے کر جا رہی ہوں۔ میں آپ کے آنگن سے شرم و حیا کا حجاب لے کر جا رہی ہوں، میں نے آپ سے مل کر زندگی کا اصل مقصد پالیا ہے۔" اس کی باتوں سے جہاں مجھے بے حد مسرت ہوئی وہیں میں حیرت زدہ سا کھڑا سوچ رہا تھا کہ کیا یہ وہی یومنہ ہے۔ عین اسی وقت ماں ہم دونوں کو ایک ساتھ کھڑا دیکھ کر ہمارے پاس آئیں، انہوں نے مسکرا کر میری جانب دیکھا اور پھر یومنہ کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں۔

ہم بہت جلد تمہیں مانگنے گاؤں آئیں گے۔" ماں نے جو ایک دم سے یہ بات یومنہ سے کہہ ڈالی جو ماں کو یومنہ سے نہیں کہنا چاہیے" تھی تو اب میں جیسے وہاں اک لمحہ بھی رکنا نہیں چاہتا تھا کہ جانے ماں کی یہ بات سن کر یومنہ میرے بارے میں کیا سوچے گی۔ اسی مقصد سے میں نے ابھی چند قدم آگے بڑھائے ہی تھے جب مجھے یومنہ کی آواز اپنے عقب سے آتی سنائی دی۔ "امی مجھے آپ کے آنے کا انتظار رہے گا۔" میں یہ سن کر جیسے وہیں ٹھہر گیا لیکن مجھ میں پلٹ کر یومنہ اور ماں کی طرف دیکھنے کی ہمت نہ تھی۔

میں نے اپنے اردگرد نگاہ دوڑائی مجھے رومی میاں کہیں دکھائی نہیں دے رہے تھے اور رقعہ ابھی تک میری جیب میں ہی پڑا تھا۔ مجھے خود تو ہمت نہیں ہوئی کہ میں وہ رقعہ یومنہ کو دیتا وہاں اس وقت گھر کے سبھی افراد موجود تھے اور یہ کام رومی میاں ہی کر سکتے تھے، پھر مجھے رومی میاں مل ہی گئے مجھ پر جو ان کی نگاہ پڑی تو میں نے انہیں دور سے ہی اشارہ کیا، میرا اشارہ پاتے ہی وہ جھٹ سے بھاگتے ہوئے میرے پاس چلے آئے۔ میں نے ان کے مقابل بیٹھتے ہوئے وہ رقعہ ان کے ہاتھ میں دیا اور ان کے کان کے ذرا قریب ہوتے ہوئے کہا کہ وہ یہ رقعہ اپنی یومنہ آنٹی کو دے آئیں اور چند لمحے مزید وہاں رک کر میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔

اب اپنے کمرے میں پہنچ کر میں یہی سوچ رہا تھا کہ یارب یہ کیا ماجرا ہے۔ ماں کی بات تو مجھے سمجھ آتی تھی ان کے ممتا بھرے جذبات کی اوٹ میں میرا ہر عیب جیسے چھپ گیا تھا، انہیں تو مجھ میں کوئی عیب یا کھوٹ دکھائی نہ دیتا تھا، لیکن یہ یومنہ کو کیا ہوا جو وہ بھی مجھے قبول کرنے کے لیے تیار ہو گئی تھی اور جب ماں نے اسے صاف لفظوں میں کہا کہ وہ اپنے طٰہٰ کے لیے گاؤں جا کر اس کا ہاتھ مانگیں گی تو یومنہ نے بھی جیسے جھٹ سے اقرار میں کہہ دیا کہ اسے بھی ان لمحوں کا انتظار رہے گا۔ پھر مجھے چچا مرزا کا خیال آنے لگا جنہیں فقط میرا یومنہ کو ان کے ہاں چھوڑ کر آنا ہی ناگوار گزرا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆

باب 7
تمنائے ثمر

اب میں سوچنے لگا کہ جب بڑے اباماں اور ابا کے ہمراہ گاؤں جا کر چچا مرزا سے میرے لیے یومنہ کا رشتہ مانگیں گے تو ان کا جواب کیا ہو گا؟ مجھے نہیں لگ رہا تھا کہ وہ اس رشتے کو قبول کریں گے اور اگر انہوں نے انکار کر دیا تو ماں اور ابا تو شاید اس بات کو کوئی اہمیت نہ دیں لیکن بڑے ابا کے جذبات کو میں اچھے سے سمجھتا تھا۔ چچا مرزا کے انکار پر ان کو کس قدر ٹھیس پہنچے گی یہ سوچ کر میں خود کو ہی کوسنے دینے لگا تھا۔ اگر میں نے اُس روز گاؤں سے لوٹنے کے بعد بڑے ابا کو سبھی کچھ سچ سچ بتا دیا ہوتا تو شاید وہ یومنہ اور میرے رشتے کی بات ہی شروع نہ کرتے۔ یا کم سے کم انہیں اندازہ ہوتا کہ چچا کے دل میں میرے لیے کتنی جگہ ہے۔ ایسے ہی خیالات کے ساتھ ساتھ نہ جانے کیوں میں پھر ایسا بھی سوچنے لگا کہ ہو سکتا ہے، ماں اور ابا کے ساتھ ساتھ بڑے ابا بھی جو جا رہے ہیں تو بڑے ابا کی بات کو چچا مرزا رد نہ کریں اور وہ اس رشتے کو قبول کر لیں۔ یہ خیال ذہن میں آتے ہی نہ جانے کیوں مجھے لگنے لگا تھا کہ ہاں ایسا ہی ہو گا۔ ماں اور ابا کے ساتھ ساتھ بڑے ابا کو دیکھ کر چچا کا دل موم ہو جائے گا اور یوں وہ بڑے ابا کی بات مان لیں گے اور برسوں سے رشتوں میں جو خلاء سا چلا آ رہا تھا وہ خلا میرے اور یومنہ کے رشتہ کے طے ہو جانے سے مٹ جائے اور بڑے ابا جو برسوں سے اپنے خاندان کے ایک ہونے کی دعائیں کرتے چلے آ رہے تھے، یوں ان کا وہ خواب بھی پورا ہو جائے گا اور مجھ میں جو اس رشتے سے انکار کرنے کی ہمت نہ تھی تو اس کے پیچھے بھی یہی وجہ تھی ورنہ میں خود کو یومنہ جیسی لڑکی کے قابل کب سمجھتا تھا۔

یومنہ کے ہمارے گھر سے جانے کے چند روز بعد ہی گھر کے سبھی لوگ چچا مرزا کے پاس گاؤں جا پہنچے اور میں نے ان کے جانے کے بعد جائے نماز سنبھال لی۔ میں جائے نماز پر بیٹھا دعائیں کرتا رہا کہ یارب چچا مرزا اس رشتے کو قبول کر لیں اور ہمارے خاندانوں میں چل رہی تمام دیرینہ رنجشیں یونہی مٹ جائیں۔ سبھی پھر سے ہر خوشی اور غم میں ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ شریک ہوں۔ شام کو مغرب کے بعد بھی میں اللہ سے ایسی ہی دعائیں مانگ رہا تھا جب بابا عبد القادر نے میرے کمرے میں آ کر مجھے بتایا کہ سبھی گھر والے لوٹ آئے ہیں۔ میں بے تابی سے اٹھ کر بابا عبد القادر کے ساتھ ساتھ ہی جو پورچ میں پہنچا تو انہیں دیکھتے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ چچا مرزا نے رشتے سے انکار کر دیا ہے۔ میں جب وہاں پہنچا تو کسی نے مجھ سے بات تک نہ کی تھی، بھائی اور بھابھی یونہی میرے پاس

سے گزر گئے۔ ماں اور ابا اپنے کمروں کی جانب بڑھ گئے اور بڑے ابا کو جو میں نے اپنے کمرے کی جانب بڑھتے دیکھا تو جیسے مجھے ہمت ہی نہ پڑی کہ ان سے آگے بڑھ کر پوچھوں کہ چچا نے کیا جواب دیا۔ یہ تو میں سمجھ ہی چکا تھا کہ چچا نے رشتے سے انکار کر دیا ہے، لیکن میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ وہاں گاؤں میں چچا اور بڑے ابا کے درمیان آخر کو کیا باتیں ہوئیں۔ فی الوقت میں نے بڑے ابا کے کمرے میں جانے کا ارادہ ترک کر دیا تھا اور پھر عشاء کی نماز کے بعد جو میں ان کے کمرے میں پہنچا تو وہ اپنے بستر پر لیٹے آرام کر رہے تھے۔ میں دھیرے سے ان کے پاس پہنچا اور میں نے جیسے ہی ان کے پیر دابنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو مجھے احساس ہوا کہ ان کا جسم بخار سے تپ رہا تھا۔ میں جھٹ سے اٹھ کھڑا ہوا، ان کی پیشانی پر جو ہاتھ رکھا تو انہیں خاصا تیز بخار تھا۔ انہوں نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں مضبوطی سے تھام لیا اور گھٹی گھٹی سی آواز میں کہنے لگے کہ طٰہٰ بیٹا تمہارے چچا نے رشتے سے انکار کر دیا، میں نے جو بڑے ابا کی یہ بات سنی تو جھٹ سے جواب دیا۔

"تو پھر کیا ہوا، بڑے ابا جو انکار کر دیا۔" مجھے پہلے سے اندازہ تھا کہ اگر چچا مرزا نے رشتے سے انکار کر دیا تو اس بات کا بڑے ابا کو شدید صدمہ ہو گا۔ اسی لیے بڑے ابا کی بات سن کر میں نے انہیں ایسا جواب دیا تھا تا کہ وہ اس بات کو کچھ خاص اہمیت نہ دیں پھر وقت ضائع کیے بغیر میں نے فوراً پہلے ڈاکٹر کو کال کی اور پھر ان کا سر دابنے بیٹھ گیا۔ جب وہ دوبارہ بولنے لگے تھے۔

"طٰہٰ بیٹا! مرزا نے مجھے انکار کر دیا، مجھے کہنے لگا اگر میں اس بات کو بھول جاؤں کہ میرے بھائی خورشید عالم نے میری بیٹی کا رشتہ لینے سے انکار کر دیا تھا اور اس بات کو بھی بھلا دوں کہ طٰہٰ کے ہاتھوں قتل بھی ہو چکا ہے، جس کی اسے معافی مل گئی تھی تو میں یہ کیسے بھول جاؤں کہ طٰہٰ کو کبھی کبھی پاگل پن کے دورے پڑنے لگتے ہیں، میں اپنی بیٹی کا رشتہ ایک ایسے شخص سے کیوں جوڑوں جو خود کو سنبھالنے کے قابل نہیں۔" بڑے ابا کی زبانی چچا کی یہ باتیں سن کر مجھے بھی شدید دھچکا پہنچا اور میں سوچنے لگا کہ بڑے ابا کو اس قدر شدید بخار بھی اسی لیے ہوا تھا۔ انہوں نے چچا کی باتوں کو دل پر لیا تھا اسی لیے میں نے انہیں چپ ہونے کو نہ کہا، میں چاہتا تھا کہ وہ اپنے دل کی ساری باتیں کہہ دیں تا کہ ان کے دل کا بوجھ ہلکا ہو سکے۔ وہ پھر سے بولے۔ "طٰہٰ بیٹا میں نے مرزا کو سمجھایا تھا کہ طٰہٰ اب بالکل ٹھیک ہے، اسے عرصہ ہوا اب کوئی مسئلہ پیش نہیں آیا اور وہ میرے ساتھ کام بھی سنبھالنے لگا ہے۔" بڑے ابا ایسے ہی بول رہے تھے جب ڈاکٹر بھی آ پہنچا۔ بابا عبد القادر نے ماں اور ابا کو بھی جا کر بڑے ابا کی طبیعت کے حوالے سے آگاہ کر دیا تھا، اور اب بھائی بھابھی سبھی ان کے گرد جمع تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے چیک اپ کے بعد بتایا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں، ذرا سا بلڈ پریشر اور بخار ہے، وہ انجکشن لگا دیتے ہیں جس سے انہیں نیند آئے گی اور آرام ملنے سے یہ اچھے ہو جائیں گے۔

ڈاکٹر کے انجکشن لگا کر چلے جانے کے بعد جب بڑے ابا نے انجکشن کے اثر سے آنکھیں بند کر لیں تو ماں، ابا، بھائی اور بھابھی کمرے سے چلے گئے اور میں پاس پڑی کرسی پر بیٹھا انہی کے پاس ٹھہر گیا کہ کیا پتہ رات کے کسی پہر ان کی آنکھ کھلے تو انہیں جو کسی چیز کی ضرورت محسوس ہو تو میرے ان کے پاس موجود ہونے سے انہیں کوئی پریشانی پیش نہ آئے۔

بڑے ابا کے سو جانے کے بعد میں نے بھی وہیں کرسی پر بیٹھے بیٹھے آنکھیں بند کر لیں تو آنکھیں بند کرتے ہی مجھے بھی اونگھ آ گئی لیکن مجھے رات کے آخری پہر سے پہلے جاگ کر جو تہجد کے نوافل پڑھنے کی عادت تھی تو مقررہ وقت سے پہلے ہی میری آنکھ کھل گئی۔
اب وضو کرنے کے لیے جو میں اٹھا تو میں نے اس بات کا خاص خیال رکھا کہ کمرے میں میری مصروفیت سے کوئی ایسی آواز پیدا نہ ہو جس سے بڑے ابا کی آنکھ کھل جائے اور ان کے آرام میں خلل پڑے۔ نوافل کے بعد میں رب سوہنے سے بڑے ابا کی صحت اور ان کی درازی عمر کی دعائیں کرتا رہا اور اپنا سر سجدے میں جھکا دیا۔ فجر کی اذانیں شروع ہوئیں اور جو اذان کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی تو میں نے ایک طویل سجدے سے اپنا سر اٹھایا۔ بڑے ابا پر جو نگاہ پڑی تو اب وہ جاگ رہے تھے۔ گھر سے قریبی مسجد میں موؤذن نے فجر کی اذان شروع کی تو میں وہیں جائے نماز پر بیٹھا اذان سن کر اس کا جواب دینے لگا۔ اذان ختم ہوئی تو دعا کر کے میں بڑے ابا کی طرف بڑھا۔
"طہٰ بیٹا! میں اب ٹھیک ہوں، مجھے ذرا اٹھنے میں مدد کرو۔" وہ میرے قریب پہنچتے ہی بولے، ان کی بات سن کر میں نے اپنا ایک بازو ان کے کاندھوں کے گرد حائل کرتے ہوئے انہیں سہارا دیا تو وہ اٹھ کر وضو کرنے چلے گئے۔ وضو کرنے کے بعد وہ وہیں فرش پر بچھے جائے نماز پر کھڑے ہوتے ہوئے بولے کہ وہ آج مسجد نہیں جا پائیں گے وہ گھر ہی نماز ادا کریں گے۔ ان کی بات سن کر میں مسجد میں نماز ادا کرنے چلا گیا۔ جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنے کے بعد میں اشراق کی نماز ادا کر کے ہی مسجد سے لوٹتا تھا، لیکن آج بڑے ابا کی جو طبیعت بہتر نہ تھی تو میں فجر ہی ادا کر کے گھر کی طرف بڑھا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی میں بڑے ابا کے کمرے کی طرف چلا آیا۔ دروازہ کھولتے ہی اندر داخل ہو کر جو میری ان پر نظر پڑی تو جیسے میرے پیروں تلے سے زمین ہی نکل گئی، وہ اوندھے منہ جائے نماز پر پڑے تھے۔
"بڑے ابا۔۔۔ بڑے ابا، آپ ٹھیک تو ہیں۔" میں انہیں پکارتا ہوا ان کی طرف جھکا، انہیں سیدھا کیا، ان کی آنکھیں بڑی تیزی سے جھپک رہی تھیں اور لب آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔ وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں تھے۔ میں نے جھٹ سے انہیں اٹھا کر بستر پر لٹایا اور اپنے کمرے کی جانب گاڑی کی چابی لینے دوڑا، باہر ہی مجھے بابا عبد القادر مل گئے، میں نے انہیں کہا کہ وہ ماں اور ابا کو جلدی سے جگائیں۔ وہ میری حالت کو دیکھتے ہوئے فوراً انہیں جگانے چلے گئے اور میں اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ وہاں سے گاڑی کی چابی لے کر میں واپس بڑے ابا کے کمرے میں پہنچا تو سبھی ان کے پاس کمرے میں موجود تھے، ابا اور بھائی نے بڑے ابا کو اٹھایا اور پھر مجھ سمیت سبھی لوگ ان کے پیچھے پیچھے باہر کی جانب دوڑے، میرے پاس اپنی گاڑی کی چابی تھی، میں نے جھٹ سے آگے بڑھ کر اپنی گاڑی کا دروازہ کھولا تو پھر انہیں پچھلی سیٹ پر لٹا کر مصطفی بھائی نے ساتھ بیٹھتے ہوئے ان کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ ابا میرے ساتھ گاڑی میں بیٹھے اور میں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ راستہ بھر سڑکیں ویران تھیں یہی وجہ تھی کہ میں نے پوری رفتار سے گاڑی دوڑائی اور پھر اسپتال پہنچتے ہی ہم اسٹریچر پر ڈال کر بڑے ابا کو ایمرجنسی میں لے گئے۔ ایمرجنسی میں پہنچ کر میں ایک دو ڈاکٹرز سے الجھ پڑا

کہ وہ جلدی سے بڑے ابا کو ٹریٹمنٹ نہیں دے رہے۔ بھائی میری حالت کو سمجھتا تھا اس نے مجھے حوصلہ رکھنے کی تلقین کی، اتنے میں ماں اور بھابھی بھی ایمرجنسی پہنچ گئے تھے۔ ڈاکٹرز نے چیک اپ کے بعد بتایا کہ بڑے ابا کا بلڈ پریشر شوٹ آؤٹ ہو جانے کی وجہ سے ان کی زندگی خطرے میں تھی۔ انہیں فوراً آئی سی یو میں لے جایا گیا۔ ڈاکٹر کی بات سن کر سبھی جیسے سکتے میں لگ رہے تھے اور ساتھ ہی ایک دوسرے کو حوصلہ رکھنے کی تلقین بھی کر رہے تھے۔ آئی سی یو سے باہر لگی کرسیوں پر بیٹھے میں نے اپنا سر دیوار سے ٹکائے آنکھیں موندے دعائیں کرنی شروع کر دی تھیں۔ کئی گھنٹوں تک میں ایسے ہی آنکھیں موندے دعائیں کرتا رہا اور اس وقت آنکھیں کھولیں جب بھائی نے مجھے آ کر بتایا کہ اللہ نے تمہاری دعائیں سن لیں۔ طٰہ بڑے ابا کو ہوش آ گیا ہے اور اب وہ خطرے سے باہر ہیں۔ میں ان سے ملنے کے لیے بے تاب تھا۔ جب بھائی نے بتایا کہ ڈاکٹرز نے ابھی کئی گھنٹوں تک ان سے بات چیت کرنے سے منع کر رکھا ہے لیکن میری بے تابی دیکھ کر بھائی مجھے بڑے ابا کے پاس لے گیا، مگر اس نے مجھے ان سے بات کرنے سے روکے رکھا۔ شام تک بڑے ابا آئی سی یو سے الگ کمرے میں منتقل ہو گئے تھے اور پھر اگلے ہی روز ان کی طبیعت ٹھیک ہو جانے پر ڈاکٹرز نے ہمیں انہیں گھر لے جانے کی اجازت دے دی اور ہم انہیں گھر لے آئے تھے۔ اگلے دو روز تک تو وہ بالکل ٹھیک ٹھاک رہے لیکن تیسرے روز ان کی طبیعت پھر سے بگڑ گئی، درحقیقت انہیں یہ غم شدت سے کھائے جا رہا تھا کہ مرزا نے ایک تو رشتے سے انکار کر دیا دوسرا وہ بڑے ابا کی طبیعت بگڑنے پر ان کا حال تک دریافت کرنے نہیں پہنچے تھے۔

بڑے ابا کی روز بروز گرتی حالت کو دیکھ کر پھر ایک روز میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ میں خود چچا مرزا کے پاس جاؤں اور ان سے درخواست کروں کہ وہ وقتی طور پر ہی سہی بڑے ابا کے پاس آ کر ان سے کہہ دیں کہ انہیں اس رشتہ سے کوئی اعتراض نہیں، یہ خیال آتے ہی میں نے فیصلہ کیا کہ میں کسی کو بتائے بغیر چچا کے پاس جہانیاں آباد جاؤں گا اور چچا کے پیر پکڑ کر ان سے التجا کروں گا۔ یوں اگلے ہی روز میں کسی کو بھی کچھ بتائے بغیر گاؤں چل پڑا اور راستہ بھر یہی سوچتا رہا کہ اگر چچا مرزا میری بات مان کر بڑے ابا کے پاس چل کر وقتی طور پر رشتے کی ہامی بھر لیں تو بڑے ابا اسی خوشی سے صحت یاب ہو جائیں گے۔ پھر یقینی اور بے یقینی جیسی صورتِ حال سے دوچار میں گاؤں پہنچا اور سیدھا ڈیوڑھی پھلانگ کر حویلی میں داخل ہو گیا۔ مہمان خانے کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں جیسے ہی حویلی کے خاص حصے کی طرف بڑھا دور پنجروں کی لمبی قطار کے پاس مجھے یومنہ کھڑی دکھائی دی۔ وہ ہاتھ میں دانے دنکے والی ٹرے پکڑے پرندوں کو دانہ ڈال رہی تھی اس کی نگاہ جو مجھ پر پڑی تو میں وہیں رک گیا اور وہ بھی دانے دنکے والی ٹرے کو وہیں نیچے رکھ کر میری جانب بڑھی۔ یومنہ کے ہمارے گھر سے جانے کے بعد میرا اس کے ساتھ کوئی کسی قسم کا رابطہ نہ تھا۔ وہ میرے پاس آئی تو آتے ہی اس نے سب سے پہلے مجھ سے بڑے ابا کا حال ہی دریافت کیا۔ میں نے جو اسے بڑے ابا کی روز بروز گرتی صحت کے حوالے سے آگاہ کیا تو وہ بھی میری بات سن کر میری طرح آزردہ دکھائی دینے لگی۔ میں نے اس سے چچا کے بارے میں دریافت کیا کہ وہ اس وقت کہاں ملیں گے لیکن اسے یہ نہیں بتایا کہ میں ان سے کیوں ملنے آیا ہوں۔ اس نے بیٹھک کی جانب اشارہ کرتے

ہوئے کہا کہ وہ اس طرف ہیں اور پھر وہ مجھے اس جانب بڑھتا دیکھ کر خود بھی وہاں سے چلی گئی۔ میں بیٹھک میں داخل ہوا۔ چچا اپنے سامنے چند فائلیں پھیلائے ان پر جھکے بیٹھے تھے۔ میں نے ان کے پاس پہنچ کر انہیں سلام کیا تو وہ مجھے اچانک اپنے سامنے کھڑا پا کر چونک پڑے اور متعجب نگاہوں سے میری جانب دیکھتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ پہلے کی بات اور تھی اب جب میرے گھر والے ان سے میرے رشتے کی بات بھی کر چکے تھے تو انہیں میرا یوں بن بتائے ان کے گھر آنا سخت ناگوار گزرا۔ ان کی متوحش نگاہوں کی پروا کیے بغیر میں نے جھک کر فوراً ان کے پیر پکڑ لیے اور ان سے التجا کرنے لگا کہ وہ بڑے ابا کی زندگی کو بچا لیں۔ میری اگلی رشتے والی تجویز سن کر انہوں نے نفرت سے مجھ سے منہ پھیر لیا۔

"جب تمہارے گھر کے لوگوں نے میری بیٹی کا رشتہ لینے سے انکار کر دیا تھا تو اس وقت تمہارے بڑے ابا کہاں تھے۔ اس وقت تو انہیں کوئی خیال نہیں آیا کہ میں جو خود چل کر رشتہ لے کر گیا تھا، انکار کے بعد مجھ پر کیا بیتے گی، بس ساری زندگی وہ اپنے لاڈلے خورشید عالم کا ہی بھلا سوچتے رہے۔ مجھے بھی ان کی کوئی پروا نہیں۔'' چچا مجھ سے رخ پھیرے بول رہے تھے، لیکن میرے پاس ان کی کہی باتوں کا کوئی جواب نہ تھا، اتنے میں فرزند اور دلدار بھی آ گئے۔ وہ بھی غصے میں لگ رہے تھے اندر پہنچتے ہی وہ اپنے ابا سے بولے کہ اسے کہیں کہ یہ جتنی جلدی ہو سکے اس گھر سے اس گاؤں سے نکل جائے نہیں تو یہ اس کے لیے اچھا نہیں ہوگا۔ ان کی یہ باتیں سن کر میرے دل کو شدید دھچکا پہنچا پھر میں ایک پل وہاں نہ ٹھہر سکا اور سرعت سے کمرہ چھوڑ کر باہر آ گیا، باہر جا کر میں نے آگے بڑھنے سے پہلے ذرا ٹھہر کر اک نظر اس جانب دیکھا جہاں میرے آنے پر یومنہ کھڑی پرندوں کو دانہ ڈال رہی تھی لیکن یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ اب سبھی پنجرے خالی پڑے تھے۔ میں سمجھ گیا تھا کہ یومنہ نے بڑے ابا کی صحت کے صدقے سارے پنچھیوں کو آزاد کر دیا تھا اور دل ہی دل میں مَیں یہ دعا کرتے ہوئے کہ یارب یومنہ کے اس صدقے کو قبول کر لے میں اپنی گاڑی تک پہنچا اور پھر بجھے ہوئے مجروح دل کے ساتھ میں نے گاڑی گھر کی جانب بڑھا دی۔ راستہ بھر مجھے رہ رہ کر بڑے ابا کا خیال ستاتا رہا، میں جو بڑی آس و امید کے ساتھ چچا کے پاس آیا تھا کہ بڑے ابا کی روز بروز گرتی صحت کا سن کر چچا بے تاب ہو کر میرے ساتھ چلنے کو تیار ہو جائیں گے لیکن میری سوچ کے برعکس چچا کے بے حس و بے مروت رویے سے میں سخت دلگیر ہو کر لوٹ رہا تھا، راستہ بھر میں کہیں زیادہ دیر کو نہ ٹھہرا کہ جانے گھر بڑے ابا کیسے ہوں گے۔

جب میں اپنے شہر پہنچا تو ابھی عشاء کی اذانیں ہو رہی تھیں اور جب میں اپنے گھر کے بیرونی دروازے کے پاس پہنچا تو وہاں بہت سی گاڑیاں اور موٹر بائیکس دیکھ کر میرا دل جیسے دھک سے رہ گیا۔ میں نے گاڑی کا ہارن بجایا تو ملازم نے فوراً ہی دروازہ کھول دیا میں نے گاڑی ذرا آگے لے جا کر روک دی تو ملازم نے مجھے پاس آ کر بتایا کہ بڑے ابا کے بہت سے جاننے والے حضرات ان کا حال دریافت کرنے تشریف لائے تھے۔ ملازم کی بات سنتے ہی جیسے مجھے کچھ اطمینان ہوا اور میں نے گاڑی پورچ میں لے جا کر کھڑی کی اور سیدھا پہلے اپنے کمرے میں پہنچا۔ دن بھر کے سفر کی تھکان اتارنے کے لیے کمرے میں پہنچتے ہی میں نے پہلے باتھ لیا اور پھر لباس تبدیل

کرنے کے بعد میں بڑے ابا کے کمرے کی جانب بڑھا جہاں ان کی عیادت کو آئے ان کے دوست احباب جمع تھے۔ کمرے میں داخل ہو کر میں نے سب کو سلام کیا تو بڑے ابا مجھے دیکھتے ہی اپنے پاس بلانے لگے۔ میں تو سوچ رہا تھا کہ بڑے ابا کی عیادت کو انہی کی عمر کے بزرگ حضرات آئے ہوں گے لیکن وہاں تو بچے، بوڑھے، جوان سبھی جمع تھے اور چند بچوں کو تو انہوں نے اپنے ساتھ بستر پر بھی بٹھار کھا تھا۔ کسی نے بڑے ابا کے پاس سے اٹھ کر مجھے جگہ دی تو میں ان کے قریب جا بیٹھا۔ وہ مجھے اپنے دوست احباب یار بیلیوں کے درمیان بیٹھے بے حد خوش دکھائی دے رہے تھے لیکن پھر بات کرتے کرتے بیچ میں ہی وہ ایک دم سے خاموش ہو جاتے اور وہاں بیٹھے سبھی حضرات بھی خاموشی سے جیسے پھر سے ان کے سلسلہ کلام کے آغاز کا انتظار کرنے لگتے لیکن بڑے ابا کے کرب کو فقط میں ہی محسوس کر سکتا تھا۔ انہیں جب مرزا چچا کا خیال آجاتا تو وہ ایک دم سے جیسے مضطرب ہو جاتے اور میں سوچنے لگا کہ آج جو میں چچا مرزا سے مل کر آرہا تھا تو ہو سکتا ہے، میرے وہاں سے پلٹ آنے کے بعد ہی انہیں احساس ہو جائے کہ بڑے ابا کی طبیعت جو اس قدر ناساز ہے تو وہ اپنے خاندان کو لے کر ان کی عیادت کو چلے آئیں، لیکن پھر اگلے دو روز بھی بیت گئے اور میرا یہ خیال جیسے خیال ہی ثابت ہوا۔

تیسرے روز جو میں بڑے ابا کے سرہانے بیٹھا انہیں دوا کھلا رہا تھا تو ماں اور یومنہ کمرے میں داخل ہوئیں، انہیں اچانک دیکھ کر میں خوشی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے یوں لگا یومنہ کے پیچھے ہی چچا مرزا، چچی ان کے صاحبزادے فرزند اور دلدار بھی آرہے ہوں گے لیکن پھر یہ سن کر مجھے مایوسی ہوئی کہ فقط یومنہ اکیلی ہی آئی تھی۔ وہ بڑے ابا کے پاس بیٹھ گئی اور میں کچھ وقت کے لیے باہر چلا گیا اور جب میں دوبارہ کمرے میں لوٹا تو یومنہ بڑے ابا سے واپس جانے کے لیے اجازت لے رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں موجود نمی بتا رہی تھی کہ وہ بڑے ابا کے پاس بیٹھی روتی رہی تھی۔ اب وہ بڑے ابا کے پاس اکیلی ہی موجود تھی۔ ماں بھی میرے جانے کے بعد شاید کمرے سے چلی گئی تھیں۔ بڑے ابا مجھے کہنے لگے کہ میں یومنہ کو باہر تک چھوڑ آؤں تو میں یومنہ کے ساتھ باہر کی جانب بڑھا۔ باہر نکلتے ہی یومنہ مجھے بتانے لگی کہ اس روز میرے گاؤں سے چلے آنے کے بعد ان کے گھر کے سبھی افراد جمع تھے جب اس کی ماں نے مرزا سے بات کی کہ انہوں نے طٰہٰ کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا، انہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا، وہ جس مقصد سے یہاں آیا تھا وہ فقط یہ تھا کہ ابا کی جو صحت روز بروز گرتی چلی جارہی تھی تو وہ ہمیں اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا، لیکن یومنہ نے نہایت افسوس کے ساتھ بتایا کہ چچا نے اس کے جواب میں بھی نہایت تلخ باتیں کی تھیں۔ ماں نے بالآخر انہیں بڑے ابا کی عیادت کے لیے راضی کرنا چاہا لیکن وہ نہیں مانے۔ اگلے ہی روز اسے واپس آنٹی اور انکل کے گھر آنا تھا اور جب وہ اپنی آنٹی اور انکل کے ہاں چلی آئی تو ان کی منت سماجت کے بعد اسے بڑے ابا کی طرف آنے کی اجازت مل گئی تھی پھر جو ایک اور بات مجھے اس سے معلوم پڑی اس کا کچھ اندازہ میں پہلے ہی لگا چکا تھا، وہ بتانے لگی کہ وہ حیران تھی کہ یوں اچانک سے یہ انکل اور آنٹی کو اسے اپنے گھر لے جانے کا خیال کیسے آگیا جبکہ انہیں وہ زندگی بھر میں فقط ایک دو بار ہی ملی تھی۔ تب جو اس نے ایک روز آنٹی سے اس سلسلے میں بات کی تو اس کی ضد پر آنٹی نے

حقیقت اسے بتاہی دی۔ دراصل چچا مرزا نے ہی انہیں بھیجا تھا وہ نہیں چاہتے تھے کہ یومنہ ہماری طرف رہے۔ ہم لوگ اب بیرونی دروازے تک پہنچ چکے تھے لیکن یومنہ کے گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے ہی اپنے دل میں اٹھتے ایک سوال کو میں نے اس کے سامنے کہہ ہی ڈالا۔ میں اس سے جاننا چاہتا تھا کہ جب میں نے اسے اپنی زندگی کا سارا سچ بیان کر ڈالا تو اسے پھر میرے ساتھ رشتے پر اعتراض کیوں نہیں۔

"نفرت انسان سے نہیں بلکہ اس سے سرزد ہوئے گناہ سے ہونی چاہیے"۔ وہ فقط اتنا کہہ کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی اور گاڑی لے کر آگے بڑھ گئی۔ اس کا جواب سن کر میرے چارسُو جیسے کوئی دیجور آندھی چلنے لگی تھی۔ یہ وہی میرے اس سوال کا جواب تھا جو اس روز میں نے اسے ایک رقعے پر لکھ کر دیا تھا اور اب اس کی بات سن کر میں ایک بار پھر سے اپنے ماضی میں جا اترا تھا۔ ریوالور پھر سے میرے ہاتھ میں تھا اور پھر اگلے ہی لمحے کے کچھ حصے میں، میں نے اجمل پر گولی چلادی۔ خون کا ایک فوارہ اس کے سینے سے پھوٹ نکلا۔ میں اس کا مجرم بھی اس کے سامنے تھا، وہ قاتل بھی اس کے سامنے تھا جس نے ایک بے گناہ ہی نہیں بلکہ ایک معصوم انسان پر گولی چلادی اور وہ میرے ہی بہائے خون کی بوندوں سے معافی لکھتا رہا، وہ کس قدر عظیم تھا اور میں کس قدر حقیر۔۔۔ اس نے مجھے معاف کر دیا کہ میں اپنے ہوش وحواس میں ہی نہ تھا نشے کی حالت میں تھا شاید ہوش وحواس میں ہوتا تو اس کی جان تو نہ لیتا۔ اس نے اپنی عظمت کا ثبوت دے دیا۔ "نفرت انسان سے نہیں اس سے سرزد ہوئے گناہ سے ہونی چاہیے۔" اس بات سے میں بابا رب نواز کے پاس انہی لمحوں میں پہنچ چکا تھا جب یہ بات انہوں نے میرے کان میں کہی تھی۔ مجھے میرے سوال کا جواب مل گیا تھا۔ اجمل نے مجھے معاف کیوں کیا، یہ جان کر مجھے اجمل کی ذات کی عظمت وبڑائی پر رشک آنے لگا۔ میں دو روز تک بابا رب نواز کے پاس ان کی خدمت میں وہیں ٹھہرا رہا اور ان دو دنوں میں، میں نے ان کی صحبت میں ایسی ایسی نمازیں ادا کیں کہ جس سے میری زندگی کی کایا ہی پلٹ گئی اور جب تیسرے روز مجھے بڑے ابا نے واپس چلنے کو کہا تو بڑے ابا کی واپس لوٹنے والی بات سن کر میں بے تاب ہو کر بابا رب نواز کے پاس دوزانو ہو کر جا بیٹھا۔ بڑے ابا جو مجھے تلاش کرتے ہوئے وہاں آپہنچے تو انہوں نے بابا رب نواز سے بھی وہی بات کہہ ڈالی۔ بڑے ابا کی بات سن کر بابا رب نواز نے اک نظر میری جانب دیکھا ان کے چہرے پر وہی ملکوتی مسکراہٹ سجی تھی۔ اگلے ہی لمحے انہوں نے اپنے اوپر اوڑھی کالی چادر اتاری اور اسے میرے کاندھوں پر ڈال دیا۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ میں اب اپنے بڑے ابا کی بات مان کر ان کے ہمراہ گھر واپس لوٹ جاؤں۔ وہ میرے دل کا حال سمجھ گئے تھے اور اب ان کی میرے کاندھے پر ڈالی چادر میرے پاؤں کی بیڑی بن گئی تھی۔ پھر میرے پاس کچھ کہنے کو بچا ہی کیا تھا اور جب میں بے دلی کے ساتھ ان کے قدموں سے اٹھنے لگا تو جیسے انہیں مجھ پر رحم آگیا۔

"میاں یہ چادر ہماری امانت ہے، جب اچھے ہو جاؤ تو اسے لوٹا جانا۔" ان کے کہے یہ الفاظ سن کر میں جیسے کھل اٹھا تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ ان کے کہے ان الفاظ کا مطلب کیا تھا وقتی طور پر بڑے ابا کے ساتھ بھیجتے ہوئے انہوں نے مجھے اپنے پاس لوٹ آنے کی دعوت

بھی دے دی تھی۔ اسی خوشی سے سرشار میں بڑے ابا کے ساتھ گھر واپسی کے لیے چل پڑا۔ ہماری گاڑی گھر کی جانب رواں دواں تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ جب میرے بے جان ہوتے وجود کو اسٹریچر پر ڈال کر اسی راستے سے لے جایا جا رہا تھا تو گویا سبھی مایوس ہو چکے تھے اور میرے بچنے کی جیسے کوئی امید ہی باقی نہ تھی لیکن اب میں اپنے پورے ہوش و حواس میں بھلا چنگا گھر کی طرف لوٹ رہا تھا۔ یہ اللہ کی قدرت کا ہی کرشمہ تو تھا اور بابا رب نواز بھی اللہ کی قدرت کا ایک ایسا ہی نایاب کرشمہ تھے، جنہیں اللہ نے علم عطا کر رکھا تھا جس سے وہ خلقِ خدا کی بھلائی کا کام لے رہے تھے۔ بڑے ابا نے چلتے وقت گھر اطلاع کر دی تھی اور پھر راستہ بھر بڑے ابا کے موبائل پر کسی نہ کسی گھر کے فرد کی کال آتی رہی اور یہ سلسلہ ہمارے گھر پہنچنے تک جاری رہا۔ گھر پہنچ کر ایک اور ہی منظر میرا منتظر تھا، ابا نے میرے اچھے ہو جانے کی خوشی میں تب سے دیگیں چڑھانی شروع کر دی تھیں جب ہم صبح بابا رب نواز کے در سے چلے تھے اور اب عصر کا وقت ہو رہا تھا اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری تھا۔ میں گاڑی سے بغیر کسی کے سہارے اترا تو مجھے جیتا جاگتا اپنے پیروں پر کھڑا دیکھ کر سبھی خوشی سے آبدیدہ ہو گئے تھے۔ ماں اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ پائی تھی اور وہ رونے لگی۔ ابا، بھائی، بھابی، عبد القادر مجھے بار بار گلے لگاتے رہے اور میری پیشانی چوم لیتے تھے۔ انہیں ایسے آبدیدہ ہوتے دیکھ کر جیسے میں بھی اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ پایا تھا۔

پھر مجھے لگا جیسے کوئی میرے عقب میں کھڑا میرے کاندھے کو چُھو کر مجھے ہلا رہا تھا۔ میں نے جو مڑ کر دیکھا تو بابا عبد القادر میرے عقب میں کھڑے تھے۔

"صاحب بی بی جی تو کافی دیر سے چلی گئیں آپ اندر آ جائیں۔" یومنہ جا چکی تھی اور اس کی بات سن کر میں خیالوں ہی خیالوں میں کہیں دور جا نکلا تھا۔ جب بابا عبد القادر کی بات سن کر میں خیالوں سے پلٹا۔ میں وہاں سے سیدھا اپنے کمرے کی جانب بڑھا اور کمرے کی تنہائی اور ملگجی روشنی میں، میں ایک بار پھر سے اپنے ماضی کے بیتے ان تلخ دنوں کو یاد کرنے لگا تھا۔ میری خطائیں کس قدر بڑی تھیں کسی رعایت، معافی یا بخشش کے لائق میں کب تھا، لیکن پھر اس رب سوہنے کی عطائیں بھی کس قدر عظیم تھیں، ہماری خطاؤں، ہمارے گناہوں، ہماری لغزشوں کی فہرست چاہے کتنی ہی طویل کیوں نہ ہو، احساس ندامت کے بہائے ایک آنسو کی قیمت اس کی بارگاہ میں سارے گناہوں کا کفارہ بن جاتی ہے۔ میں اب جائے نماز پر سجدے میں گرا بلک رہا تھا، گڑگڑا رہا تھا، اس لیے نہیں کہ میری خطاؤں کی فہرست بہت طویل تھی بلکہ اس لیے کہ اس کی عطا کی حدیں بہت وسیع تھیں۔

اس رات بڑے ابا کی طبیعت اچانک ہی پھر سے بگڑ گئی اور ہمیں ان کو لے کر اسپتال جانا پڑا۔ ان کی نازک حالت کے پیشِ نظر انہیں آئی سی یو میں رکھا گیا تھا اور ہم سبھی پر جیسے پھر سے غموں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ جب ہم انہیں لے کر اسپتال پہنچے تو وہ اپنے ہوش و حواس میں نہ تھے۔ رات دیر کو جو انہیں ہوش آیا تو انہوں نے میرے ابا کو اپنے پاس بلایا اور انہیں کہنے لگے کہ وہ اسپتال کے اس وارڈ میں رہ کر مرنا نہیں چاہتے، لیکن ابا ایسی حالت میں انہیں گھر کیسے لے جا سکتے تھے۔ انہیں تسلی دیتے رہے کہ وہ بہت جلد

اچھے ہو جائیں گے لیکن وہ کسی کی بات ماننے کو ہی نہ آتے تھے۔ اگلے روز جو ذرا سی ان کی طبیعت سنبھلی تو لا محالہ ابا کو انہیں لے کر گھر آنا ہی پڑا، پھر انہوں نے بڑے ابا کے لیے با قاعدہ ڈاکٹر اور نرس کی خدمات گھر پر ہی لے لیں اور میری یہ حالت تھی کہ میں بڑے ابا کے کمرے سے باہر دیوار کے ساتھ لگا رہتا، میری ہمت ہی نہ پڑتی کہ میں اندر جا کر انہیں ایسی حالت میں دیکھ سکوں۔ میں دل ہی دل میں ان کے لیے دعائیں کرتا رہتا، یونہی ایک روز میرے ذہن میں بابا رب نواز کا خیال آیا۔ یہ خیال آتے ہی جیسے مجھے کچھ راحت کا احساس ہوا میری امید جاگی اور میں اسی لمحے گاڑی لے کر بابا رب نواز سے ملنے چل پڑا۔ سوچا انہیں جا کر ساری صورتِ حال سے آگاہ کروں گا۔ چچا مرزا کے انکار سے لے کر بڑے ابا کی روز بروز گرتی صحت تک سبھی کچھ بیان کروں گا اور پھر ان سے بڑے ابا کی صحت کے لیے دعا کرنے کی التجا کروں گا اور اگر وہ راضی ہوئے تو انہیں اپنے ساتھ گھر لے آؤں گا، کہ ان کے قدم رنجہ ہونے سے بڑے ابا پر آئی بپتا ٹل جائے۔ چار سے پانچ گھنٹوں کی طویل مسافت طے کر کے جو میں اپنی منزل مقصود تک پہنچا تو وہاں پہنچ کر مجھے یہ جان کر شدید صدمہ پہنچا کہ بابا رب نواز وہاں نہ تھے اور وہاں موجود ان کے شاگرد بھی یہ نہ جانتے تھے کہ وہ اچانک کہاں چلے گئے تھے۔ بابا رب نواز کے ایک خاص خادم سے مل کر جسے میں اچھی طرح سے جانتا تھا، میں نے اسے اپنا پیغام دیا کہ جب بابا رب نواز لوٹ آئیں تو وہ انہیں میرا یہ پیغام دینا ہرگز نہ بھولیں کہ طٰہٰ بڑی مشکل میں ہے۔ میں اتنا کہہ کر پھر مزید وہاں نہ ٹھہرا اور واپسی کے لیے نکل پڑا۔ راستہ بھر مجھے رہ رہ کر بڑے ابا کا خیال ستاتا رہا۔ بابا رب نواز کا خیال آتے ہی میرے من میں ایک امید بیدار ہوئی تھی، پھر ان سے بھی ملاقات نہ ہو سکی، جانے رب کو کیا منظور تھا۔ میں نصف سے زیادہ کا سفر طے کر چکا تھا جب میرے فون پر بھائی کی کال آئی۔ اس نے مجھے جلد سے جلد گھر پہنچنے کا کہہ کر فون بند کر دیا تھا اور میرے اس کی یہ بات سن کر جیسے ہاتھ پیر پھولنے لگے تھے، میں نے پھر گاڑی کی ریس سے پیر اسی وقت ہٹایا جب میں اپنے گھر کے دروازے تک پہنچ چکا تھا۔ گاڑی پورچ میں کھڑی کر کے میں سیدھا بڑے ابا کے کمرے میں پہنچا، گھر کے سبھی لوگ بڑے ابا کے بستر پر جھکے کھڑے تھے۔ مجھے اندر داخل ہوتا دیکھ کر میرے ابا تر آنکھوں سے میری طرف بڑھے اور میرا ہاتھ تھام کر انہوں نے مجھے بڑے ابا کے عین سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا۔

''لیں ابا جی طٰہٰ آ گیا ہے۔'' یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے ان کی زبان کانپ رہی تھی۔ بڑے ابا نے میری جانب اک نظر اٹھا کر دیکھا اپنا کپکپاتا ہاتھ اٹھانا چاہا میں نے اپنا ہاتھ بڑھا کر ان کا ہاتھ تھام لیا، اگلے ہی پل ان کا ہاتھ میرے ہاتھ میں بے جان ہو کر بھاری ہو گیا۔ ان کی آنکھوں کی روشنی بجھ گئی اور میرے چار سو کھڑے گھر کے سبھی لوگ رونے چلانے لگے۔ وہ جن کے دیکھے بنا میری صبح نہ ہوتی تھی، وہ جن کے پیر دابے بنا میں سوتا نہ تھا وہ جن کی گود میں کھیلے میرا بچپن گزرا تھا وہ جنہوں نے ایک نہیں دو دو بار مجھے موت کے منہ سے نکالا تھا، وہ میرے بڑے ابا اب۔۔۔ نہیں رہے تھے۔ سبھی رو رہے تھے اور میں جیسے پتھر کا مجسمہ بنا کھڑا تھا۔ پھر مسجد میں بڑے ابا کے جنازے کا اعلان ہوا، انہیں غسل دیا گیا اور کفن پہنا کر گلاب کے ہاروں سے سجا کر عطر لگا کر چارپائی کو صحن میں رکھ دیا گیا۔ لیکن میں پتھر کا مجسمہ ہی بنا رہا۔ ماں، ابا، بھائی، بھابھی سبھی مجھے رُلانے کی سعی کرتے رہے لیکن میں رو نہ سکا۔

ماں چلائی "طٰہٰ تیرے بڑے ابا کو لے جا رہے ہیں روک لے بیٹا، لوگ انہیں لے جا رہے ہیں۔" ماں کی یہ بات سن کر میں تب بھی نہ رویا بلکہ اپنی جگہ سے اٹھا اور جنازے کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے میں نے بھی بڑے ابا کے جنازے کو کاندھا دیا۔ اگلے روز صحن کے وسط میں بچھی چٹائیوں پر بیٹھے لوگوں کے پاس ہی ایک طرف میں سر جھکائے بیٹھا تھا۔ میرا دل تھا کہ جیسے سینے میں سلگتا پھٹا جا رہا تھا لیکن میں پتھر کا مجسمہ بنا بیٹھا رہا اور میرا سر بدستور جھکا ہوا تھا جیسے میں زمین کو گھورے جا رہا تھا۔ دفعتاً میری ناک کے نتھنوں سے وہی جانی پہچانی سی لاہوتی خوشبو ٹکرائی اور اگلے ہی لمحے میں ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ سامنے دروازے سے بابا رب نواز اندر داخل ہو کر اب میری جانب ہی بڑھے چلے آ رہے تھے۔ ان پر نظر پڑتے ہی جیسے پھر میں اپنے آپ پر قابو نہ رکھ پایا تھا اور اس قدر دھاڑیں مار مار کر رونے لگا کہ سبھی اپنی جگہوں سے اٹھ کر کھڑے ہوئے اور میری جانب دیکھنے لگے تھے۔ بابا رب نواز نے پاس آ کر میرے کاندھے پہ ہاتھ رکھا اور پھر مجھے اپنے سینے سے لگا لیا۔ ان کے سینے سے لگ کر میں روتا ہی چلا گیا۔ "دیر کر دی۔۔۔ بڑی دیر کر دی۔۔۔ میرے بڑے ابا۔۔۔ دیر کر دی بابا۔" وہ مجھے جتنا چپ کراتے میں اتنا ہی رونے لگتا، زخم تو عمر بھر کا تھا پھر رو دھو کر میں خاموش ہو گیا۔ عصر کی نماز کے بعد میں بابا رب نواز کو بڑے ابا کی قبر پر لے گیا اور ان کے ساتھ بڑے ابا کی مغفرت کے لیے دعا کی وہاں ایک بار پھر میں اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ پایا تھا اور وہاں بھی بابا رب نواز نے مجھے اپنے کاندھے کا سہارا دیئے رکھا۔

وہ اگلے روز تک ہماری طرف ہی ٹھہرے اور جانے سے پہلے وہ مجھے تنہائی میں ملے۔

"طٰہٰ میاں میں نہ کہتا تھا کہ آ جاؤ۔۔۔ میرے پاس چلے آؤ چھوڑ دو اس دنیا کو، جو تمہیں اتنے دکھ اتنے گھاؤ دیتی چلی جا رہی ہے۔ یہاں کوئی کسی کا نہیں بنتا، یہاں سب اپنے سواد کے لیے جیتے ہیں۔ ان کے درمیان رہو گے تو انہی کی طرح کا بننا پڑے گا اور انہی کی طرح کا بنو گے تو وہی دکھ، تکلیفیں اور گھاؤ تو پھر تمہارا مقدر بنیں گے۔ میں تو کہتا ہوں کہ اب بھی زیادہ وقت نہیں بیتا چھوڑ و اسے اور میرے ساتھ چلو، تمہارے پاس سوچنے کے لیے دو روز ہیں دو روز تک میں واپس آؤں گا اگر ساتھ چلنا ہو تو اپنا سامانِ سفر باندھ کر رکھنا۔" بابا رب نواز اتنا کہہ کر چلے گئے اور ان کے جانے کے چند لمحوں بعد ہی میں نے اپنا سامانِ سفر باندھنا شروع کر دیا، سچ ہی تو کہا تھا بابا رب نواز نے یہاں کوئی کسی کا نہیں بنتا اور اگر ان لوگوں کے بیچ میں رہنا ہے تو انہی کے جیسا بننا پڑے گا۔

چچا مرزا آئے بھی تھے اگر تو اس وقت جب ان کے آنے کا کوئی فائدہ ہی نہ تھا۔ یہاں سب اپنے سواد کے لیے جیتے ہیں۔ میں نے بابا رب نواز کے کہے الفاظ کو دہرایا اور میرا سر نفی میں ہلنے لگا۔ میں ان کے جیسا نہیں بننا چاہتا۔ میں ان لوگوں کے بیچ نہیں رہنا چاہتا، پھر مجھے یومنہ کا خیال آنے لگا، میں سوچنے لگا کہ میرے چلے جانے سے اس کا بھی بھلا ہی ہو گا۔ اسے ضرور کوئی ایسا انسان ملے گا جو اسے ہر طرح کی خوشیاں دے سکے گا۔ میں اسے کیا دے سکتا ہوں جس کی اپنی گود کانٹوں سے بھری ہو وہ دوسروں کو پھول کہاں سے دے سکتا ہے، ایسا سوچتے ہوئے جیسے میں اپنے عزم اور ارادے کو اور بھی پختہ بنا رہا تھا۔

دوروز کے بعد جب بابارب نواز لوٹے تو بڑے ابا کے لیے فاتحہ خوانی کے بعد میں ان کے ہمراہ جانے کے لیے بالکل تیار کھڑا تھا اور سبھی سے جب میں آخری بار الوداعی ملاقات کر رہا تھا تو کسی نے مجھے روکنا بھی نہیں چاہا۔ بڑے ابا کے گزر جانے کے بعد بابارب نواز سے میری عقیدت کو دیکھتے ہوئے پھر کسی نے مجھے نہ روکا۔ بابارب نواز نے مجھے بتایا کہ ہم اسی شہر سے ٹرین پکڑیں گے اور اپنی منزل کی طرف نکل پڑیں گے۔ وہ منزل کہاں ہے اور ہمیں جانا کہاں تھا یہ بات انہوں نے مجھے نہیں بتائی تھی۔ مائیکل ہمیں اسٹیشن تک چھوڑنے آیا اور پھر جاتے ہوئے جیسے وہ آبدیدہ سا ہو گیا تھا۔ مائیکل کو گھر روانہ کر کے میں نے اپنا اور بابارب نواز کا سامان اٹھا کر ٹرین میں اپنی نشست کے پاس ہی احتیاط سے رکھا اور پھر بابارب نواز کے ساتھ کھڑکی والی سیٹ پر بیٹھا میں گاڑی کے چلنے کا انتظار کرنے لگا۔ پلیٹ فارم پر حسبِ معمول بہت بھیڑ بھاڑ دکھائی دے رہی تھی۔ اسی بھیڑ بھاڑ میں مجھے سامنے وہ بینچ دکھائی دیا جس پر بیٹھے ہوئے میں نے یومنہ کو اپنی زندگی کی داستان سنائی تھی۔ ٹرین کی پہلی سیٹی بجی۔ مسافر تیزی سے ٹرین میں سوار ہونے لگے۔ الوداعی ملاقات کے لیے آئے لوگوں کے چہروں پر جہاں اپنے پیاروں سے بچھڑنے کا غم تھا وہیں دوبارہ آملنے کی خوشی بھی نمی بن کر جھلک رہی تھی۔ دوسری اور تیسری سیٹی کے ساتھ ہی ٹرین نے جھٹکے کے ساتھ پلیٹ فارم کو چھوڑا اور دھیرے دھیرے سرکتے ہوئے آگے کو بڑھنے لگی اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے اپنوں کے ساتھ میرا شہر بھی مجھ سے بچھڑ رہا ہو۔ چند ہی منٹوں میں ٹرین نے اپنی رفتار پکڑ لی تھی۔ اب میرا شہر بھی مجھ سے کوسوں دور پیچھے رہ گیا تھا اور ہم آگے ہی آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ راستے میں کوئی چھوٹے اسٹیشن اور پلیٹ فارم آئے، جن پر چند منٹوں کے لیے گاڑی رکتی اور پھر سے مسافروں کو لیے اگلے پڑاؤ کے لیے چل پڑتی۔ ٹرین کو اب چلے ہوئے ڈھائی تین گھنٹے ہو چکے تھے۔ ''اگلا اسٹیشن جہانیاں آباد ہی ہے ناں۔'' اچانک سے میرے بالکل سامنے والی سیٹ پر بیٹھے ایک شخص نے مجھ سے سوال کیا۔ مجھے چپ چاپ حیرت زدہ سا پا کر بابارب نواز نے جواب دیا کہ وہ صاحب صحیح کہہ رہے ہیں۔

اگلا اسٹیشن جہانیاں آباد ہی ہے۔ یہ سنتے ہی جیسے ایک بار پھر سے مجھے یومنہ کا خیال آنے لگا۔ ''آپ پوچھیں گے نہیں طٰہ آج اس گھر سے جاتے ہوئے میں نے آپ کا تحفتاً دیا عبایا کیوں پہن رکھا ہے۔ طٰہ میں یہ دکھانا چاہتی ہوں کہ مجھے اس گھر میں آ کر کیا حاصل ہوا اور میں جو اس گھر میں فقط چند روز ہی گزار کر یہاں سے جا رہی ہوں تو میں اس گھر سے کیا لے کر جا رہی ہوں۔ میں آپ کے آنگن سے شرم وحیاء کا حجاب لے کر جا رہی ہوں۔ آپ سے مل کر میں نے زندگی کا اصل مقصد پا لیا ہے۔'' کیا میں اس قابل تھا کہ کوئی مجھ جیسے سے مل کر اتنا کہہ دے کہ آپ سے مل کر میں نے اپنی زندگی کا اصل مقصد پا لیا ہے۔ میں یونہی خیالوں میں گم صم بیٹھا تھا، جب بابارب نواز مجھ سے مخاطب ہوئے۔

''طٰہ میاں وہ رب سوہنا انسان کو کئی طرح سے آزماتا ہے۔ کبھی روپیہ پیسہ آزمائش بن جاتا ہے، تو کبھی اولاد آزمائش بن جاتی ہے۔ کبھی وہ ہم سے صحت و تندرستی لے کر ہم پر بیماری بھیج دیتا ہے، تو کبھی ہم سے ہمارا کوئی اپنا پیارا چھین لیتا ہے۔ جو کوئی ان کڑی

آزمائشوں پر پورا اترتا ہے تو پھر وہ ہماری نیتوں کو دیکھتا ہے، اگر ہم نے سچے دل سے اسے رب مانا تو یقیناً ہم اسے اپنے مال اولاد صحت و تندرستی سے زیادہ بڑھ کر جانیں گے اور تب اس کی رحمت کی جو برسات ہوتی ہے تو ایسا جل تھل ہو جاتا ہے کہ پھر انسان اس کی رحمت سے کبھی مایوس نہیں ہوتا۔'' بابارب نواز کی یہ باتیں سن کر میں سوچ رہا تھا کہ انہوں نے اپنی تعلیم کا آغاز کر دیا تھا۔ ان کی آخری بات کے ساتھ ہی ٹرین ایک جھٹکے کے ساتھ جہانیاں آباد کے اسٹیشن پر جا رکی۔

''طٰہٰ میاں تمہاری آزمائش فقط جہانیاں آباد کے اس اسٹیشن تک کی ہی تھی۔'' بابارب نواز کی یہ بات سنتے ہی میں نے حیرت سے چونک کر ان کی جانب دیکھا۔ وہ میری جانب دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔

''کیا سوچ رہے ہو میاں چلو نیچے اترو، مجھے تمہیں کسی سے ملوانا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور میرا ہاتھ تھام کر مجھے ٹرین کے ڈبے سے نیچے لے گئے۔ ٹرین کے ڈبے سے اترتے ہوئے میں کچھ بھی سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے، لیکن کسی انجانے احساس سے میرے دل کی دھڑکن جیسے بے قابو ہو رہی تھی۔ جہانیاں آباد کے چھوٹے سے پلیٹ فارم پر زیادہ بھیڑ بھاڑ نہ تھی۔ نیچے اترتے ہی میری نظر سامنے کچھ فاصلے پر کھڑے چچا مرزا پر پڑی، میں نے یوں پلٹ کر حیرت سے ایک بار پھر بابارب نواز کی طرف دیکھا۔

وہ میرا ہاتھ یوں مضبوطی سے تھامے ہوئے تھے جیسے انہیں ڈر ہو کہ میں ان کا ہاتھ چھڑا کر بھاگ نہ جاؤں۔ انہوں نے چچا مرزا کے پاس پہنچ کر میرا ہاتھ ان کے ہاتھ میں تھما دیا۔ چچا مرزا کے چہرے کی جانب جو میری نگاہ اٹھی تو ان کا آنسوؤں سے تر چہرہ دیکھ کر بے ساختہ میں ان سے لپٹ کر رونے لگا۔ ان کے عقب میں میری نگاہ چچی پر پڑی۔ انہوں نے اپنا ہاتھ بڑھا کر میرے سر پر رکھا تو وہ بھی اپنے آپ پر قابو نہ رکھ پائی تھی۔ بابارب نواز نے آگے بڑھ کر یومنہ کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے اپنے گلے سے لگا لیا پھر فرزند اور دلدار بھی مجھ سے گلے مل کر بڑے ابا کو یاد کر کے روتے رہے۔

ٹرین نے پہلی سیٹی بجائی بابارب نواز نے چچا مرزا سے مل کر اجازت چاہی اور پھر وہ میری جانب متوجہ ہوئے۔

''میاں تمہارے نکاح پر تو ہم نہیں آپائیں گے، ہماری طرف سے یہ ایک ادنیٰ سا تحفہ قبول کرو۔'' مجھے ساتھ لیے ڈبے سے اترتے ہوئے انہوں نے ایک ہاتھ میں ایک بیگ بھی اٹھا رکھا تھا۔ وہ بیگ انہوں نے میری طرف بڑھا دیا۔ ٹرین اب دھیرے دھیرے پلیٹ فارم چھوڑ کر آگے بڑھ رہی تھی۔ پھر میرے لیے بابارب نواز سے بچھڑنا بھی کسی عذاب سے کم نہ تھا لیکن میں جانتا تھا کہ وہ رکنے والے نہ تھے۔ انہیں جب مجھ سے بچھڑنا ہوتا تھا وہ مجھے اپنی کوئی نہ کوئی نشانی سونپ دیا کرتے تھے اور ابھی چند ثانیے پہلے وہ ایسا کر چکے تھے۔ میں نے آگے بڑھ کر انہیں سہارا دے کر آگے کو رینگتی ٹرین پر سوار کیا تو وہ انہیں لے کر آگے بڑھ گئی۔ میں نے ہاتھ میں ان کے تحفتاً دیئے بیگ کی جو زپ کھولی تو اس میں وہی کالی چادر تھی جس کی لاہوتی خوشبو مجھے مسحور کیے رکھتی تھی۔ میں

نے مڑ کر دیکھا چچا کا پورا خاندان بابا رب نواز کو ہاتھ ہلا ہلا کر الوداع کہہ رہا تھا، یہ دیکھ کر مجھے بابا رب نواز کے کہے وہ آخری کلمات یاد آ رہے تھے۔

"اس کی رحمت کی جو برسات ہوتی ہے تو ایسا جل تھل ہو جاتا ہے کہ پھر انسان اس کی رحمت سے کبھی مایوس نہیں ہوتا۔"

☆☆☆☆☆☆☆

باب 8

راحت ووفا

آج پندرہ سالوں بعد میں اپنے دیس کی فضاؤں میں لوٹ رہا تھا کچھ ہی سمے میں ہم علامہ اقبال انٹرنیشنل ائیر پورٹ کے رن وے پر اترنے والے تھے۔ ہوائی جہاز کی میزبان حفاظتی بیلٹ باندھنے کے لیے اعلان کر رہی تھی۔ میں نے بائیں جانب گردن گھما کر دیکھا میرے دونوں بچے تانیہ اور آیان اعلان سنتے ہی اپنے اپنے حفاظتی بیلٹ باندھ رہے تھے۔ یہ تسلی ہو جانے پر کہ دونوں نے اچھے سے حفاظتی بیلٹ باندھ لیے تھے میں نے دائیں جانب میرے ساتھ بیٹھی یومنہ کی طرف دیکھا۔ وہ بے حد پُر مسرت دکھائی دے رہی تھی اور ہمیشہ کی طرح ڈرتے ہوئے اس نے میرے ایک بازو کو مضبوطی سے اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کے سر کو اپنے کاندھے سے لگا لیا اور وہ نگاہیں اٹھائے مسکاتے ہوئے وارفتگی سے میری جانب دیکھتی رہی اور میں سوچ رہا تھا کہ ان پندرہ سالوں میں، میں نے ایسا وہ سب کچھ پایا تھا جو میں نے کبھی خواب وخیال میں نہ سوچا تھا اور ایسا کچھ اتنا کھویا تھا کہ جو میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھا۔ آج برسوں بعد میں پھر سے عجب سیمابی کیفیت میں مبتلا ہو رہا تھا جہاز کی سیڑھیاں اترتے ہوئے مجھے یہ احساس ہو رہا تھا کہ مجھ سے جڑے خواب، خیال اور یادیں میرا پیچھا چھوڑنے کو تیار نہ تھے۔ یہ وہی ائیر پورٹ تھا جہاں میں عبیرہ کو راحت عبدالغنی سے ملوانے لایا تھا راحت میرے لیے وہ ہستی تھی جس نے مجھے واقعتاً عشق کا مفہوم سمجھایا تھا جس ذات سے میں نے عشق کے آداب وتقاضے سیکھے اور میرا عشق تو فقط ایک بساط کا کھیل ہی تھا۔ دھیرے دھیرے جہاز کی سیڑھیاں اترتے ہوئے میں اپنے ماضی میں پہنچ چکا تھا۔

اس روز گھر میں عجب تلاطم بپا تھا بڑے ابا کو میں نے پہلے کبھی اتنا شدید غصے میں نہ دیکھا تھا انہوں نے حویلی کے صحن میں سبھی چھوٹے بڑوں اور ملازموں کو جمع کر رکھا تھا جب سبھی وہاں جمع ہو گئے تو بڑے ابا کی رعب دار اونچی آواز سن کر میں بھی ایک جانب سے سیڑھیاں اترتے ہوئے ان کے قریب جا کھڑا ہوا تھا وہ میرے اتنے پیار کرنے والے بڑے ابا تھے کہ کبھی جو جوش وارفتگی سے میں عقب سے آ کر انہیں اپنی بانہوں کے حصار میں لے کر اٹھا لیا کرتا تھا تو وہ پھر چھوٹتے ہی کیسے لاٹھی اٹھائے میرے تعاقب میں دوڑتے تھے اور میں جو اپنے دونوں بازوؤں کو ڈھال بنا کر زمین پر بیٹھ جایا کرتا تھا تو پھر میرے قریب پہنچ کر بجائے مجھے مارنے کے لاٹھی پھینک کر مجھے اپنے سینے سے لگا لیا کرتے تھے۔ گویا میں آج بھی ان کے لیے وہی دو چار سال کا نٹ کھٹ ساطہٰ عالم تھا۔

آج انہی بے پناہ محبت دینے والے بڑے ابا کے سامنے مجھے نگاہیں اٹھانے کی جرأت نہیں ہو پارہی تھی اور اب جو وہ بول رہے تھے اس نے میری ہمت اور بھی پست بنادی تھی مجھے فقط ان کا ایک ہاتھ دکھائی دے رہا تھا جس ہاتھ سے انہوں نے لاٹھی تھام رکھی تھی جو پینڈولم کی طرح مسلسل جھوم رہی تھی اور دوسرا ہاتھ جو میری جانب اٹھا تھا اسے دیکھنے کی مجھ میں ہمت نہ تھی۔

"پوچھو اس سے کہ اس گھر کی دہلیز پار کرتے ہوئے جسے اپنے والدین کی عزت کا خیال تک نہیں آیا وہ اس وقت کہاں ہے؟ کہاں چھپا رکھا ہے چوہدری عبدالغنی کی بیٹی کو؟ میں کہتا ہوں اسے میرے سامنے لاؤ میں اس سے خود پوچھتا ہوں کہ اسے اگر اپنے خاندان کی عزت غیرت کا پاس لحاظ باقی نہیں رہا تو ہماری عزت کو تو یوں داغ دار نہ کرتی پھرے۔" آخری بات کہتے ہوئے بڑے ابا کی رعب دار آواز میں قدرے پستی اور ملال تھا اور میں جو یہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں اس سارے معاملے سے بے خبر ہوں بڑے ابا کے مجھ سے سوال اٹھانے پر اب سبھی کا ردعمل دیکھنے کو بڑی ہمت جتا کر میں نے اک لمحہ بھر کو نگاہ اٹھا کر دیکھا سب سے پہلی نگاہ جو چچا مرزا پر پڑی وہ شدید غصہ میں لگ رہے تھے۔ ان کی آگ برساتی نگاہوں کی تاب نہ لاتے ہوئے میری نظر ساتھ ہی کھڑی ماں پر پڑی وہ مجھے متعجب نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ جن میں اَن گنت سوال تھے۔ میرے قریب ہی میرے ابا خورشید عالم کھڑے تھے، میری نگاہ جو ان سے ملی تو جیسے نخلستان میں پیاسے کو پانی مل گیا ہو۔ وہ مجھے فقط چپ رہنے کا اشارہ کر رہے تھے۔ وہ دو ایک قدم چل کر ذرا سا میرے قریب ہوئے وہ مجھے کاندھے سے تھامے مجھے جھنجوڑتے ہوئے مخاطب ہوئے۔

"میں یہ سب کیا سن رہا ہوں، تمہارے بڑے ابا یہ کیا بول رہے ہیں، طہٰ۔" وہ اتنا کہہ کر خاموش ہوگئے وہاں کھڑے گھر کے سبھی لوگ اسے میرے ابا کی طرف سے سرزنش سمجھ رہے ہوں گے۔ انہیں ایسا ہی محسوس ہوا ہوگا لیکن فقط میں یہ بات جانتا تھا کہ درحقیقت انہوں نے مجھے تھپکی لگائی تھی۔

وہ چوہدری عبدالغنی جو ابا کے مقابلے میں ہر سال الیکشن جیت جایا کرتے تھے جو ابا کے سیاسی حریف تھے۔ راحت عبدالغنی انہی کی بیٹی تھی اور میرے ابا خورشید عالم جانتے تھے کہ جو مہرہ ان کے ہاتھ لگا تھا وہ سیاست کی بساط میں کسی بھی لمحے بازی پلٹنے کی اہلیت رکھتا تھا۔ وہ اسی مقصد سے مجھے تھپکی لگا رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ وہ بڑے ابا کے رعب اور دبدبے کے سامنے بے حد ڈرے ہوئے بھی لگ رہے تھے۔ انہیں خوف اس بات کا تھا کہ اگر یہ ثابت ہوگیا کہ واقعتاً ان کے سیاسی حریف چوہدری عبدالغنی کی دختر اور ان کے بیٹے طہٰ کے درمیان کوئی معاملہ ہے تو پھر آج ہی فیصلہ ہو جائے گا۔ ہاتھ لگا موقع ان کے ہاتھ سے نکل جائے گا ان کے ہاتھ ایسا تاش کا پتا لگا تھا جسے وہ موقع آنے پر ہی پھینکنا چاہتے تھے اور یہ تبھی ممکن تھا کہ اگر یہ بات دبی رہے کہ ان کا چراغ کیا گل کھلا رہا ہے۔ نہ جانے کس بدبخت نے بڑے ابا کے کان میں پھونک دیا تھا کہ آج چوہدری عبدالغنی کی بیٹی کالا عبایا اوڑھے ان کے گھر داخل ہوئی تھی اور پھر میرے اور راحت کے درمیان چل رہے عشق کے کھیل کا بھی انہیں پتا لگ چکا تھا جو وہ دوسروں کی عزت پر سایہ کیے رہتے وہ اپنی عزت لٹتے کیسے برداشت کر سکتے تھے۔ مجھے اچھے سے یاد ہے جب ہمارے ہمسائے ماں جائے موسیٰ کی بیٹی کو کسی نے اٹھا

لے جانے کی دھمکی دی تھی تو موسیٰ بھائی بڑے ابا کے پاس یہ کہنے بھی نہ آئے تھے کہ خوشی محمد میری عزت کو بچالے تیرا توزور بھی چلتا ہے انہیں تو فقط کہیں سے یہ بھنک لگی تھی کہ جہاں کہیں ان کی دختر کا لگن طے ہوا تھا وہ بعد میں معلوم پڑا کہ کوئی اچھے لوگ نہ تھے موسیٰ بھائی نے لگن توڑ دیا اور وہ ایسا کرتے ہی انہیں اوقات دکھانے آگئے۔ جس روز بڑے ابا کو اتنا معلوم پڑا، انہوں نے اسلحہ کی پیٹیاں گھر میں ڈھیر لگالی۔ اوپر چھت کا عقبی حصہ جہاں سے موسیٰ بھائی کے گھر داخل ہونے نکلنے کے سبھی راستوں پر نظر رکھی جا سکتی تھی بڑے ابا وہاں مورچہ لگا کر بیٹھ گئے وہ جانتے تھے کہ دن کے اجالے میں ایسی جرأت کسی میں نہ تھی کہ خوشی محمد کے محلے کی عزت کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے، ایسی بزدلانہ حرکت کوئی رات کی تاریکی میں ہی کر سکتا تھا۔ بڑے ابا دن بھر سوتے اور رات پہرے دار بنے مورچے میں سپاہی کی طرح چاک وچوبند حفاظت کے لیے کھڑے رہتے۔ یہ بڑے ابا کی جرأت دلیری ہی تھی کہ دشمنوں تک بھی یہ خبر جا پہنچی تھی کہ موسیٰ بھائی کی بیٹی کی طرف کوئی نگاہ اٹھانے کی بھی جرأت نہ کرے ان کی عزت کی رکھوالی خود خوشی محمد کر رہے تھے۔ کئی روز تک بڑے ابا پہرا دیتے رہے اور ایک روز موسیٰ بھائی بھیگی آنکھوں کے ساتھ بڑے ابا کے پاس آئے انہوں نے اپنی دختر کو کسی اچھے سے گھرانے میں عزت کے ساتھ رخصت کر دیا تھا وہ بڑے ابا کے بے حد مشکور تھے۔

"یہ کیا بتائے گا کبھی کسی چور نے بھی کہا ہے کہ چوری میں نے کی ہے۔ یہ ساری تمہاری ڈھیل کا نتیجہ ہے خورشید عالم۔" میں چچا مرزا کی بات سن کر ایک دم سے خیالوں کے دائرے سے پلٹا وہ میرے ابا سے بات کرنے کے بعد بڑے ابا سے مخاطب تھے۔

"اسے باہر ووٹ اکٹھے کرنے سے فرصت ملے تو دیکھے ناں کہ گھر میں کیا ہو رہا ہے۔ ہماری اپنی بچیاں بھی توکل کو جوان ہوں گی ان کے ذہنوں پر کیا اثر ہو گا۔" ایسا کہتے ہوئے چچا کا غصہ اور ندامت سے سر جھک گیا وہ بڑے ابا کے سامنے سر جھکائے ان کے فیصلے کے منتظر تھے لیکن فیصلہ تو تب ہونا تھا جب یہ ثابت ہو جاتا کہ واقعتاً چوہدری عبدالغنی کی بیٹی آج اس حویلی میں موجود تھی۔

راحت عبدالغنی سے میری پہلی ملاقات اکیڈمی میں ہوئی تھی۔ میں تو اس کا نام تک نہیں جانتا تھا تب تک میں نہیں جانتا تھا کہ وہ چوہدری عبدالغنی کی بیٹی تھی۔ میں تو بس اس جنون میں رہتا تھا کہ مجھے بھی مصطفی عالم کی طرح صوبے بھر میں پوزیشن لینا تھی۔ ہم دونوں مختلف کالجز سے ایف ایس سی کر رہے تھے لیکن وہ شہر کی واحد اکیڈمی تھی جس کی فیکلٹی بہت عمدہ تھی سبھی ٹاپ پوزیشن ہولڈرز اس اکیڈمی سے رخصت ہوتے تھے خود بڑے بھائی مصطفی عالم بھی اسی اکیڈمی سے فارغ التحصیل تھے۔ اس روز معمول کے مطابق میں اکیڈمی پہنچا لیکن مجھے کچھ تاخیر ہو چکی تھی پروفیسر لیکچر کا آغاز کر چکے تھے پہلی دو قطاروں میں لڑکیاں بیٹھا کرتی تھیں اور اس کے بعد ہال کے عقبی حصے تک لڑکے بیٹھے ہوتے تھے ظاہر سی بات تھی مجھے پچھلی ہی کسی نشست میں جگہ ملا کرتی تھی لیکن آج جب مجھے اکیڈمی پہنچنے میں دیر ہو چکی تھی تو وہاں ہال میں پہنچ کر میں نے نظر دوڑائی پچھلی ساری نشستیں پر ہو چکی تھیں میں نے اگلی قطاروں میں دیکھا ایک نشست خالی پڑی تھی اس سے پہلے کہ میں ہال کے عقبی حصے کی جانب بڑھتا اور آج کھڑا ہو کر لیکچر سنتا مجھے ہمارے استاد نے اشارے سے لڑکیوں کی قطار میں موجود پہلی خالی نشست پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور میں کچھ جھجکتا شرماتا اس خالی کرسی

پر جا بیٹھا۔ بیٹھتے ہی میں نے اک نگاہ اٹھا کر اپنے بائیں جانب بیٹھی لڑکی کی طرف دیکھا عین اسی لمحے اس نے بھی میری جانب ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی اور پھر وہ بھی لیکچر نوٹ کرنے میں لگ گئی اور میں نے بھی جھٹ سے اپنی نوٹ بک نکالی اور لیکچر سنتے ہوئے جہاں کوئی خاص بات ہوتی اسے میں اپنی نوٹ بک میں درج کر لیتا۔ مختصر دورانیے کا یہ پیریڈیوں ہی اپنے اختتام کو پہنچا اور میں نے جھٹ سے نوٹ بک اپنے بیگ میں رکھی تیز تیز قدم بڑھاتا بائیک سٹینڈ تک پہنچا اور بیٹھتے ہی کک لگا کر دوسری اکیڈمی کی جانب چل پڑا بس یہی معمول تھا میرا نہ تو کوئی لڑکا یہاں اس اکیڈمی میں میرا دوست تھا اور نہ ہی مجھے اتنی فرصت تھی کہ میں چوری چوری نگاہوں ہی نگاہوں میں کسی لڑکی سے تعلق نباہنے کی جہد کرتا۔

اگلے روز میں معمول کے مطابق وقت پر اکیڈمی پہنچا تھا لیکن اس روز میرے ساتھ ایک خلافِ معمول واقعہ پیش آیا تھا۔ اس روز راحت عبد الغنی کو اکیڈمی پہنچنے میں دیر ہو گئی تھی سبھی پہلی قطاریں پُر تھیں اور آج فقط میرے ساتھ والی نشست خالی پڑی تھی مجھے نہیں علم وہ کب میرے پاس پڑی خالی نشست پر آ کر بیٹھ چکی تھی۔ پیریڈ کے اختتام پر ایک ہاتھ میری جانب بڑھا۔

"مجھے راحت عبد الغنی کہتے ہیں اور آپ۔" میں نے چونک کر اس کی جانب دیکھا وہ مسکراتے ہوئے بے حد حسین لگ رہی تھی اور اس کا ہاتھ ابھی تک ہوا میں ہی معلق تھا لا محالہ میں نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔

"جی مجھے طٰہ عالم کہتے ہیں۔"

"نائس ٹو میٹ یو۔" یہ کہتے ہوئے وہ اٹھی اور چلی گئی اور میں جیسے دھیرے دھیرے کچھ سوچتے ہوئے اپنی نشست سے اٹھا وہ دروازے سے باہر جا رہی تھی جب ایک بار پھر سے اس نے پلٹ کر مجھے دیکھا۔

"بائے۔" اس نے وہیں کھڑے ہاتھ کے اشارے سے مجھے الوداع کیا اور جواباً میں نے فقط اپنا سر ہلانے سے ہی کام چلایا پھر میں بھی بائیک اسٹینڈ تک باہر آ پہنچا تب تک وہ بی ایم ڈبلیو اسے لے کر آگے بڑھ چکی تھی۔

آج بائیک کو کک لگا کر میں اُڑا ہی جا رہا تھا دل تھا کہ سینے سے پھٹ کر باہر آنے کو بے تاب ہوئے جا رہا تھا۔ فروری کی سردھوا مجھ میں نرم گرم کو سا کوسا احساس جگا رہی تھی۔ مچلتی بہار، میٹھی میٹھی دھوپ پورب سے چلتی پروائی سبھی کچھ اتنا بدلا سا کیوں لگ رہا تھا گلے میں سردی سے بچنے کے لیے لٹکے رومال کو کھول کر ہوا میں لہرانے کو جی چاہ رہا تھا۔ اس روز میں دوسری اکیڈمی نہیں گیا ویسے بھی دوسری اکیڈمی میں نے فقط ٹیسٹ دینے کے لیے ہی جوائن کر رکھی تھی۔

گھر پہنچ کر میں سیدھا اپنے کمرے میں پہنچا اور دیر تک آئینے میں کھڑا خود کو دیکھتا رہا کبھی خود کو ہی دیکھ کر مسکرانے لگتا تو کبھی بال بنانے لگتا۔

"مجھے راحت عبد الغنی کہتے ہیں۔" مجھے اپنی جانب بڑھا اس کا ہاتھ گویا پھر سے دکھائی دے رہا تھا جی مجھے طٰہ عالم کہتے ہیں میں نے آئینے کے سامنے اپنا ہاتھ بڑھایا اور پھر اسی ہاتھ کو اپنے بالوں میں گھما کر اچھل کر بیڈ پر چھلانگ لگا دی۔

''کون ہے وہ؟ مسٹر طٰہٰ عالم۔''میں خود سے ہی مخاطب تھا۔''بی ایم ڈبلیو سے تو لگتا ہے کوئی بات بن سکتی ہے۔''کسے بتاؤں اکیڈمی میں تو میں نے کوئی دوست بھی نہ بنایا تھا کبھی پڑھائی سے سر اٹھانے کی فرصت ہی نہ ملی تھی کہ دوست بناتا اور اللہ نے ذہن بھی ایسا عطا کیا تھا کہ مجھے ضرورت نہ تھی کہ میں کسی سے مدد حاصل کرنے کے لیے دوستی کرتا پھر یکایک مجھے ضیاء کا خیال آیا میرے گھر سے ایک گھر چھوڑ کر تیسرا گھر اس کا تھا۔ وہ میرا قریبی ہمسایہ اور بچپن کا دوست بھی تھا بچپن میں کی سبھی شرارتوں کا ماسٹر مائنڈ وہی ہوا کرتا تھا۔ چھرے والی بندوق سے ننھی منی چڑیوں کا شکار ہو یا نہر کنارے سارا دن کانٹا ڈالے مچھلی لگنے کا انتظار بگو کے گھر سے بیر اور امرود چرانے ہوں یا سائیکل کی ریس وہ ہر کام میں مجھ سے دو ہاتھ آگے ہی رہتا تھا لیکن اب اس کے دو ہی شوق باقی تھے۔ ڈور، دھاگا پتنگ اور ون ویلنگ اور میں جانتا تھا کہ وہ مجھے اس وقت کہاں مل سکتا تھا۔ میں اپنے کمرے سے نکلا اور سیدھا چھت پر جا پہنچا اجلے نیلے آسمان پر کہیں کہیں دودھیا سفید بادل دکھائی دے رہے تھے ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی سردھوا سورج کی کرنوں سے دہک کر نرم گرم سی محسوس ہو رہی تھی اور میری نگاہیں آسمان کی وسعتوں پر ہی مرکوز تھیں۔ ضیا مجھے اپنی چھت پر دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن اس کی موجودگی یا غیر موجودگی کا پتا آسمان پر اڑتی پتنگ سے ہی لگایا جا سکتا تھا اور اگلے ہی پل مجھے اوپر بہت اوپر بادلوں سے بھی آگے پدی کی طرح اڑتی اس کی پتنگ دکھائی دی اور میرا من اس لمحے چاہا میں چھتیں پھلانگتا ہوا جاؤں اور ضیاء جس ڈور سے پتنگ اڑا رہا تھا اس ڈور سے جڑا میں بھی اوپر بہت اوپر بادلوں سے بھی آگے پہنچ جاؤں اور جب نیچے دیکھوں تو مجھے راحت عبدالغنی اپنے گھر کی چھت پر کھڑی دکھائی دے جائے۔ راحت کا خیال آتے ہی میں نے ہوا سے اڑتے بے ترتیب ہوتے اپنے بالوں کو ہاتھ بڑھا کر اپنی جگہ بٹھانے کی ناکام کوشش کی اور پھر اگلے ہی لمحے گھر کی چھت پھلانگ کر میں ضیاء کے گھر کی چھت پر جا پہنچا وہ چھت پر پڑی چارپائی پر لیٹا ہاتھ میں پتنگ کی ڈور تھامے میٹھی میٹھی دھوپ میں جیسے اونگھنے والا ہی تھا جب میں دبے پاؤں چپکے چپکے سے جا کر اس کے پاس چارپائی پر جا بیٹھا یکایک اس نے اپنے قریب کسی کی موجودگی کو محسوس کر لیا تھا سورج کی تیز کرنوں سے بچنے کے لیے وہ آنکھیں موندے پڑا تھا آنکھیں کھلتے ہی وہ مجھے اپنے پاس بیٹھا دیکھ کر مسکراتا ہوا اٹھ بیٹھا۔

''شہزادے آج میری یاد کیسے آگئی؟''اس نے پتنگ کی ڈور کو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کیا اور اپنا ہاتھ میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ میں نے اگلے ہی پل اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر خود سے ذرا قریب کر لیا اور پھر رازدارانہ انداز میں اسے بیتے دو دنوں کی ساری روداد سنا دی۔ میری باتیں سن کر جیسے اس کی آنکھوں کی چمک ذرا بڑھ گئی تھی، وہ سمجھ گیا تھا کہ اسے سب کچھ بتانے کے پیچھے میرا کیا مقصد تھا مجھ سے دریافت کرنے لگا کہ تم اسے جانتے ہو وہ کون ہے۔ کہاں رہتی ہے لاعلمی کا اظہار کرنے پر وہ مجھے بتانے لگا کہ کیسے میں پہلے یہ پتا لگاؤں کہ وہ کون ہے، خاندان کون سا ہے رہتی کہاں ہے اور جب ضیاء سے یہ ساری باتیں جان کر میں گھر واپس لوٹ رہا تھا تو مجھے ضیاء بہت پیارا لگ رہا تھا۔ ایک ایسا دوست جسے میں اپنی ساری کہی اَن کہی کہہ سکتا تھا۔

اگلے روز کلاس میں پھر ایک غیر متوقع واقعہ پیش آیا۔ راحت عبد الغنی آج کسی مجبوری سے نہیں بلکہ خود اپنی منشاء سے میرے ساتھ والی کرسی پر آبیٹھی۔ میں نے اس کے سلام کا جواب دیا اور پھر لیکچر شروع ہو گیا۔ کل اکیڈمی سے لوٹ کر میں نے اپنا بیگ تک نہ کھولا تھا اسی وجہ سے مجھے لیکچر کو سمجھنے میں کچھ دشواری کا احساس ہو رہا تھا اور میں یہ بھی چاہ رہا تھا کہ لیکچر جلد ختم ہو تو میں راحت سے کوئی بات کر سکوں اور شاید وہ بھی جاننا چاہتی تھی کہ میں کہاں سے ہوں کون سے خاندان سے ہوں لیکن جیسے ہی لیکچر ختم ہوا مجھے ایک ننھے سے بچے کی آواز سنائی دی۔

"راحت آپی جلدی آجائیں۔" اس آواز پر میں ہی نہیں سبھی نے گردن گھما کر ہال میں داخل ہونے والے دروازے کی جانب دیکھا جہاں ایک بہت پیارا سا بچہ اسکول یونیفارم میں کھڑا تھا وہ اس آواز پر جھٹ سے اٹھی اور پھر ہال سے باہر نکل گئی میں بھی اس کے تعاقب میں تیز تیز قدم بڑھاتا باہر کی جانب بڑھا، ابھی وہ گاڑی میں بیٹھ ہی رہی تھی گاڑی میں پہلے سے ایک چھوٹی بچی موجود تھی۔ مطلب وہ دو بہنیں اور ایک ہی اس کا بھائی تھا جب تک اس کا ڈرائیور گاڑی آگے بڑھاتا میں اپنی بائیک پر بیٹھا ہیلمٹ پہن رہا تھا میں نے پہلے کبھی ایسی حرکت نہ کی تھی اور کبھی ایسا واقعہ بھی پیش نہ آیا تھا۔ جب میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی اور اس سے پہلے کہ ان کی گاڑی میری نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی میں نے اپنی بائیک اس کی گاڑی کے پیچھے لگا دی۔ اب میں اس کی گاڑی کا تعاقب میں جا رہا تھا۔ میری بائیک اور اس گاڑی کے درمیان فاصلہ نہ تو بہت کم تھا اور نہ ہی بہت زیادہ لیکن کبھی سگنل پر رکتے ہوئے مجھے یہ احساس ضرور رہتا کہ میں اس کی گاڑی سے قریب ہی رہوں۔ تھوڑا ہی فاصلہ طے کرنے کے بعد مجھے کچھ حیرت کا احساس ہو رہا تھا کہ جس راستے سے میں گھر لوٹتا تھا یہ وہی راستہ تھا بالآخر ایک جگہ پہنچ کر اس کی گاڑی رک گئی اور مجھے ابھی تھوڑا اور آگے جانا تھا۔ اس کی گاڑی تو رک گئی لیکن میں نے نہ تو اپنی رفتار کم کی اور نہ ہی میں نے رک کر یہ پتا کرنے کی کوشش کی کہ بالآخر وہ گاڑی کون سے گھر میں داخل ہو گئی اور میں تو یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ میں ایسا کیوں کر رہا تھا۔

اگلے روز اکیڈمی میں لیکچر کے اختتام پر جب سبھی کلاس سے نکل رہے تھے تو فقط میں اور راحت عبد الغنی اپنی اپنی نشست پر بیٹھے رہے مجھے تعجب اس بات پر ہو رہا تھا کہ ہم ساتھ بیٹھے تھے اور اپنی نوٹ بک قلم بیگز میں رکھتے ہوئے ایک دوسرے سے کوئی بات ہی نہ کر پا رہے تھے۔ لیکن پھر راحت کی بات پر میں ایک دم سے چونکا وہ مجھ سے ہی مخاطب تھی۔

"کمال ہے آپ اکیڈمی سے میرے گھر تک میری گاڑی کا پیچھا کرتے ہوئے آئے اور جب آپ سے ملنے کے لیے میں نے ڈرائیور سے کہہ کر گاڑی رکوائی تو جناب رکے ہی نہیں۔" وہ اتنا کہہ کر اب سوالیہ نگاہوں سے میری جانب دیکھ رہی تھی۔ اس کی پہلی بات پر تو جیسے میں گھبرا گیا تھا جیسے میرا اوپر نیچے کا سانس رکنے لگا تھا۔ مجھے لگا وہ یہ جاننے کے بعد کہ میں کل اکیڈمی سے نکلنے کے بعد اس کی گاڑی کے تعاقب میں رہا تھا وہ کہیں میرے بارے میں غلط رائے نہ قائم کرے اس کی اگلی ہی بات پر کہ اسے جب پتا چل گیا تھا کہ میں اس کی گاڑی کے تعاقب میں ہوں اور اس نے خود ڈرائیور سے کہہ کر گاڑی رکوائی تھی مجھے یہ سن کر بہت اچھا لگا اور میری ہمت

بندھی کہ میں اس سے بات کر سکوں وہ ابھی تک جواب کی منتظر سوالیہ نگاہوں سے میری جانب دیکھ رہی تھی۔ جب میں نے اسے جواب دیا۔

"آپ نے اپنے بارے میں تو کچھ بتایا ہی نہیں۔" میں فقط اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا تھا اور میری یہ بات سنتے ہی ہال نما کمرے میں ایک مترنم سا قہقہہ گونجا اور ساتھ ہی وہ اب مجھ سے مخاطب تھی۔

"یہ تو آپ جانتے ہی ہیں بندی کو راحت عبد الغنی کہتے ہیں اور اگر آپ کچھ نہیں جانتے تو شاید وہ یہ ہے کہ میں چوہدری عبد الغنی جو ایم این اے ہیں ان کی صاحبزادی ہوں۔"

"کیا؟" اس کی بات سن کر حیرت سے جیسے میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا اور بے ساختہ میرے منہ سے حیرت کے اظہار میں "کیا" نکل گیا۔ وہ اب متعجب سی میری جانب دیکھ رہی تھی اور پھر میرے حیرت زدہ ہونے پر چونکتے ہوئے مجھ سے دریافت کر ہی لیا۔

"کیا آپ کو یہ جان کر اچھا نہیں لگا؟ میرے ابا کوئی ایسے ویسے ایم این اے نہیں ہیں وہ تو بالکل غیر سیاسی ہیں انہیں تو سیاست آتی ہی نہیں۔ اہلِ علاقہ نے انہیں کیسے اس منصب پر فائز کر دیا ہے ایسا میں نہیں جانتی اور اگر انہیں کچھ آتا ہے تو وہ ہے احساس کرنا شاید یہی وہ جذبہ ہے کہ ڈیڈی کو اللہ نے آج یہ مقام دیا ہے میں آپ کو ان سے ملواؤں گی۔" اس نے بات کرتے ہوئے ایک دم سے میرے چہرے کی جانب دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"آپ کو ان سے مل کر بہت اچھا لگے گا۔"

"یقیناً اور آپ یہ تو جان ہی چکی ہیں کہ اس ناچیز کو طٰہٰ عالم کہتے ہیں لیکن آپ یہ نہیں جانتی ہوں گی کہ بندہ خورشید عالم کا بیٹا ہے۔" میں نے اس کے ہی انداز میں اسے جواب دیا اور اب وہ بھی میری بات سن کر حیرت زدہ سی گم صم سی بیٹھی تھی پھر ذرا توقف کے بعد وہ سنجیدگی سے مجھے دیکھتے ہوئی بولی۔

"طٰہٰ آپ کے دادا خوشی محمد تو کسی تعارف اور تعریف کے محتاج نہیں ہمارے گھر میں اکثر ان کا تذکرہ رہتا ہے خود ڈیڈی انہیں بہت عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر وہ بھی ہمارے گھر ڈیڈی سے ملنے آجایا کرتے ہیں۔ مجھے یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ آپ ایسے انسان کے پوتے ہیں۔" وہ اپنی بات کہہ چکی تھی لیکن مجھے حیرت ہوئی کہ اس نے میرے ابا کے بارے میں ایک بات تک بھی نہ کہی تھی نہ تو اس نے یہ کہا کہ وہ جانتی ہے کہ خورشید عالم اس کے ابا کے سیاسی حریف ہیں اور نہ ہی اس نے کوئی اچھے یا برے کلمات کہے وہ تو فقط بڑے ابا خوشی محمد کے ہی گن گاتی رہی اور مجھے اپنا موبائل نمبر دے کر رخصت ہو گئی۔ ہمارا رشتہ تو بننے سے پہلے ہی سیاست کی بھینٹ چڑھ گیا مجھے اس کی یہ بات ذرا ناگوار گزری تھی کہ اس نے میرے ابا کا ذکر تک نہ کیا تھا کیا وہ اتنے ہی برے تھے۔

اس روز گھر پہنچ کر ایک اور منظر میرا منتظر تھا گھر داخل ہونے سے ذرا پہلے میں ٹھٹک کر رہ گیا گھر کے بیرونی دروازے پر لوگوں کا جم غفیر جمع تھا۔ ایسی بھیڑ سیاستدانوں کے گھروں کے باہر ہونا کوئی تعجب کی بات نہ تھی لیکن الیکشن گزر چکے تھے اور کوئی نئی مہم شروع ہوئی ہو ایسا بھی میرے علم میں نہ تھا پھر یہ بھیڑ کیسی تھی میں بھی گھر سے باہر کھڑی اَن گنت گاڑیوں کے بیچ اپنی بائیک کھڑی کر کے گھر میں داخل ہوا تو مجھے جان کر شدید صدمہ ہوا کہ فساد تو اپنے گھر میں ہی بپا تھا۔

چچا مرزا اور میرے ابا خورشید عالم کے درمیان جائیداد کو لے کر جو جھگڑا شروع ہوا اور جس کی جھڑپیں اکثر و بیشتر چلتی رہی تھیں آج نوبت اسلحہ تک آن پہنچی تھی۔ میری نظر بڑے ابا پر پڑی وہ کسی قدر رنج و غم میں سٹپٹائے لگ رہے تھے انہیں گویا ان دونوں بھائیوں میں مفاہمت کی کوئی راہ ہی نہ سجھائی دے رہی تھی اور میرے ابا کوئی بات سننے کو تیار ہی نہ تھے۔ چچا مرزا جائیداد میں موجود اپنا حصہ لے کر الگ ہو جانا چاہتے تھے اور میرے ابا کو بھنک لگ چکی تھی کہ چچا جائیداد میں ملنے والا حصہ فروخت کر کے گاؤں منتقل ہونا چاہتے ہیں۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ جائیداد خاندان سے باہر کسی غیر کے ہاتھوں فروخت ہو اور اتنا پیسا ان کے پاس موجود نہ تھا کہ وہ اتنی بڑی رقم چچا مرزا کو ادا کر کے ان کا حصہ بھی اپنے نام کر لیتے۔ ابھی چند ماہ پہلے ہی وہ الیکشن ہارے تھے اور الیکشن ہارنے کا مطلب جوا ہار جانے کے مترادف تھا انہوں نے اپنا سبھی کچھ جمع پونجی اس الیکشن پر لگا دی تھی اور وہ سبھی ہار گئے تھے۔ میں اکثر اپنے بڑے ابا کی زبانی اپنے ابا کو سرزنش کرتے سنتا تھا وہ انہیں کہا کرتے تھے۔

"خورشید عالم سود پر پیسہ نہ دیا کر یہ تیرے باقی پیسے کو بھی کھا جائے گا نہ لوگوں کی مجبوریوں سے کھیلا کر یہ وقت اور پیسہ کسی کے ساتھ سدا نہیں رہتا؟" لیکن ابا بڑے ابا کی بات کو خاطر میں ہی نہ لاتے تھے آج ہوئے فساد کو لے کر بڑے ابا بہت پریشان تھے وہ چچا مرزا کو ایک طرف لے گئے اور کئی گھنٹوں کی نشست کے بعد وہ چچا مرزا کو جائیداد فروخت نہ کرنے پر قائل کرنے میں کامیاب ہو ہی گئے اور اسی روز شام کو انہوں نے دونوں بھائیوں میں صلح بھی کرا دی۔

اگلے روز کالج اور اکیڈمی بند تھی۔ چھٹی ہونے کی وجہ سے میں گھر پر ہی موجود تھا اور ضیاء سے ملنے کے لیے بے تاب بھی میرے لیے یہ بات جس قدر حیران کن تھی کہ راحت چوہدری عبد الغنی کی بیٹی تھی، ضیاء بھی یہ خبر سن کر چونکنے والا تھا۔ دس بجے کے قریب اٹھتے ہی میں چھت پر جا پہنچا سورج کی سنہری کرنوں نے مجھے خوش آمدید کہا مارچ کی ایک اجلی نکھری صبح ڈھل رہی تھی لیکن مینا، چڑیا، کوا ابھی تک خوشی کے گیت سنا رہے تھے۔ بہار سے مہکتی فضا میں پھولوں کی عجب سی باس رچی بسی ہوئی تھی لیکن ضیاء چھت پر موجود نہ تھا اور نہ ہی اس کی پتنگ مجھے فلک سے بوس و کنار کرتی دکھائی دی۔

میں چند لمحوں تک یونہی کھڑا اس کی چھت پر آمد کا انتظار کرتا رہا جب وہ مجھے ہاتھوں میں ڈور اور بہت سی پتنگیں لیے چھت پر آتا دکھائی دیا اسے دیکھ کر میری خوشی دیدنی تھی میں اس کے بعد اپنے گھر کے درمیان کی چھت پھلانگ کر اس تک جا پہنچا ابھی میں نے وہاں پہنچ کر اسے سلام کیا ہی تھا کہ اس کے عقب میں موجود سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس کی دادی ماں بھی چھت پر آ پہنچی تھی۔

مجھے ضیاء کے ساتھ کھڑا دیکھ کر وہ اپنی عینک سنبھالتی دونوں بانہیں پھیلائے یوں میری جانب بڑھی کہ مجھے اپنی جگہ سے ملنے کا موقع ہی نہ ملا جب انہوں نے یوں میرے پاس آکر مجھے اپنی بانہوں میں بھینچ لیا۔

"پتر طہٰ بڑے دنوں کے بعد دیکھا تجھے کہاں ہوتے ہو۔" وہ اپنے جھریوں سے بھرے ہاتھ جن پر موٹی موٹی سنپولیوں سی رگیں ابھری ہوئی تھیں میرے چہرے پر پھیرتے ہوئے بولیں۔

"دادی ماں میں تو آپ کے پاس ہی ہوتا ہوں۔" میں نے ان کی بات کا جواب دیا میری دادی ماں اب اس دنیا میں نہ تھی۔ وہ میرے ہوش سنبھالنے سے بھی پہلے سے اس جہانِ فانی سے رخصت ہو چکی تھیں اور میں بچپن سے ضیاء کی دادی ماں کو اپنی دادی ماں کی طرح ہی سمجھتا تھا وہ انہیں یاد بھی بہت کرتی تھیں۔ میں جب کبھی ان کے پاس موجود ہوتا وہ ان کا ذکر چھیڑ دیا کرتی تھیں لیکن آج تو وہ ضیاء نامہ کھول کر بیٹھ گئیں۔ پاس ہی رکھی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے انہوں نے مجھے بھی اپنے پاس بٹھا لیا تب تک ضیاء پتنگ کی تلا میں ڈال کر اسے اڑانے لگا تھا اور مجھے دادی کے چنگل میں پھنسا دیکھ کر مجھ پر ہنس رہا تھا۔ اس کے پاس یہ نعمت تھی میرے پاس نہیں تھی ناں میں ادب سے بیٹھا ان کی باتیں سننے لگا وہ مجھ سے مخاطب تھیں۔

"اچھا ہوا طہٰ جو تم مجھے مل گئے پتر اپنے دوست ضیاء کو بھی سمجھایا کرو تم لوگ تو پڑھ لکھ گئے تمہاری ماں نے تم لوگوں پر بڑی محنت کی ہے۔ مصطفیٰ کو دیکھتی ہوں وہ تو اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہا ہے بڑی خوشی ہوتی ہے پر بیٹا اپنے اس نالائق دوست کو بھی ساتھ لے کر چلو سارا دن پتنگ بازی کرتا رہے گا تعلیم تو ادھوری چھوڑ دی ساتھ ہی اپنی جان کی بھی پروا نہیں اسے۔"

ایسا کہتے ہوئے اچانک دادی نے ایک دھپا میرے بازو پر لگایا اور کچھ سوچتے ہوئے بولیں۔

"وہ کیا ہوتا ہے پتر جو پہیہ اٹھاتے ہیں۔" دادی کی اس بات پر اپنی ہنسی کو دباتے ہوئے میں نے کہا۔

"جی دادی ماں ون ویلنگ۔"

"آہو، آہو پتر مجھے اس کی ماں بتاتی ہے بڑا خطرناک کھیل ہوتا ہے جان کا خطرہ ہوتا ہے سمجھایا کر اپنے دوست کو۔" پھر یہ کہتے ہوئے وہ چارپائی سے اتر کر اپنا جوتا ڈھونڈنے لگیں۔ میں نے جھٹ سے جوتا اٹھا کر ان کے آگے کر دیا وہ دعائیں دیتے ہوئے اٹھیں اور بولی۔

"پتر جی آپ نے اسے سمجھانا ہے میں ذرا تمہارے کھانے کو کچھ بھیجتی ہوں۔" ایسا کہہ کر وہ سیڑھیاں اترنے لگیں اور میں نے پلٹ کر ضیاء سے پتنگ چھیننے کے لیے اس پر اٹیک کر دیا۔ ہم لوگ دیر تک دادی ماں کی باتوں پر قہقہے لگاتے رہے پتنگ اوپر بہت اوپر آکاش کا طواف کر رہی تھی جب ایک دم سے مجھے راحت کا خیال آیا آج چھٹی تھی پھر آج وہ کیا کر رہی ہوگی۔ یہ خیال آتے ہی میں ضیاء سے مخاطب ہوا۔

"جانتے ہو راحت کون ہے؟" میری یہ بات سن کر وہ جھٹ سے بولا۔

"اگر مجھے علم ہوتا تو تمہیں اس کا پتا کرنے کو کیوں کہتا۔" اس کی بات ختم ہوتے ہی میں جھٹ سے بولا۔

"تو پھر سنو راحت چوہدری عبد الغنی کی بیٹی ہے۔" میری بات سنتے ہی اس کے ہاتھ سے پتنگ کی ڈور چھوٹ گئی اور وہ اسے پکڑنے کے لیے اس کے پیچھے دوڑتا ہوا یوں حیرت سے بولا۔

"کیا وہ چوہدری عبد الغنی ایم این اے کی بیٹی ہے۔" ضیاء نے ایم این اے لگا کر جیسے مجھ سے تصدیق چاہی۔

"جناب وہ انہی ایم این اے کی بیٹی ہے۔" میری یہ بات سن کر اس نے میرا ایک بازو تھاما اور مجھے جیسے گھسیٹتا ہوا ایک طرف کو لے گیا اور اسے ایسا کرتے دیکھ کر میں سوچ ہی رہا تھا کہ اسے کیا ہو گیا جب چھت کے پردے کے پاس پہنچ کر جہاں سے شہر بھر کی عمارتوں کا نظارہ کیا جاسکتا تھا وہ ایک ہاتھ اٹھا کر مجھے انگلی کے اشارے سے بتانے لگا۔

"طٰہٰ وہ جو نیلی ٹائلوں والی کوٹھی دکھائی دے رہی ہے ناوہ ہے، چوہدری عبد الغنی کا گھر۔" میں نے اس کی بات سن کر اس گھر کی جانب دیکھا اگر عقبی جانب سے جہاں ہم لوگ کھڑے تھے دیکھا جائے تو وہ بہت دور نہ تھا ابھی میری نگاہیں اس پرستان کا طواف ہی کر رہی تھیں کہ جب ضیاء بولا۔

"یار تم نے اس سے کوئی رابطہ نمبر ہی لے لینا تھا۔" ضیاء کی بات سنتے ہی میں نے اپنی جیب سے موبائل نکالا اور راحت کے نام سے جو نمبر محفوظ کیا تھا اسے ڈائل کیا یہ دیکھ کر ضیاء نے میرے کاندھے پر تھپکی لگا کر جیسے مجھے داد دی اور اب ہم دونوں ہی دوسری جانب سے کال ریسیو ہونے کا انتظار کرنے لگے ہم دونوں ہی جس قدر بے تابی سے کال ریسیو ہونے کا انتظار کر رہے تھے دوسری جانب سے اتنی ہی تاخیر سے کال ریسیو کی گئی۔

"ہیلو کون بول رہا ہے؟" کال ریسیو کرتے ہی کسی ننھے سے بچے کی آواز سنائی دی جسے میں فوراً ہی پہچان گیا تھا اس روز اکیڈمی میں، میں یہ آواز سن چکا تھا۔

"راحت آپی جلدی آجائیں۔" یہ آواز سنتے ہی ساری کلاس نے جو مڑ کر دروازے کی جانب دیکھا تھا تو وہاں اسکول یونیفارم میں ایک پیارا سا بچہ کھڑا تھا۔

"ہیلو کون ہے؟" موبائل کے کھلے اسپیکر سے پھر آواز سنائی دی جب میں سوچ رہا تھا کہ میں اس بچے کو کیا جواب دوں اور ضیاء مجھے مسلسل ٹھوکے لگا کر بات کرنے پر اصرار کر رہا تھا جب اسپیکر پر پھر سے ننھے بچے کی آواز ابھری۔

"انکل آپ طٰہٰ بات کر رہے ہیں۔" اس کی بات سن کر جیسے ہم دونوں نے یوں حیرت سے ایک دوسرے کی جانب دیکھا اور میں نے فوراً جواب دیا۔

"جی بیٹا میں طٰہٰ بات کر رہا ہوں۔" ابھی فقط میں نے اتنا ہی بولا تھا جب دوسری جانب سے مجھے وہی مترنم آواز سنائی دی۔

"جی السلام علیکم طٰہٰ میں راحت بول رہی ہوں۔"

"وعلیکم السلام، میں نے پہچان لیا آپ کیسی ہیں۔" اس کی آواز سنتے ہی میں نے جھٹ سے جواب دیا اور ضیاء میرے قریب کھڑا کچھ عجیب سی حرکتیں کرنے لگا جو ذرا دیر سے مجھے سمجھ میں آ گئیں کہ وہ کہہ رہا تھا کہ میں اسے کہوں کہ وہ اوپر چھت پر چلی آئے جہاں اس طرف میں بھی چھت پر کھڑا تھا۔ جب میں نے یہ بات راحت سے کہی تو وہ فون کان سے لگائے فوراً ہی چھت پر چلی آئی۔ ایک ہاتھ سے اپنے سارے بالوں کو جو میری آنکھوں تک جھک آئے تھے اٹھا کر ہاتھ کو سر کے اوپر ٹکاتے ہوئے میں نے اس نیلی ٹائلوں والی کوٹھی کی جانب دیکھا وہ اسی پرستان کی کوئی ننھی سی پری ہی لگ رہی تھی۔ میں نے ہاتھ ہلا ہلا کر اسے اپنی موجودگی کا احساس دلایا اسے بھی حیرت ہو رہی تھی کہ ہمارے گھروں کی چھتیں اتنا قریب تھیں پھر میں نے اسے کہا کہ میں تمہیں کچھ بتانا چاہتا ہوں اسے یہ کہتے ہوئے میں نے ضیاء کو پتنگ نیچے اتارنے کو کہا ضیاء نے پھرتی سے ڈور کھینچنا شروع کر دی میں نے ضیاء سے قلم مانگا وہ پتنگ میرے ہاتھ میں تھما کر قلم لینے چلا گیا جب تک ضیاء قلم لے کر لوٹا میں راحت کو بتانے لگا کہ ابھی ایک پتنگ اس کی چھت پر آ کر گرے گی اس پر کچھ تحریر ہو گا وہ یہ سب سن کر دیوانہ وار قہقہے لگانے لگی اور اس طرف میری یہ حالت ہو رہی تھی کہ میرا دل چاہ رہا تھا کہ وہ یونہی اپنی مترنم آواز سے ہنستی رہے اور میں اسے یونہی سنتا رہوں جب ضیاء قلم لے کر میرے پاس پہنچا تھا میں نے قلم اس کے ہاتھ سے لیا اور پتنگ پر لکھنے لگا۔

"راحت اچھی بچی ہے اور کل دوپہر میں درگاہ پر مجھ سے ملنے آ رہی ہے۔" میں پتنگ پر اپنے دل کی بات لکھ چکا تھا اور میرے لکھتے ہی ضیاء کو مجھے کچھ سمجھانا بھی نہیں پڑا۔ جب وہ پتنگ ہوا میں تیرنے لگی تھی ہم دونوں ہی دھڑکتے دل کے ساتھ اوپر فضاؤں میں بلند ہوتی پتنگ کو دیکھ رہے تھے ہوا خاصی تیز تھی کبھی پتنگ یوں پھڑ پھڑانے لگتی کہ مجھے لگتا وہ اس تک پہنچنے سے پہلے ہی تار تار ہو کر گر نہ جائے میں دل ہی دل میں دعائیں کر رہا تھا کہ یارب یہ پتنگ اس تک پہنچ جائے۔ ضیاء نے میری جانب اشارہ کیا۔ وہ پتنگ بازی میں جو مہارت رکھتا تھا اب اس کا کمال دکھانا چاہتا تھا پتنگ اب فضاؤں میں اس قدر بلند ہو چکی تھی کہ اگر اسے نیچے جھکاؤ دیا جائے تو وہ راحت کے سر کے اوپر سے اسی کے قدموں میں جا گرے ضیاء پتنگ کو اتنا جھکا رہا تھا کہ اب وہ پتنگ اس کی چھت کے عین اوپر تیز ہوا میں پھڑ پھڑا رہی تھی۔ پھر ضیاء نے اسے اس کے سر کے پاس یوں جھکا کر اوپر اٹھا لیا کہ ایک بار پھر سے اس کے قہقہے مجھے فون پر سنائی دینے لگے۔ وہ اپنے سر پر آنچل سنبھالتی کبھی چھت کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک اپنی نگاہیں اٹھائے پتنگ کے چھت پر گرنے کا انتظار کر رہی تھی۔ جب میرا اشارہ پا کر ضیاء نے پتنگ کو چھت پر گرا دیا۔ وہ پتنگ پر لکھی عبارت پڑھنے کے لیے جھکی اور میں اسے پھر دیکھنے کے لیے بے چینی سے اس کی چھت کی طرف دیکھنے لگا وہ اب مجھے دکھائی نہیں دے رہی تھی لیکن میں جانتا تھا کہ وہ پتنگ اپنے سامنے رکھے اس پر درج عبارت کو دیکھتے ہوئے یہی سوچ رہی ہو گی کہ اسے مجھ سے ملنے کے لیے درگاہ پر آنا چاہیے کہ نہیں پھر فون پر بھی مسلسل خاموشی پا کر میں نے ضیاء کی جانب سوالیہ نگاہوں سے دیکھا اس نے مجھے اشارتاً انتظار کرنے کو کہا۔ ابھی چند لمحے ہی بیتے تھے جب ہمیں اچانک سے راحت دکھائی دی۔ پتنگ اس کے ہاتھوں میں تھی اور اب وہ ہمیں پتنگ واپس

کھینچنے کا اشارہ کر رہی تھی ضیاء نے اشارہ پاتے ہی ڈور کو مخصوص انداز سے کھینچا اور پتنگ راحت کے سر کے اوپر سے فضا میں تیرنے لگی۔ یہ دیکھ کر وہ اپنی چھت پر کھڑی ننھے بچوں کی طرح خوشی سے اچھلتے ہوئے تالیاں بجا رہی تھی۔ میں نے فون ابھی تک کان سے لگا رکھا تھا۔ جب ضیاء کی گنگناتی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

"میرے ننھے مجنوں دوست فون رکھ دے پیغام پتنگ پر ہواؤں میں تیرتا ہوا آرہا ہے۔" ضیاء کی بات سن کر میں نے اس پر اٹیک کر دیا اور اب میں مسلسل اس سے پتنگ چھیننے کی جدوجہد میں لگا ہوا تھا ہمیں یوں لڑتا جھگڑتا دیکھ کر راحت اب واپس نیچے جا چکی تھی بالآخر اس کا پتنگ پر لکھ کر بھیجا جواب مجھ تک پہنچ ہی گیا اس نے میری عبارت کے بالکل نیچے لکھا تھا۔

"آپ بھی بہت اچھے ہیں طٰہ، میں آپ سے ملنے درگاہ ضرور آؤں گی۔" راحت کا لکھا جواب پڑھ کر اب کی بار جو ضیاء نے مجھ پر اٹیک کیا تو اب اس سے بچنے کے لیے میں ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا جب عین اسی وقت دادی ماں چھت پر آ پہنچی اور ہمیں یوں گتھم گتھا دیکھ کر بولی۔

"میں اسی لیے کہتی تھی کچھ سمجھاؤ تو بندہ خود ہی برا بنتا ہے۔" دادی کی بات سن کر ہم لوگوں نے اٹھ کر کپڑے جھاڑتے ہوئے اس قدر قہقہے لگائے کہ دادی کھانے پینے کی چیزیں رکھ کر الٹے پیروں واپس لوٹ گئیں۔

اس رات نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور کہیں جا بیٹھی تھی۔ میں سونے کے لیے آنکھیں بند کرتا تو پھر ضیاء کے ساتھ اس کے گھر کی چھت پر جا پہنچتا تھا۔ کبھی مجھے دادی ماں کے پاس بیٹھا دیکھ کر ضیاء کا کھلکھلاتا چہرہ دکھائی دیتا تو کبھی میرے فون کرنے پر راحت کے چھت پر چلے آنے کا منظر میری نگاہوں میں ٹھہر جاتا کبھی میں پھر سے پتنگ پر لکھ رہا ہوتا "راحت اچھی بچی ہے اور کل درگاہ پر مجھ سے ملنے آرہی ہے۔" اور کبھی مجھے اجلے نیلے آسمان پر مسکراتی ہوئی پتنگ دکھائی دیتی جواب راحت کا جوابی پیغام میرے نام لائی تھی اور ضیاء اور میں اس پتنگ کو حاصل کرنے کے لیے کیسے ایک دوسرے پر جھپٹ رہے تھے۔ پتنگ کی ڈور کبھی میرے ہاتھ آجاتی تو کبھی ضیاء اسے چھین کر چھت کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک مجھے اپنے پیچھے دوڑاتا رہا اور پھر اس کا جوابی پیغام میری نگاہوں میں جم کر رہ گیا تھا میری لکھی عبارت کے عین نیچے اس نے لکھا تھا۔

"آپ بھی بہت اچھے ہیں طٰہ، میں آپ سے ملنے درگاہ ضرور آؤں گی۔" میں یونہی سوچتا کروٹیں بدلتا رہا اور پھر نہ جانے رات کے کس پہر میری آنکھ لگ گئی۔

رات دیر سے سونے کی وجہ سے صبح میری آنکھ بھی دیر سے کھلی تھی آنکھ کھلتے ہی میں نے نیند کے گہرے اثرات کو مٹانے کے لیے اپنے ہاتھوں کو چہرے پر پھیرا اور پھر جیسے ہی میری نگاہ گھڑی پر پڑی میں اچھل کر اٹھ بیٹھا گیارہ بج رہے تھے اور ابھی مجھے تیار ہو کر ضیاء کو بھی ساتھ لینا تھا۔ باتھ روم جانے سے پہلے ہی میں نے ضیاء کو بھی کال کر دی تاکہ وہ وقتِ مقررہ پر تیار ہو جائے اور پھر میں تیاری میں لگ گیا۔

جب میری تیاری مکمل ہوئی تو پونے بارہ ہو رہے تھے پھر جھٹ سے جو کمرے سے باہر پہنچا تو سامنے ماں کھڑی تھی چھٹی والے روز میں گیارہ بارہ بجے تک ہی سو کر اٹھتا تھا اور اب وہ مجھے جگانے آئی تھیں لیکن اب اپنے سامنے مجھے خوشبو میں مہکتا سوٹ بوٹ پہنے کھڑا دیکھ کر وہ مسکرا اٹھیں اور ان کے مسکراتے ہی میں نے ان کی پیشانی چوم لی۔ ویسے یہ کام وہ کرنے والی تھیں اور اب وہ مجھ سے مخاطب تھی۔

"بیٹا جی آج ماں پر بڑا پیار آرہا ہے۔" ان کی بات سن کر میں مسکراتے ہوئے بولا۔

"ماں پلیز آج کچھ وقت کے لیے ابا کی گاڑی کی چابی چاہیے۔" ماں نے میری بات سن کر ہاتھ بڑھا کر میرے گال کو سہلایا اور پھر بولی۔

"بس، چلو میرے ساتھ آؤ۔" ان کی بات ختم ہوتے ہی ایک قدم ان کے ساتھ آگے بڑھاتے ہوئے میں نے ہاتھ بڑھا کر ان کے کاندھے کو سہلاتے ہوئے کہا۔

"ماں یہ ہوئی نا بات۔" اپنے کمرے میں پہنچ کر ماں نے مجھے گاڑی کی چابی دی اور ایک بار پھر سے ماں کی پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور پھر گاڑی لے کر ضیاء کے گھر جا پہنچا پہلے ہم دونوں اپنی اپنی بائیکس پر درگاہ جانے والے تھے لیکن اب میری منی پجارو اپنے گھر کے سامنے کھڑی دیکھ کر ضیاء بھی میری طرح خوش دکھائی دے رہا تھا۔ پھر ضیاء کو ساتھ لیے میں درگاہ کی طرف چل پڑا۔ درگاہ شہر سے چند کوس مسافت پر تھی۔ شہر کی بھیڑ بھاڑ سے نکلتے ہی ہم لوگ جلد ہی درگاہ تک پہنچ گئے تھے پہلے پہل یہ درگاہ آبادی سے کافی مسافت پر ہوتی تھی لیکن پچھلے کئی برسوں سے آبادی کے بڑھتے تناسب سے اب یہ درگاہ آبادی سے قریب ہی لگ رہی تھی۔ درگاہ سے قریب ہی درگاہ میں داخل ہونے والے راستے میں ایک نہایت بلند قامت آم کا پیڑ تھا جس کے گھنے سائے تلے ہم لوگوں نے اپنی گاڑی روک دی تھی اگرچہ اس درگاہ پر فقط جمعرات کے روز ہی میلے کا سماں دکھائی دیتا تھا لیکن آج اتوار کا دن تھا شاید تعطیل ہونے کی وجہ سے خاصے زائرین یہاں موجود تھے۔ ضیاء کو وہیں گاڑی کے قریب کھڑا کر کے میں درگاہ کی سیڑھیاں چڑھتا ہوا اندر کھلے احاطے میں داخل ہو گیا۔ سامنے کھلے احاطے میں بڑا سا برگد کا پیڑ تھا جس کے عین نیچے پکی اینٹوں کا تھڑا بنا ہوا تھا۔ بہت سے بوڑھے اور بچے اس تھڑے پر بیٹھے درگاہ میں آتے جاتے لوگوں کا نظارہ کر رہے تھے۔ کچھ بچے برگد کی لٹکی لمبی لمبی ڈالیوں سے جھول رہے تھے مزار پر حاضری کے بعد چند لوگ ساتھ لایا تبرک بھی تقسیم کرتے دکھائی دیئے۔ میں نے وہاں کھڑے ہو کر چار سُو نظر دوڑائی مگر مجھے راحت کہیں دکھائی نہ دی آگے بڑھ کر میں نے مزار کے اندرونی حصے میں بھی جھانک کر دیکھ لیا لیکن وہ وہاں نہ ملی۔ مطلب ہم راحت کے پہنچنے سے پہلے پہنچ چکے تھے یہ سوچتے ہوئے میں ضیاء کے پاس واپس چلا آیا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا کہ راحت ابھی درگاہ پر نہیں پہنچی تھی اور اب ہم اسی راستے پر اس کی آمد کا انتظار کرنے لگے جہاں سے زائرین کے آنے جانے کا سلسلہ جاری تھا اور ساتھ ہی میں یقینی اور بے یقینی جیسی صورتِ حال کا شکار ہو رہا تھا جو وقت ہم لوگوں نے مقرر کیا

تھا وہ بیت رہا تھا لیکن وہ آئے گی بھی یا نہیں یہی سوچ کر میرا یقین ڈگمگانے لگا تھا جب مجھے ضیاء کی آواز سنائی دی وہ پاس سے گزرتے ایک بچی اور بچے سے مخاطب تھا جو بہن بھائی لگ رہے تھے۔

"پیارے بچو، ہمیں بھی تھوڑا تبرک کھلا دو۔" بچی کے ہاتھ میں ایک تھال تھا جس پر ایک ریشمی کپڑا پڑا تھا ضیاء کی بات سن کر بچی نے مسکراتے ہوئے اپنے ساتھ کھڑے بھائی کی طرف دیکھا جو اس سے بھی زیادہ شرما رہا تھا ضیاء ان بچوں کے روکتے ہی میری جانب مسکرا کر دیکھتے ہوئے ذرا اور ان کے قریب چلا گیا۔ اس کے قریب ہوتے ہی بچی نہایت احترام سے بولی۔

"بھائی جان یوں تو اب یہ باقی بچا تھوڑا سا تبرک ہم اپنے گھر کے لیے لے جا رہے ہیں لیکن اب آپ نے روکا ہے تو آپ کو ضرور کھلائیں گے۔" یہ کہتے ہوئے بچی نے ریشمی کپڑا جو تھال پر دھرا تھا اسے ہٹایا تو نیچے شکر، گھی، آٹے سے بنی روٹی کے چند ٹکڑے پڑے تھے۔ دو ٹکڑے اٹھا کر اس نے ضیاء کی جانب بڑھا دیئے۔ جب میں نے عقب سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ضیاء بچے تو بہت ذہین ہیں۔" میری بات سن کر بچوں نے پلٹ کر ایک بار مجھے دیکھا اور پھر مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ ضیاء نے پلٹ کر ایک ٹکڑا مجھے دیا اور ایک اس نے خود کھالیا۔ میں نے جو ضیاء کے ہاتھ سے تبرک کا ٹکڑا لے کر اپنے منہ میں رکھا تو کیا عجب احساس تھا۔ مجھے لگا جن ہاتھوں نے اسے بنایا تھا اور پھر جو آیت مبارک پڑھی گئی تھیں وہ سبھی لمس احساس مجھے کسی الگ ہی دنیا میں لے گئے تھے۔

وہاں آم کے پیڑ کی گھنی چھاؤنی تلے کھڑے ہمیں کافی وقت بیت چکا تھا لیکن راحت ابھی تک نہ آئی تھی اور اب میں ضیاء سے کہہ رہا تھا کہ ہمیں واپس چلنا چاہیے لیکن اسی کے اصرار پر میں مزید وہاں کھڑا موہوم سی امید کے ساتھ اس کا انتظار کرنے لگا لیکن پھر وہ موہوم سی امید بھی ٹوٹ گئی جب وہ مزید وقت گزرنے کے باوجود نہ پہنچی تھی۔ اب کی بار جو میں نے ضیاء کو واپس چلنے کو کہا تو اس نے میری بات نہ ٹالی اور ہم دونوں ہی بجھے ہوئے دل کے ساتھ واپس لوٹ آئے۔

اگلے روز میں اسے اکیڈمی میں ملا تو میں اس سے سخت خفا تھا اور اسے بھی اس بات کا بخوبی احساس تھا کلاس ختم ہوتے ہی اب وہ معذرت پیش کر رہی تھی۔

"طہ گھر پر کوئی بھی نہ تھا فقط چھوٹے بہن بھائیوں کے ساتھ میں تنہا تھی اور انہیں تنہا چھوڑ کر میں نہیں آسکتی تھی۔ میں جانتی ہوں تمہیں بہت برا لگا لیکن میں بھی تو کتنی مجبور تھی۔" اس کی مجبوری والی بات سن کر میں نے جو پلٹ کر اس کے چہرے کی جانب دیکھا تو وہاں آنکھوں کے ساغر اس کی زبان کی صداقت کی گواہی دے رہے تھے۔ اس کی معصومیت پر مجھے پیار آنے لگا تھا اور پھر مجھے مسکراتا دیکھ کر وہ جھٹ سے اپنا بیگ کھول کر اس میں سے کچھ نکالنے لگی۔

"طہٰ میں کل آتے ہوئے آپ کے لیے یہ گفٹ لا رہی تھی اسے رکھ لیجئے۔" اس کا میری جانب بڑھا ہاتھ ہوا میں ہی معلق تھا جب اس کے ہاتھ سے گفٹ لیتے ہوئے میں نے فوراً اسے اس کے ہی بیگ میں رکھ دیا۔ وہ حیرت زدہ سی سوالیہ نگاہوں سے میری جانب دیکھ رہی تھی جب میں نے اسے جواب دیا۔

"آپ کا یہ تحفہ میں تب قبول کروں گا جب آپ میرے ساتھ کھانا کھانے کسی ریسٹورنٹ چلیں گی ابھی اسی وقت۔" وہ میری بات سن کر کچھ دیر تک سوچتی رہی اور پھر جھٹ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تو چلیں۔" اس کے اس جواب پر میں نے بھی حیرت سے اٹھتے ہوئے ایک سوال پوچھا۔

"راحت اگر آپ میرے ساتھ ریسٹورنٹ چلی گئیں اور ڈرائیور آپ کو لینے یہاں آیا تو آپ کیا جواب دیں گی۔" یہ بات ابھی ابھی میرے ذہن میں آئی تھی جسے سن کر وہ فوراً بولی کہ آج وہ ڈرائیور کے ساتھ نہیں آئی اور واپس بھی وہ رکشہ پر ہی جائے گی اس کی یہ بات سن کر مجھے بے حد خوشی ہوئی اور یوں اس روز میں پہلی بار کسی لڑکی کے ساتھ ڈیٹ پر جا رہا تھا۔

راستہ بھر وہ مجھے اپنی پسند کے ریسٹورنٹ بتاتی رہی اور میں اسے اپنی پسند بتاتا رہا پھر ایک ریسٹورنٹ پر ہم دونوں ہی متفق ہو گئے اب ہم اسی ریسٹورنٹ میں موجود تھے وہاں بیٹھتے ہی میں نے مینیو راحت کی جانب بڑھا دیا تاکہ وہ اپنی پسند کا آرڈر دے اور جب وہ آرڈر دے چکی تو اس نے پہلے وہ تحفہ اپنے بیگ میں سے نکالا جو میں نے واپس اسی کے بیگ میں رکھ دیا تھا۔ میں نے وہ تحفہ راحت کے ہاتھ سے لے کر اسی کے سامنے کھولا اور اس میں ایک فرینڈ شپ بینڈ تھی اور ایک خوشبو جو مجھے بہت پسند آئے اور میں نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فرینڈ شپ بینڈ کو یوں دو حصوں میں الگ کر لیا کہ جو چار کڑیاں ملی ہوئی تھیں اب وہ دو، دو ہو گئیں۔ یوں ایک حصہ میں نے اس کی کلائی پر باندھ دیا اور دوسرا خود رکھ لیا۔ وہ میری اس حرکت سے کافی محظوظ ہو رہی تھی۔ جب ویٹر کھانا لے آیا چائنیز رائس سے اڑتی بھاپ اور خوشبو نے ہماری بھوک اور بڑھا دی تھی۔ میں نے راحت کو شروع کرنے کی دعوت دی تو کانچ کی بھاری نفیس پلیٹ جس پر ہوٹل کا لوگو بھی لگا تھا راحت اس میں رائس ڈالنے لگی اور ساتھ ہی وہ پلیٹ اس نے میری جانب بڑھا دی۔ شکریہ کہہ کر میں نے وہ پلیٹ اس کے ہاتھ سے لی اور پھر وہ اپنے لیے رائس پلیٹ میں ڈالنے لگی۔ جب وہ ایسا کر رہی تھی میں نے کانٹا اور چمچ ہاتھ میں تھامتے ہوئے اس سے دریافت کیا۔

"راحت آپ کو دیر تو نہیں ہو رہی۔" میری بات سن کر اس نے پلیٹ جس میں ابھی اس نے رائس ڈالے تھے اپنے سامنے رکھتے ہوئے بولی۔

"طہٰ میں نے کبھی کوئی بات اپنے ڈیڈی سے نہیں چھپائی ہماری پہلے روز ہوئی ملاقات سے آج اس ٹیبل پر کھانا کھانے تک وہ سب جانتے ہیں۔ وہ مجھ پر بہت اعتماد کرتے ہیں اور میں ان کے اعتماد کو کبھی ٹھیس نہیں پہنچاؤں گی اسی لیے میں کہوں گی کہ میں تو آپ

سے ملنے آپ کے گھر بھی آسکتی ہوں۔'' آخری بات کہتے ہوئے وہ واقعی پُر اعتماد لگ رہی تھی اور میں جو حیرت زدہ سا ہو کر اس کی باتیں سن رہا تھا آخری بات پر چونکتے ہوئے بولا۔

''یار ایسی ویسی کوئی حرکت نہ کرنا میرے گھر والے ذرا پرانے خیالات کے ہیں۔'' میری بات سن کر اس نے وہی مترنم قہقہہ لگایا اور ہم لوگ ریسٹورنٹ میں بج رہی ہلکی ہلکی موسیقی میں کھانا کھانے لگے۔ کھانے سے فراغت کے بعد ہم لوگ ریسٹورنٹ سے نکلے میں نے اسے رکشہ پر بٹھایا اور خود بائیک پر گھر چلا آیا۔

میرے گھر پہنچنے تک دن ڈھل چکا تھا اپنے کمرے میں پہنچ کر بیگ وہاں رکھنے کے بعد اب میں ضیاء سے ملنے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا۔ آج راحت سے ہوئی ملاقات ریسٹورنٹ میں کھانا، فرینڈشپ بینڈ، خوشبو کا تحفہ میں اسے سبھی کچھ بتانا چاہتا تھا۔ اسی مقصد سے میں گھر سے نکلا اور ضیاء کے گھر جا پہنچا میری دوسری ہی دستک پر چھوٹی نے دروازہ کھولا اور مجھے سامنے کھڑا پا کر وہ خوشی سے بے ساختہ اپنی توتلی زبان سے بولی۔

''مماطہ بھائی آئے ہیں۔'' اس سے پہلے کہ میں آگے بڑھ کر گود میں اٹھالیتا وہ شرما کر بھاگ گئی اور اب آنٹی میرے سامنے کھڑی تھیں۔

''السلام علیکم!'' میں نے سلام میں پہل کی تو انہوں نے سوال کا جواب دیتے ہوئے چند سیکنڈ میں مجھ سمیت میرے سارے شجرہ نسب کا حال پوچھ ڈالا۔

''آنٹی ضیاء گھر پر ہی ہے۔ میں ضیاء سے ملنے آیا تھا۔'' آنٹی نے مجھے بیٹھنے کو کہا جب میں نے کھڑے کھڑے ان سے ضیاء کے بارے میں دریافت کیا تو آنٹی جیسے بے زاری سے بولیں۔

''ہاں بیٹا اوپر چھت پر ہے۔ آج چودھویں کی رات ہے نا آج رات بھی وہ دیر تک پتنگ ہی اڑاتا رہے گا۔'' آنٹی کی بات سن کر شکریہ ادا کرتے ہوئے میں سیڑھیاں چڑھتے ہوئے جا پہنچا۔ فروری کے درمیانی دنوں کی ایک صاف شفاف رات شروع ہو رہی تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی رات کی رانی کی پُر اسرار مسحور کن سی خوشبو سے بھری رات، چودھویں کا چاند، ننھے منے تاروں سمیت اپنے پورے اہل و عیال کے ہمراہ آب و تاب کے ساتھ جگمگا رہا تھا اور میرا یار ضیاء سفید رنگ کی پتنگیں اپنے پاس ڈھیر لگائے آسمان پر کسی کے ساتھ پیچا پھنسائے کھڑا تھا۔ جب مجھے دیکھتے ہی وہ چلا آیا۔

''طہٰ ادھر آ دیکھ یہ میری ڈور سے تیری پتنگ بوکاٹا ہوگی۔'' اس کی بات ختم ہونے تک میں اس کے قریب جا پہنچا تھا لیکن میرے نگاہ اٹھا کر اوپر دیکھنے تک اس کی اپنی ہی پتنگ کٹ چکی تھی اور اب وہ برا سا منہ بناتے ہوئے ڈور کھینچ رہا تھا۔ جب میں نے راحت کی دی فرینڈشپ بینڈ اس کے سامنے کر دی۔ یہ دیکھتے ہی اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ڈور ایک طرف پھینکی اور میرے ہاتھ سے بینڈ لیتے ہوئے جھٹ سے بولا۔

"تم راحت سے ملے تھے اور آج اس نے تمہیں یہ فرینڈ شپ بینڈ دی اور تم نے لے لی اور اس دن جو اس نے ہمیں سارا دن ذلیل و خوار کیا اس کا کیا ہوا۔" اس کی یہ ترش بات سن کر میں مسکراتا ہوا اس کا بازو تھامے اسے چارپائی تک لے گیا جہاں بیٹھے میں اسے بتانے لگا کہ وہ کیا مجبوری تھی جو اس روز ہمیں ملنے درگاہ پر نہ آپائی تھی پھر میں نے ریسٹورنٹ میں کھائے کھانے اور اس سے ہوئی ساری باتوں کی ساری تفصیل اسے بتائی جسے سنتے ہی وہ ایک دم سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ میرا بازو تھامے مجھے نیچے لے گیا اس نے اپنی بائیک نکالی اور اب وہ میرے گھر کے سامنے کھڑا تھا۔ میں اس کا سارا پلان سمجھ گیا تھا میں بھی تیزی سے اپنے گھر داخل ہوا اور جب لوٹا تو میں اپنی بائیک کے ساتھ تھا۔ میری خوشی تو دیدنی تھی ہی ضیاء آپے سے باہر لگ رہا تھا۔ ہم لوگوں کا رخ راحت کے گھر کی طرف تھا۔ جب راحت کے گھر سے ذرا پہلے ضیاء نے اپنی بائیک کی ریس بڑھائی اور ساتھ ہی اگلا وہیل اٹھالیا اب وہ ٹریفک کے درمیان ون ویلنگ کرتا آگے بڑھ رہا تھا۔ یہ دیکھتے ہی میں نے بھی اپنی بائیک کی ریس بڑھائی میں اس تک پہنچ کر اسے ایسا کرنے سے روکنا چاہتا تھا ابھی چند روز پہلے ہی دادی ماں نے ضیاء کی شکایت لگاتے ہوئے مجھے یہ ذمہ داری سونپی تھی کہ میں اسے اس خطرناک جان لیوا کھیل سے باز رہنے کو کہوں اور آج جبکہ میں اس کے ہمراہ ہی تھا وہ بے تحاشا ٹریفک کے درمیان ون ویلنگ کرتا ہوا جا رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں اس تک پہنچتا اور اسے ایسا کرنے سے منع کرتا میرے دیکھتے ہی دیکھتے ضیاء کا توازن بگڑا بائیک اس کے نیچے سے نکلی اور لڑھکتی ہوئی ایک طرف کو چلی گئی اور ضیاء فٹ بال کی طرح اچھلتا زمین سے رگڑ تا فٹ پاتھ کے پاس جا گرا اسے یوں گرتا دیکھ کر جیسے میرا دل دھک سے رہ گیا رات کی تاریکی میں جیسے میرے ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگی تھیں۔ میں نے بائیک کو روکتے ہی کھڑا ابھی نہ کیا اور اسے وہیں پھینک کر ٹریفک کے بیچ میں سے بچتا بچاتا فٹ پاتھ تک جا پہنچا جہاں چند لوگ مجھ سے بھی پہلے ضیاء کے پاس موجود تھے۔ میں نے اس کے پاس پہنچتے ہی ضیاء کا سر اپنی گود میں رکھا اور اس کے گال تھپتھپاتا ہوا اسے ہوش میں لانے کو آوازیں دینے لگا۔ میں نے اس کے سر کا معائنہ کیا اسے بظاہر کہیں چوٹ نہ آئی تھی اس کے بازو ہاتھ کہیں سے کوئی خون بہتا دکھائی نہیں دیا تھا لیکن پچھلے چند سیکنڈ گزرنے کے باوجود وہ ہوش میں نہ آیا تھا۔ کوئی میرے پاس کھڑا اس کی نبض دیکھ رہا تھا اور کوئی میری طرح سر کا معائنہ کر رہا تھا پھر کسی نے ایمبولینس کو کال کر دی تھی یہی وجہ تھی کہ تھوڑی ہی دیر میں وہاں ایمبولینس آ پہنچی تھی۔ میں ضیاء کے ساتھ ہی ایمبولینس میں بیٹھا تو ایمبولینس کا عملہ ابتدائی طبی امداد دیتے ہوئے اسپتال کی جانب بڑھ چکا تھا راستہ بھر میں ضیاء کے ہوش میں آنے کی دعائیں کرتا رہا لیکن اسپتال پہنچنے تک بھی اسے ہوش نہیں آیا۔ راستے میں ہی میں نے بڑے بھائی مصطفی عالم کو ضیاء کو پیش آئے حادثے کی اطلاع کر دی تھی اور پھر ہمارے ضیاء کو ایمبولینس سے ایمرجنسی وارڈ میں لے جانے تک سبھی وہاں پہنچ چکے تھے۔ یہ تو اچھا ہوا جو ضیاء کے اماں اور ابا کے ساتھ دادی ماں نہیں آئی تھی وہ شاید یہ برداشت نہ کر پاتی اس لیے وہ انہیں اپنے ہمراہ نہ لائے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ میں ان کے سوالوں کا جواب انہیں ہرگز نہ دے پاتا۔ میری ماں بڑے ابا اور

مصطفی عالم بھی وہاں پہنچ چکے تھے۔ وہ ضیاء کی ماں اور ابا کو دلاسے دے رہے تھے اور میں بمشکل چھلکتی آنکھوں کے ساتھ ان کے سوالوں کے جواب دے پا رہا تھا۔

"طٰہٰ تم نے اسے روکا کیوں نہیں۔" ضیاء کی ماں کی یہ بات سن کر میں انہیں کوئی جواب نہیں دے پایا۔

"یا اللہ میرے بچے کی حفاظت فرما۔" ان کے منہ سے دعا نکلی تو میں نے اپنی لرزتی زبان سے دل ہی دل میں آمین کہا۔

ضیاء کے پاس زیادہ لوگوں کو رکنے کی اجازت نہ تھی اس کے پاس اندر ایمرجنسی میں اس کے اماں ابا اور مصطفی عالم تھے اور میرے ماں باپ اور بڑے ابا ہم سبھی باہر وارڈ میں کھڑے تھے اور ضیاء کے ہوش میں آنے کی دعائیں مانگ رہے تھے پچھلے پونے گھنٹے سے وہ بے ہوش پڑا تھا ڈاکٹرز نے ابھی تک یہی بولا تھا کہ ہوش میں آنے تک وہ کچھ نہیں کہہ سکتے۔ پھر ہماری دعائیں اللہ نے سن لیں اور بھائی مصطفی عالم ہمیں یہ بتانے کے لیے ایمرجنسی سے باہر آئے کہ ضیاء کو ہوش آگیا ہے۔ ہم سبھی جو اس سے ملنے کے لیے بے تاب تھے۔ اس کے پاس پہنچے تو جہاں اس کے ہوش میں آنے کی بے حد خوشی تھی وہیں ایک بری خبر بھی ہماری منتظر تھی۔

"ماں مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا، ابا میں کچھ نہیں دیکھ پا رہا۔" اس کے قریب پہنچتے ہی ہمیں ضیاء کی ایسی حالت دیکھ کر شدید دھچکا پہنچا چہروں پر چھائی خوشی اب زردی میں بدل گئی تھی۔ میں بے ساختہ ضیاء کے سامنے جا پہنچا اور اسے آوازیں دینے لگا۔

"ضیاء میں یہاں تمہارے سامنے کھڑا ہوں۔" وہ ہاتھ بڑھائے بے بسی سے مجھے پکارنے لگا۔

"طٰہٰ میں کچھ نہیں دیکھ پا رہا مجھے تم دکھائی نہیں دے رہے میں دیکھ کیوں نہیں رہا طٰہٰ۔" اس کی باتوں نے وہاں موجود سبھی کو رُلا دیا تھا میں نے آگے بڑھ کر ضیاء کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لے کر چوم لیا۔

"تم ٹھیک ہو جاؤ گے ضیاء فکر مت کرو ہم سب ہیں نا تمہارے ساتھ۔" میں تو فقط اسے دلاسہ دے سکتا تھا۔ اسے یقین دلا رہا تھا کہ وہ ٹھیک ہو جائے گا وہی ضیاء جو چند گھنٹوں پہلے چودھویں کی رات میں سفید پتنگ اڑائے پیچا لگا رہا تھا، تاروں سے جگمگاتے آسمان تک خوش و خرم دکھائی دے رہا تھا اور پھر میری اور راحت کی ریسٹورنٹ میں ہوئی ملاقات کا احوال جان کر مجھ پر فریفتہ ہوا جا رہا تھا اور کیسے پھر اس نے بائیک نکالی اور شہر کی جگمگاتی روشنیوں کے بیچ وہ سڑک پر ون ویلنگ کرتا ہوا اپنا توازن برقرار نہ رکھ پایا تھا۔ بیتے چند لمحوں نے ہی اسے کہاں سے کہاں لا پٹخا تھا۔ وہی ضیاء جو آج مجھ سے گرینڈ پارٹی لینے والا تھا۔ اب ایمرجنسی میں ہمارے سامنے بے بسی سے چلا چلا کر ہمیں پکار رہا تھا کہ اسے دکھائی نہیں دے رہا۔ وہ کیوں کچھ نہیں دیکھ پا رہا؟ اس سوال کا جواب ہم میں سے کسی کے پاس نہ تھا اس کے اس سوال کا جواب ڈاکٹر ہی دے سکتا تھا۔ ضیاء کے ہوش میں آتے ہی ڈاکٹر بھی اس کے پاس ہی موجود تھا اور اب وہ ضیاء کی آنکھوں کا معائنہ کر رہا تھا جب اس نے ضیاء کے سامنے ہی سبھی کو بتایا کہ ضیاء کی آنکھیں بظاہر بالکل ٹھیک ٹھاک لگ رہی تھیں اور مزید تفصیلات جاننے کے لیے انہیں ضیاء کے سی ٹی اسکین اور ایم آر آئی اور مزید کچھ ٹیسٹ کرنے ہوں گے۔ ڈاکٹر یہ سبھی ٹیسٹ لکھ کر ہمیں دے گیا تو تھوڑی ہی دیر میں ہم ضیاء کو ٹیسٹ کے لیے لیبارٹری لے گئے۔

اسپتال کی لیبارٹری میں ہی ضیاء کے سبھی ٹیسٹ لیے گئے تھے اور واپسی تک ضیاء کے ابا اس کے لیے وی آئی پی روم بک کرا چکے تھے ۔اب ہم اسے سیدھا وہیں لے آئے تھے۔ایک دم سے اپنی آنکھوں کی بینائی کھو جانے پر وہ صدمے میں لگ رہا تھا اور بار بار مجھے اپنے لیے دعائیں کرنے کو کہہ رہا تھا اور میں اسے تسلی اور دلاسہ دیتا رہا کہ وہ ٹھیک ہو جائے گا اور ہم لوگ پھر سے اس کے گھر کی چھت پر کھڑے رنگ برنگی پتنگیں اڑائیں گے۔ میں اس کے ذرا قریب بیٹھا اسے کہنے لگا ضیاء ہم ایک اتنی بڑی پتنگ اڑائیں گے جس کے ایک طرف ضیاء اور دوسری طرف طٰہ لکھا ہو گا۔''وہ میری یہ بات سن کر قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا نہیں طٰہ اب ضیاء نہیں اب پتنگ کے ایک طرف طٰہ اور دوسری طرف راحت لکھا ہو گا میں وہ پتنگ ضرور اڑاؤں گا طٰہ اور پھر اسے ہم راحت کے گھر کی چھت پر گرا دیں گے۔

اگلے روز صبح ہی تمام رپورٹس آ گئیں تو ڈاکٹر نے ہمیں ایک اور بری خبر سنادی۔ضیاء کو دکھائی نہ دینے کی وجہ اس کے سر پر لگنے والی دماغی چوٹ تھی۔خون اس کے سر سے باہر نکلنے کی بجائے اس کے دماغی خلیوں میں ہی جم کر رہ گیا تھا اور ڈاکٹر اب اس کا واحد علاج نیورو سرجری ہی بتا رہے تھے۔

ضیاء کے اماں اور ابا یہ بات جان کر سکتے میں لگ رہے تھے وہ یہ بات ضیاء سے چھپائے رکھنا چاہتے تھے۔وہ نہیں چاہتے تھے کہ ضیاء کو معلوم پڑے کہ چند روز بعد ہی اسے نیورو سرجری جیسے خطرناک آپریشن سے گزرنا پڑے گا۔لیکن پھر بھائی مصطفی عالم نے انہیں سمجھایا کہ ہمیں یہ بات ضیاء سے ہرگز نہیں چھپانا چاہیے نہیں تو یہ اس کے ساتھ بہت بڑی زیادتی کے مترادف ہو گا جو بھی بات ہے وہ ضیاء تک ٹھیک ٹھاک پہنچنی چاہیے وہ اتنا بڑا ہو چکا ہے کہ اب وہ ان سب باتوں کو سمجھ سکتا ہے۔اس گھڑی میں ضیاء کے ساتھ ہی بیٹھا تھا جب اس کی ماں اور ابا کے بجائے بھائی مصطفی عالم نے نیورو سرجری والی بات ضیاء کو بتائی وہ اسے یوں سمجھا رہے تھے جب اچانک ضیاء نے ایک سوال پوچھ لیا۔

"مصطفی بھائی نیورو سرجری میں بچنے کا چانس کتنے فیصد ہوتا ہے۔''ضیاء کا یہ سوال سنتے ہی کمرے میں جیسے سناٹا چھا گیا۔اس کے اس سوال پر مجھ سمیت سبھی کا دل جیسے دھک سے رہ گیا۔ضیاء کی ماں خود کو سنبھال نہیں پائی وہ اپنے چہرے کو آنچل میں چھپائے باہر چلی گئیں۔ضیاء کے ابا بھی ان کے پیچھے ہی چلے گئے۔ میں نے جو ہاتھ بڑھا کر ضیاء کے کاندھے پر ہاتھ رکھا تو میری آنکھیں چھلک پڑیں۔ میں نے دیکھا مصطفی بھائی بھی کوئی جواب دیئے بغیر باہر نکل گئے تھے۔

اب فقط میں ہی ضیاء کے پاس موجود تھا جب وہ میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بولا۔

"طٰہ میں زندگی بھر تم سے کھیل کے ہر میدان میں آگے رہا ہوں اور اب۔۔۔!''وہ کچھ سوچتے ہوئے رک گیا۔

"اور اب ضیاء!''میں نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"اور اب۔۔۔ میں دنیا سے بھی تم سے پہلے۔۔۔!" میں نے اگلی بات سننے سے پہلے ہی اس کے لبوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور پھر ہم دونوں ہی رو پڑے۔

اسی روز مجھے راحت کی کال آئی۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ میں اکیڈمی کیوں نہیں آیا میں نے اسے ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا تو پھر وہ بھی فوراً ہی اسپتال آ پہنچی تھی۔ جب وہ کمرے میں پہنچی تو اس وقت ضیاء کے پاس کمرے میں فقط میں ہی موجود تھا۔ میں ضیاء کے سرہانے بیٹھا تھا اور راحت پھولوں کا بوکے اٹھائے ضیاء کے پیروں کی سمت کھڑی تھی اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی کمرہ خوشبوؤں سے مہک اٹھا تھا۔ جب میں نے دھیرے سے ضیاء کے کان میں کہا۔

"ضیاء تم سے کوئی ملنے آیا ہے۔" ضیاء یہ سنتے ہی اٹھ بیٹھا وہ اس گھڑی بالکل بیمار نہیں لگ رہا تھا یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ بھلا چنگا ہو کر اٹھ بیٹھا ہو اس کے چہرے پر ایک پیاری سی مسکراہٹ سجی تھی اور پھر اس نے یہ بتا کر کہ اس کے سامنے راحت کھڑی ہے۔ اس نے ہم دونوں کو ہی حیران کر دیا تھا۔ راحت کی موجودگی تک کمرہ قہقہوں سے گونجتا رہا پھر میرے ماں اور ابا بھی کمرے میں آ پہنچے تھے۔

یہاں آج پہلی بار میں نے انہیں راحت کا تعارف کرایا تھا اس روز بڑے ابا ان کے ہمراہ نہ آئے تھے یہی وجہ تھی کہ وہ یہ بات نہیں جانتے تھے کہ راحت اور میں ایک ساتھ اکیڈمی میں پڑھتے تھے اس کے گاڑی میں بیٹھنے تک میں اسے اپنے دوست ضیاء کے لیے دعائیں کرنے کو کہتا رہا۔ پھر اس کے گاڑی میں بیٹھتے ہی ڈرائیور گاڑی لے کر آگے بڑھ گیا اور میں پلٹ کر واپس ضیاء کے پاس چلا آیا تھا۔

اسی روز ضیاء کے ابا ڈاکٹر سے ملے تھے جب ڈاکٹر نے انہیں اگلے دن صبح دس بجے آپریشن کا وقت دے دیا تھا۔ وہ چند روز تک ادویات دیتے رہے تھے کہ ہو سکتا ہے کہ ادویات سے ہی کچھ بہتری آ جائے لیکن اب ڈاکٹر مزید دیر نہیں کرنا چاہتے تھے۔

اگلے روز صبح ہم سبھی ضیاء کے پاس موجود تھے ہم اسے حوصلہ اور یقین دلا رہے تھے کہ اس کا آپریشن کے بعد وہ بالکل ٹھیک اور تندرست ہو جائے گا وہ پھر سے اپنی آنکھوں سے اس دنیا کی خوبصورتی کو دیکھ سکے گا۔ اس کے چھوٹے بہن بھائی بھی اس کے ارد گرد موجود تھے اور چھوٹی جو ابھی اتنی چھوٹی تھی کہ وہ یہ سبھی باتیں ابھی نہ سمجھتی تھی وہ بھی ضیاء کے قریب سہمی ہوئی سی بیٹھی تھی۔ میں اسے بار بار کہہ رہا تھا۔

"چھوٹی اللہ تعالیٰ سے دعا کرو ضیاء بھائی جلدی ٹھیک ہو کر گھر چلے آئیں۔" وہ میری بات سن کر اسے دہرا رہی تھی۔

"اللہ تعالیٰ ضیاء بھائی جلدی ٹھیک ہو جائیں۔"

اب پونے دس ہو رہے تھے۔ جب ضیاء کو آپریشن تھیٹر لے جانے کی تیاری ہو رہی تھی۔ جب اچانک اس نے یوں بچوں کی طرح چلانا شروع کر دیا تھا وہ یہ آپریشن کرانا نہیں چاہتا تھا۔ ابھی چند لمحوں پہلے تک ہمیں اندازہ نہ تھا کہ ضیاء جسے ہم ایک روز پہلے سے

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

امید دلا رہے تھے اسے حوصلہ رکھنے کی تلقین کرتے رہے تھے اب آپریشن سے ذرا پہلے وہ اتنا خوفزدہ ہو جائے گا کہ آپریشن کرانے سے ڈرنے لگے گا۔ ضیاء کے ابا اسے ایسا کرتا دیکھ کر اس پر جھکے اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر انہیں چومتے ہوئے بولے۔

"میرے بیٹے ہم تمہیں تندرست دیکھنا چاہتے ہیں۔'' قریب ہی کھڑی ضیاء کی ماں یہ سب دیکھ کر اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ پائی تھی اور میری ماں انہیں دلاسہ دے رہی تھی دادی ماں عینک کے پیچھے ٹپ ٹپ گرتے موتیوں کی لڑی کو اپنے آنچل میں سموتی جا رہی تھی۔ ضیاء کے ابا انہیں ذرا سہارا دے کر ضیاء کے پاس لے آئے اور وہ اپنی بھرائی ہوئی آواز میں بولیں۔

"ضیاء پتر تجھے کچھ نہیں ہو گا، کبرا نہ پتر۔'' وہ ابھی اتنا ہی بول سکی تھیں جب اسپتال کا عملہ ضیاء کو آپریشن تھیٹر لے گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں آپریشن تھیٹر کی لال بتی جل اٹھی۔ اس کا مطلب تھا آپریشن کا آغاز ہو چکا تھا ہم سبھی دل ہی دل میں ضیاء کی صحت کے لیے دعائیں کرنے لگے۔ میرے قریب ہی ضیاء کی دادی ماں بیٹھی سر جھکائے تسبیح پڑھ رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنا جھکا ہوا سر اٹھا کر میری طرف دیکھتی میں نے جگہ بدل لی۔ مجھ میں اتنا حوصلہ نہ تھا کہ میں دادی کی نگاہوں میں اٹھتے سوالوں کے جواب دے پاتا۔

ابھی چند روز پہلے ہی تو انہوں نے ضیاء کی شکایت لگاتے ہوئے میری ایک ڈیوٹی لگائی تھی کہ میں ضیاء کو ون ویلنگ جیسے خطرناک کھیل سے روکوں اور پھر ون ویلنگ کرتے ہوئے پیش آئے حادثہ کے وقت میں ہی تو اس کے ہمراہ موجود تھا اس سے پہلے کہ میں اسے ایسا کرنے سے روکتا ضیاء کو حادثہ پیش آ چکا تھا۔

اب میں جس جگہ دیوار سے لگا کھڑا تھا اس جگہ دیوار کے مخالف سمت میرے عین بالکل سامنے اسلامک کیلی گرافی کا ایک کافی بڑا فن پارہ نصب تھا جس پر اسماء الحسنیٰ اور اسماء محمد صلی اللہ علیہ وسلم نہایت خوبصورتی سے لکھے گئے تھے اللہ تعالیٰ اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر صفاتی نام کی نسبت اور تاثیر کی مناسبت سے مختلف رنگوں کا استعمال اس فن پارے کو بنانے والے کے دل میں اللہ اور اس کے پیارے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے بے پناہ عشق کا ثبوت تھا۔ وہیں کھڑے کھڑے نہ جانے کیسے میرے دل میں اس آرٹ کو سیکھنے کی خواہش نے جنم لیا اور میں سوچنے لگا کہ جب ضیاء اچھا ہو جائے گا اور مجھے فرصت کے کچھ لمحے میسر آئیں گے تو میں اسلامک کیلی گرافی کے اس فن کو ضرور سیکھوں گا اور ساتھ ہی ساتھ میں اسماء الحسنیٰ اور اسماء محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ورد کرتے ہوئے ضیاء کی صحت یابی کے لیے دعا کرنے لگا۔ بالآخر ایک طویل آپریشن کے بعد جب آپریشن تھیٹر کی لال بتی اچانک بجھی تو ڈاکٹر کو باہر آتا دیکھ کر سبھی جو بیٹھے تھے وہ بھی اٹھ کھڑے ہوئے اور اگلے ہی لمحے ڈاکٹر کی زبانی یہ الفاظ سن کر کہ ضیاء اب اس دنیا میں باقی نہیں رہا وارڈ چیخ و پکار سے گونج اٹھی۔ عین اس لمحے مجھے لگا اگر میں نے دیوار کا سہارا نہ لیا تو میں اپنے پیروں پر کھڑا نہ ہو پاؤں گا میں دیوار سے پیشانی ٹکائے بے بسی سے روتا رہا میرے عقب میں ضیاء کے اماں ابا، دادی اور خود میرے گھر والوں کا بھی یہی عالم تھا ضیاء ایک ہی پل میں ہم سے بچھڑ کر عالم برزخ میں جا پہنچا تھا جہاں سے پھر پلٹ کر کوئی نہیں آتا۔ ہم چاہے کتنا ہی رو پیٹ لیں کئی کئی روز تک

ان کو یاد کرتے کھانا پینا چھوڑ دیں ہمیں اپنے خالق کی رضا بہ رضا ہی ہونا پڑتا ہے۔ ضیاء سے بچھڑنا میرے لیے اس لیے قدر شدید صدمہ تھا کہ پھر کئی روز تک میں نے خود کو گھر میں ہی قید کر لیا تھا۔

ایک روز مجھے راحت کی کال آئی وہ بھی ضیاء کی اچانک ہوئی موت پر بے حد غمزدہ تھی اور اب مجھ سے ملنا چاہتی تھی اس نے مجھے کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا اور یہ کہہ کر فون بند کر دیا کہ وہ مجھ سے ملنے میرے گھر آ رہی ہے۔

چچا مرزا کی بات سن کر میں ایک دم سے خیالوں کے دائرے سے پلٹا وہ با آواز بلند مجھ پر ہی برس رہے تھے۔

"یہ کیا بتائے گا لڑکی کہاں ہے کبھی کسی چور نے بھی اپنی چوری قبول کی ہے لڑکی اگر گھر میں آئی ہے تو اسے ہم خود ہی ڈھونڈ لیں گے۔ چلو عبد القادر اور مائیکل تم بھی میرے ساتھ چلو۔" چچا اتنا کہہ کر آگے کمروں کی جانب بڑھ گئے اور بڑے ابا غصے کے عالم میں مجھے خشمگیں نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے جب ماں میرے پاس آتے ہی بولی۔

"طٰہٰ یہ سب کیا ہو رہا ہے میں یہ سب کیا دیکھ رہی ہوں بیٹا؟" ماں حیرت زدہ سی میرے قریب آ کر مجھ سے سوال کر رہی تھی۔

"جانے یہ مرزا کیوں میرے اور میرے بچوں کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گیا ہے۔" اتنا کہہ کر ابا مجھے ٹھوکا سا لگا کر اپنے ساتھ لے کر آگے بڑھ گئے اور اب ہم دونوں باپ بیٹا چچا مرزا کے پیچھے ہو لیے ہمارے ان تک پہنچنے تک وہ ایک کمرے کا معائنہ کر چکے تھے اور پھر وہ بابا عبد القادر اور مائیکل کو کچھ ہدایات دیتے ہوئے میرے کمرے کی جانب بڑھے انہیں اپنے کمرے کی جانب بڑھتا دیکھ کر میں نے اپنے ابا کی جانب دیکھا وہ میرا چہرہ دیکھتے ہی سارا معاملہ سمجھ گئے تھے۔ وہ چچا کو میرے کمرے میں جانے سے روکنے کے لیے آگے بڑھتے ہوئے چچا سے مخاطب ہوئے۔

"رک جاؤ مرزا"۔ لیکن ابا کے انہیں آواز دینے تک وہ میرے کمرے میں داخل ہو چکے تھے ابا نے بابا عبد القادر اور مائیکل کو باہر ہی رکنے کا اشارہ کیا اور پھر چچا کے پیچھے ہی میں اور ابا بھی کمرے میں پہنچ گئے چچا نے ابھی ایک پردہ ہٹایا ہی تھا جب وہ ابا کی آواز پر وہیں رک گئے۔

"مرزا یہ سب تم بہت غلط کر رہے ہو۔ کیا طٰہٰ یا مصطفیٰ تمہارے بچوں جیسے نہیں۔" چچا مرزا جو ابا کی بات سن کر رک گئے تھے اور جو غصے سے بے قابو ہو رہے تھے انہوں نے ایک نگاہ مجھ پر ڈالی اور خشمگیں نظروں سے میری جانب دیکھتے ہوئے بولے۔

"میرے بچوں جیسے ہیں اس لیے تو انہیں سزا دینا چاہتا ہوں کہ کہیں یہ تم جیسے نہ ہو جائیں خورشید عالم۔" چچا اتنا کہہ کر غصے سے ہاتھ ملتے باہر نکل گئے اور ابا کچھ دیر تک ساکت کھڑے چچا کی بات کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کرتے رہے۔ اتنے میں، میں نے راحت کو باہر آنے کو کہا اور وہ ہمارے عقبی جانب لگے پردے کے پیچھے سے باہر چلی آئی۔ ابا نے اسے دیکھتے ہی جیسے اپنا مزاج درست کیا اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے پیار دیتے ہوئے تسلی دینے لگے کہ وہ اسے باعزت طریقے سے اس کے گھر چھوڑ آئیں گے۔

ابھی ابا وہیں کھڑے اسے تسلی دے رہے تھے کہ جب ماں بھی ہمارے تعاقب میں میرے کمرے تک آ پہنچی اور پھر جیسے وہ ایک بار پھر سے میرے اور ابا کے درمیان کالا عبایا پہنے کھڑی راحت کو دیکھ کر ششدر سی ہو کر رہ گئی۔ راحت نے انہیں سلام کیا تو جیسے انہیں یقین آیا کہ وہ خواب نہیں دیکھ رہی بلکہ ان کے سامنے واقعی چوہدری عبد الغنی کی بیٹی راحت عبد الغنی کھڑی تھی۔ اسے دیکھتے ہی ماں سارا ہی کھیل سمجھ چکی تھی۔ بڑے ابا کے شدید غصے سے بھرے کلمات، چچا مرزا کی سارے گھر میں چھان بین اب یہ راز ان پر عیاں ہو چکا تھا پچھلے کئی لمحوں سے وہ باہر لگی کچہری میں کھڑی جو کچھ سمجھ نہیں پا رہی تھی اب وہ عقدہ ان پر کھل چکا تھا میں نے اور ابا نے انہیں اس بات سے بے خبر رکھا تھا اس بات کو محسوس کرتے ہوئے ماں جیسے کمرے میں داخل ہوئی تھی اب راحت کو میرے اور ابا کے ساتھ کمرے میں موجود پا کر الٹے پاؤں لوٹ گئی۔ ماں کے راحت سے بات کیے بغیر باہر نکل جانے پر راحت نے حیرت سے میری جانب دیکھا وہ تو فقط مجھ سے میرا حال دریافت کرنے آئی تھی اور پھر اس کے میرے کمرے میں آتے ہی میں نے پہلے اسے پردے کے پیچھے چھپا دیا پھر دیر تک وہ وہیں چھپی میرے لوٹنے کا انتظار کرتی رہی۔ پھر چچا مرزا جو اسے ڈھونڈتے کمرے میں آ پہنچے تھے وہ باتیں بھی اس نے سن لی تھیں اور اب ماں کا رویہ بھی اسے عجب لگ رہا تھا لیکن اس سے پہلے جب سبھی میرے مخالف ہو گئے تھے میرے ابا نے جو میرا ساتھ دیا تھا اور بڑے ابا کی نگاہ میں مجھے گرنے سے بچالیا تھا میں ان کا یہ احسان کبھی نہیں بھول سکتا تھا چاہے اس وقت میرا ساتھ دینے کے پیچھے ان کے کتنے ہی مفاد چھپے تھے لیکن اس سب کے باوجود ان کا وقار میری نظر میں بہت بڑھ گیا تھا۔ پھر ابا کچھ دیر تک مجھے اور راحت کو کمرے میں چھوڑ کر چلے گئے تھے اور تھوڑی ہی دیر میں جب وہ لوٹے تو انہوں نے مجھے اور راحت کو اپنے ساتھ باہر آنے کو کہا۔ باہر پورچ میں آنے تک میں نے دیکھا ابا نے ساری ہی بتیاں بجھا دی تھیں پھر وہ خود ہی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے اور انہوں نے گاڑی چوہدری عبد الغنی کے گھر سے ذرا پہلے ہی روک دی راحت گاڑی سے اتر کر مجھے اور ابا کو گھر چلنے کے لیے اصرار کرتی رہی لیکن ابا اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دیتے ہوئے بولے کہ وہ جلد ہی اس سے ملنے گھر آئیں گے۔

گاڑی واپس موڑتے ہوئے اپنے گھر پہنچنے تک ابا نے جو بھی باتیں مجھ سے کیں ان باتوں نے ساری ہی رات مجھے جگائے رکھا۔

میرے ابا کی انہی باتوں کی وجہ سے ان لمحوں کو بھی بھول گیا تھا جب بڑے ابا اور چچا مرزا مجھے خطاوار ثابت کرنے کی کوشش میں لگے تھے اور چچا تو واقعتاً ایسا کر گزرتے اگر ابا ان کے تعاقب میں میرے کمرے میں پہنچ کر انہیں روکتے نہ اور میرے وہی بے حد اچھے ابا راحت کو اس کے گھر پہنچا کر راستہ میں مجھ سے دریافت کرنے لگے کہ اگر ان کا بیٹا اور راحت ایک دوسرے کو چاہتے ہیں تو پھر وہ چوہدری عبد الغنی سے ان کی بیٹی کا ہاتھ اپنے بیٹے کیلئے مانگ لیتے ہیں۔

ابا کی یہ بات سن کر چند لمحوں تک تو مجھے اپنی سماعت پر ہی یقین نہیں آیا کہ میرے ابا جو چوہدری عبد الغنی کے سیاسی حریف تھے وہ اتنی بات کہہ سکتے تھے کہ وہ خود چوہدری عبد الغنی کے گھر جا کر اپنے بیٹے کے لیے ان کی دختر کا ہاتھ مانگیں گے۔ پھر راستہ بھر ابا اور

میں اسی موضوع پر بات کرتے رہے تھے اور اب اپنے کمرے میں پہنچ کر یہی سوچتے ہوئے جیسے میری نیند ہی اڑ چکی تھی۔ ابھی تو فقط ابا نے مجھ سے اس سلسلے میں بات ہی کی تھی لیکن میں جیسے ابھی سے راحت کو پا لینے کی خوشی میں پھولے نہ سما رہا تھا۔ جب ایک دم سے مجھے ضیاء کا خیال آگیا آج اگر وہ زندہ ہوتا تو اسے یہ سن کر کتنی خوشی ہوتی۔ ضیاء کا خیال آتے ہی میں مضطرب سا ہو کر اس کی مغفرت کے لیے سوہنے رب کے حضور دعائیں کرنے لگا۔

اگلے روز صبح سویرے ہی ماں میرے کمرے میں آئی وہ جو رات غصے کے عالم میں راحت سے ملے بغیر ہی کمرے سے چلی گئی تھی اب یکسر بدلی ہوئی لگ رہی تھی۔ وہ کمرے میں پہنچتے ہی پہلے مجھے یوں پیار سے جگانے لگی جیسے میرے بچپن کی ہر صبح وہ میری پیشانی چوم کر مجھے جگایا کرتی تھی۔ میں نے جاگتے ہی اپنا سر ماں کی گود میں رکھ دیا اور وہ پیار سے میرے بال سہلاتے ہوئے بولی۔

"میرا بیٹا اتنا بڑا ہو گیا ہے کہ اب وہ مجھ سے اپنی باتیں بھی چھپانے لگا ہے۔" میں ماں کی بات کا مفہوم سمجھ چکا تھا کہ وہ مجھ سے کس بات کے چھپانے کا شکوہ کر رہی تھی بس میں کچھ دیر تک یونہی خاموش رہا اور پھر بولا۔

"ماں میں نے آپ کو راحت سے ملوایا تھا جب ضیاء اسپتال میں تھا وہ اس سے ملنے آئی تھی وہیں آپ اور ابا کو میں نے راحت سے ملوا دیا تھا۔" میری یہ بات سنتے ہی ماں جھٹ سے بولی۔

"ہاں بیٹا جی یاد ہے مجھے تم نے اسے اپنے ابا کو اس سے ضرور ملوایا تھا اور ہمیں پوچھے بنا ہی یہ بھی بتا دیا تھا کہ راحت تمہارے ساتھ اکیڈمی میں پڑھتی ہے۔" اور پھر اگلی بات کہنے سے پہلے ماں نے میرے گال پر اپنے ہاتھ سے ایک چپت لگائی اور بولی۔

"بیٹا جی آپ نے یہ بات تو ہم سے چھپائے ہی رکھی کہ آپ اور راحت ایک دوسرے سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔" ماں کی یہ بات سن کر میں شرما کر ماں کی گود میں اور بھی سمٹ گیا تھا۔ جب اگلی بات سن کر میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں ماں کی گود میں سر رکھے یونہی پڑا رہوں۔ ماں میرے بالوں کو سہلاتے ہوئے بولتی رہی۔ وہ مجھے بتا رہی تھی کہ میرے ابا، بڑے ابا سے اس سلسلے میں بات کرنے گئے تھے کہ وہ چوہدری عبدالغنی کے ہاں طٰہ کے لیے ان کی بیٹی کا ہاتھ مانگنے جانا چاہتے ہیں پھر اماں میرے ساتھ شادی کی تیاری تک کی باتیں کر کے چلی گئی اور میں اپنے بستر پر پڑا سوچنے لگا کہ جب میرے ابا خورشید عالم بڑے ابا سے میرے اور راحت کے رشتے والی بات کریں گے تو کیا وہ اس رشتے پر راضی ہوں گے یہ خیال ذہن میں اٹھتے ہی اب میں عجب سیمائی کیفیت میں مبتلا ہو رہا تھا۔ ایک رات پہلے میں نے بڑے ابا کو کس قدر شدید غصے میں دیکھا تھا جب کسی نے انہیں یہ اطلاع کر دی تھی کہ چوہدری عبدالغنی کی بیٹی چوری چھپے ان کے پوتے سے ملنے ان کے گھر موجود تھی لیکن پھر میرے ابا خورشید عالم کی مداخلت پر وہ یہ ثابت نہیں کر پائے تھے کہ راحت واقعتاً گھر میں موجود تھی یا نہیں اور پھر یہ سوچ کر مجھے کچھ سکون ملا اور ساتھ ہی میں دعائیں کرنے لگا کہ یا اللہ میرے بڑے ابا کو اس رشتے پر کوئی اعتراض نہ ہو کیونکہ ایک وہی تھے جن کے راضی ہونے پر بات آگے بڑھ سکتی تھی تھوڑی دیر تک میں یونہی خیالوں میں گم بستر پر پڑا رہا اور پھر بستر سے نکل کر تازہ دم ہو کر میں نے اپنے کمرے سے ایک قدم باہر ہی رکھا تھا کہ جب میں

نے دیکھا ابا میری طرف ہی بڑھے چلے آ رہے تھے۔ انہوں نے قریب آتے ہی مجھے اپنے گلے سے لگا لیا وہ بے حد خوش دکھائی دے رہے تھے۔ انہی کی زبانی مجھے معلوم پڑا کہ بڑے ابا کو میرے اور راحت کے رشتے پر کوئی اعتراض نہ تھا بلکہ انہیں تو یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی تھی وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کی جوان اولاد غلط راہ پر چل نکلے۔ ابا یہ خوشخبری سنا کر چلے گئے اور میں جو یہ خوشخبری سن کر پھولے نہ سما رہا تھا مجھے ایک بار پھر اپنے دوست ضیاء کا خیال آ گیا اور میں وہیں سے الٹے پیروں اپنے کمرے میں لوٹ گیا۔

اگلے روز جب ماں، مصطفی عالم، ابا اور بڑے ابا چوہدری عبدالغنی کے ہاں جانے کی تیاری کر رہے تھے عین وقت پر چچا مرزا نے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ چچی جو ابھی ابھی اپنے کمرے سے تیار ہو کر باہر آئی تھی وہ بھی چچا کا انکار سن کر حیرت زدہ سی رہ گئی کہ اچانک سے یہ انہیں کیا ہو گیا تھا۔ وہ بار بار یہی کہہ رہے تھے کہ باقی سب جاتے ہیں تو جائیں لیکن وہ نہیں جائیں گے بلکہ وہ بڑے ابا کو بھی ساتھ جانے سے روکتے رہے پھر میرے ابا کے استفسار پر کہ وہ ان کے ہمراہ کیوں نہیں جانا چاہتے؟ انہوں نے تلخ کلامی سے جواب دیتے ہوئے کہا کہ وہ جانتے ہیں کہ چوہدری عبدالغنی کبھی اس رشتے کو قبول نہیں کریں گے اور وہ وہاں جا کر اپنی بے عزتی نہیں کرانا چاہتے۔ اس سے پہلے کہ چچا کے ایسے جواب کا میرے ابا کوئی جواب دیتے بڑے ابا نے انہیں اشارتاً ایسا کرنے سے روک دیا اور پھر وہ ابا سے کہنے لگے کہ اگر مرزا نہیں جانا چاہتا تو یہ ان کا اپنا فعل ہے وہ خاندان بھر کی خوشیوں میں اگر شریک نہیں ہونا چاہتا تو نہ ہو ہم کسی کے ساتھ کوئی زور زبردستی کا معاملہ نہیں رکھیں گے۔ اگر چوہدری عبدالغنی اس رشتے سے انکار کرنا چاہتے تو پھر وہ ہمیں گھر بلاتے ہی کیوں، وہیں کھڑے کھڑے چچا نے بڑے ابا کی یہ باتیں سن کر چچا کو اشارہ کیا اور پھر وہ ساتھ چلنے کے لیے راضی ہو گئے۔ یہ دیکھ کر ماں، ابا، بڑے بھائی، مصطفی عالم اور بڑے ابا ہم سبھی خوش ہو گئے کہ ایسے موقعوں پر سب کو ایک ساتھ ہی ہونا چاہیے تھا۔ جب سبھی چوہدری عبدالغنی کے ہاں بات طے کرنے کو چلے گئے تو میں اب گھر پر تنہا ہی تھا اور میرا وقت گزارنا بے حد دشوار ہو رہا تھا میں نے راحت سے گپ شپ لگانے کو جو کال کی تو چند ایک باتوں کے بعد اس نے بھی یہ کہہ کر کال کاٹ دی کہ وہ بے حد مصروف ہے۔ یوں وہ ایک ایک پل میں نے گن گن کر گزارا اور پھر جو رات گئے سبھی واپس لوٹے تو مبارک بادیوں اور میٹھے قہقہوں سے ساری حویلی جھوم اٹھی۔ چوہدری عبدالغنی نے مہمان نوازی اور خاطر مدارت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ چچی اور چچا مرزا جن کو ہمراہ لے جاتے ہوئے کچھ تلخ کلامی بھی ہو گئی تھی اب گاڑی سے اترتے ہی انہوں نے مجھے گلے سے لگاتے ہوئے مبارک باد دی تو حویلی کے کسی کونے میں دبکی بیٹھی چچا مرزا کی دونوں صاحبزادیاں آمنہ اور یومنہ بھی یہ آوازیں سن کر وہاں پہنچ گئیں۔ یومنہ تو اس وقت بہت چھوٹی تھی آمنہ نے بھی مجھے مبارک باد دی۔ وہ بھی بہت خوش لگ رہی تھی اور جب میں نے ماں سے منگنی کی رسم کے حوالے سے دریافت کیا تو گویا انہوں نے مجھے یہی بتا کر حیران کر دیا کہ ابھی تو چوہدری عبدالغنی نے سوچنے کے لیے کچھ مہلت طلب کی تھی لیکن ساتھ ہی وہ مجھے بتانے لگی کہ سبھی وہاں دونوں خاندانوں کے جڑنے سے اتنا خوش تھے کہ سمجھو کہ رشتہ تو پکا ہو ہی چکا ہے پھر ان کی یہ بات سن کر مجھے کچھ تسلی ہوئی۔

اگلے روز یہ خبر سارے شہر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل چکی تھی میرے وہ دوست جن سے ابھی میں نے راحت کا ذکر تک نہ کیا تھا وہ بھی مجھے کال کر کے مبارک باد دے رہے تھے۔ باہر طرح طرح کے تبصرے ہو رہے تھے کوئی اس بات پر یقین کرنے کو تیار ہی نہ تھا اور کوئی اس فیصلے کو درست قرار دے رہا تھا۔ کئی جواریوں نے تو جوا لگا دیا تھا اور میں ابھی تک نہیں جانتا تھا کہ جیت کسے ملنے والی تھی ہارنے والا کون تھا۔ میں تو فقط اس نشے میں ڈوبا مست ہوا رہتا تھا کہ راحت میری ہونے جا رہی تھی میری پہلی چاہت میرا سکھ چین راحت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے میری ہو رہی تھی۔

ابھی اس بات کو چند روز ہی بیتے تھے کہ گھر میں پھر ایک نیا فساد برپا ہو گیا۔ میرے ابا خورشید عالم اور چچا مرزا کے درمیان پھر سے جھگڑا شروع ہو گیا تھا اور اس جھگڑے کی شروعات وہاں سے ہوئی جب چچا مرزا نے بڑے ابا سے آمنہ اور میرے بڑے بھائی مصطفی عالم کے رشتے والی بات کی وہ چاہتے تھے کہ اگر میرے ابا نے میرا رشتہ خاندان سے باہر کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا تو پھر اپنے بڑے بیٹے مصطفی عالم کے لیے ان کی بیٹی آمنہ کا رشتہ قبول کر لیں اور جب طٰہ کی منگنی ہو تو پھر ساتھ ہی ان کی بیٹی اور مصطفی عالم کی منگنی بھی ایک ساتھ ہو جائے لیکن جب بڑے ابا نے چچا مرزا کی خواہش ابا کو بتائی تو ماں نے ابا سے یہ بات سن کر فوراً ہی اس رشتے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ ان کا بیٹا جو ایم فل کر رہا تھا پہلے اپنی تعلیم مکمل کرے تو پھر وہ اس کی شادی کے حوالے سے سوچیں گے لیکن ماں کی کہی یہ بات فقط رشتے کو ٹالنے کا ایک جواز تھا در حقیقت تو اس رشتے سے انکار کی وجہ آمنہ کی تعلیم تھی وہ ایف اے کے بعد تعلیم چھوڑ چکی تھی اور یوں چچا یہ انکار برداشت نہ کر سکے تھے انہوں نے پھر سے جائیداد کا مطالبہ اٹھا لیا۔

میرے ابا اور چچا مرزا کے درمیان ابھی یہ سرد جنگ جاری ہی تھی کہ جب ایک روز بڑے ابا نے سبھی کو اپنے پاس طلب کر لیا مجھ سمیت سبھی کا خیال یہی تھا کہ شاید بڑے ابا چچا مرزا اور خورشید عالم کے درمیان چل رہی رنجش کو مٹانے اور دونوں بھائیوں کے درمیان صلح کرانے کے لیے سبھی کو اکٹھا کر رہے تھے لیکن جب سبھی وہاں جمع ہو گئے تو بڑے ابا نے نہایت افسوس کے ساتھ یہ بات بتائی کہ چوہدری عبدالغنی نے اپنی بیٹی کا ہاتھ دینے سے انکار کر دیا ہے۔ بڑے ابا کی زبانی یہ بات سن کر مجھ سمیت سبھی نے تاسف سے ایک دوسرے کی جانب دیکھا جیسے انہیں بھی میری طرح اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ پھر بڑے ابا ذرا تفصیل سے بتانے لگے کہ چوہدری عبدالغنی نے فون پر ان سے رابطہ کیا اور بتایا کہ انہیں اس رشتے پر کوئی اعتراض نہ تھا لیکن اب وہ مجبور تھے انہوں نے جب اپنے خاندان والوں سے بات کی تو انہوں نے اس رشتے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا اور وہ اپنے خاندان کے خلاف نہیں جانا چاہتے تھے بڑے ابا ابھی یہ ساری تفصیل بتا ہی رہے تھے کہ جب چچا مرزا اپنی نشست سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"اور ڈھول پیٹتے پھرو سارے شہر میں کہ ہم لوگوں نے چوہدری عبدالغنی کے ہاں رشتہ پکا کر لیا ہے۔" وہ عجیب مضحکہ خیز انداز میں بات کر کے کمرے سے باہر نکل گئے۔

☆☆☆☆☆☆☆

باب 9

تمنائے دل

چچا مرزا کے یوں اس انداز سے کمرے سے چلے جانے پر میرے ابا خورشید عالم بھی اپنا ضبط قائم نہ رکھ سکے۔ وہ بڑے ابا کی باتیں سن کر بوکھلائے ہوئے لگ رہے تھے۔ گویا انہیں لگتا تھا کہ چوہدری عبدالغنی کی بیٹی جو ان کے بیٹے طٰہ کی محبت میں گرفتار چوری چھپے ان کے گھر آنے سے بھی نہ ڈرتی تھی وہ کسی صورت میں بھی اس رشتے سے انکار نہ کریں گے اور اب سبھی کچھ ان کی سوچ کے برعکس ہو رہا تھا۔ وہ اپنی نشست سے اٹھ کر بڑے ابا کے رُوبرو جا بیٹھے اور رنجیدہ خاطر ہو کر بولے۔

"ابا جی آپ چوہدری عبدالغنی سے دوبارہ اس سلسلے میں بات کریں یہ دو خاندانوں کا نہیں بچوں کی زندگیوں کا معاملہ ہے۔" ابھی ابا نے اپنی بات مکمل ہی کی تھی جب بڑے ابا یوں غصے سے بھڑک اٹھے اور اپنی نشست سے اٹھتے ہوئے آزردگی سے بولے۔

"بس کرو خورشید عالم، اپنے بچوں کی غلطیاں سدھارنے کی بجائے انہیں غلطیاں کرنے سے روکو۔" ایسا کہتے ہوئے بڑے ابا نے یوں خشمگیں نظروں سے میری جانب دیکھا کہ جن کی تاب نہ لاتے ہوئے میں مزید پل بھر بھی وہاں کمرے میں نہ ٹھہر سکا اور وہاں سے سیدھا اپنے کمرے میں چلا آیا تھا۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر میری عجب حالت ہو رہی تھی۔ پچھلے کئی روز سے جس محبت کو پا لینے کے میں سپنے بُنتا رہا تھا۔ وہ سپنے یوں پل بھر میں بکھر جائیں گے ایسا میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا اور اب میں راحت سے ملنے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا۔ میں نے جھٹ سے اپنے موبائل سے اس کا نمبر ڈائل کیا بیل جاتی رہی لیکن اس نے کال اٹینڈ نہیں کی۔ ایسا دیکھ کر میری اذیت مزید بڑھ رہی تھی میں بے کل سا ہو کر کمرے میں چکر کاٹنے لگتا اور کبھی آرام کرسی پر بیٹھ جاتا۔ ابھی چند ساعتیں ہی مجھ پر گراں گزری تھیں کہ یکایک میرے موبائل پر راحت کی کال آ گئی۔ میں نے جھٹ سے فون اٹھا کر کال ریسیو کی تو وہ میرا حال دریافت کر رہی تھی۔ وہ پریشان لگ رہی تھی۔ اس کی آواز سے لگ رہا تھا کہ وہ روتی رہی تھی اور مجھے یوں ظاہر کر رہی تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا اور میرا ابھی جو دل مجروح ہوا تھا تو میں بھی کہاں تک اپنی حالت چھپاتا۔ وہ میری ڈھارس بندھاتی رہی اور میں اسے تسلی دیتا رہا پھر وہ مجھے بتانے لگی کہ طٰہ میں اپنے ڈیڈی سے کہوں گی وہ جلد اپنے خاندان بھر کو راضی کر لیں گے۔ انہیں اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا اس کی بات سن کر میں نے اس سے ملنے کے لیے درگاہ آنے کو کہا اور وہ آنے کے لیے راضی ہو گئی۔ اسی شام میں راحت سے ملنے درگاہ

جا پہنچا۔ وہ میرے خاصا انتظار کرنے کے بعد وہاں پہنچی تھی وہ بے حد ڈری اور سہمی لگ رہی تھی۔ وہ میرے پاس پہنچتے ہی بتانے لگی کہ اب وہ مجھ سے کھلم کھلا ملنے نہیں آسکے گی اور اس کی وجہ اس کے انکل تھے۔

اس کے ڈیڈی چوہدری عبد الغنی نے جب رشتے کی بابت اپنے بڑے بھائی سے بات کی تو وہ جیسے اپنے بھائی کی معصومیت پر عش عش کر اٹھے انہیں سمجھانے لگے کہ بھائی صاحب یہ آپ کیا کرنے جارہے ہیں اپنے سیاسی رقیبوں کے ہاں ہی اپنی بیٹی بیاہنے چلے ہیں سوچیں اگر آپ خورشید عالم سے رشتہ جوڑلیں گے تو آنے والا الیکشن آپ خورشید عالم کی ٹکر میں لڑ سکیں گے؟ تب چوہدری عبد الغنی نے اپنے بڑے بھائی کی اس بات پر غور کیا اور پھر رشتے سے انکار کر دیا اور اب اس کے انکل نے راحت پر پہرہ بھی بٹھا دیا تھا اتنا سب ہو جانے کے باوجود میں راحت کی باتیں سن کر حیران ہو رہا تھا وہ مجھے یقین دلا رہی تھی کہ سب اچھا ہو جائے گا اسے کچھ وقت لگے گا اور وہ اپنے ڈیڈی کو راضی کر لے گی۔ وہ ایسا اس قدر یقین سے کہہ رہی تھی کہ مجھے بھی اس کی باتوں پر یقین آنے لگا تھا۔ اس روز کے بعد ہم فون پر ہی باتیں کرنے لگے تھے۔ جب انہی دنوں میرا ایف ایس سی کا رزلٹ آ گیا۔ میں پاس ضرور ہوا تھا لیکن نمبر اتنے کم تھے کہ پھر مجھے کسی اچھی یونیورسٹی میں ایڈمشن نہ مل سکا لا محالہ بی اے میں ایڈمیشن لے کر ساتھ ہی میں ایک آرٹ سکول سے اسلامک کیلی گرافی کا فن سیکھنے لگا۔ یہ وہی دن تھے جب تک میں شراب، جوا اور ابا کی سیاست سے ابھی دور ہی تھا اور اس دوری کی وجہ ماں تھی جو ہر حال میں یہ چاہتی تھی کہ میں پہلے اپنی تعلیم مکمل کرلوں پھر سیاست تو گھر کی باندی تھی لیکن ابا کی سوچ اس سے بالکل برعکس تھی پہلے۔ پہلے وہ مصطفی عالم کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کرتے رہے لیکن ابا کی پے در پے سیاسی ناکامیوں کو دیکھ کر مصطفی عالم کا دل خود ہی بھر گیا تو انہوں نے اپنی ساری توجہ تعلیم پر مرکوز کرلی اور اب باقی بچا تھا میں تو ایک روز جب میں آرٹ کی کلاس لے کر گھر پہنچا تو مجھے گھر کے دروازے پر ہی اپنے ابا مل گئے انہوں نے سر تا پاؤں ایک بار مجھے دیکھا اور پھر میرے کاندھے کو تھپتھپاتے ہوئے بولے۔

"بیٹا طہٰ یہ تم نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے۔" ابا کی بات سن کر میں نے اپنے دونوں ہاتھوں میں تھامے بڑے بڑے کینوس ایک طرف رکھے اور بولا۔

"بابا جی میں ایک آرٹ سکول میں کیلی گرافی سیکھ رہا ہوں۔" وہ میری بات سنتے ہی جھٹ سے بولے۔

"بیٹا اچھا شوق ہے، تم اتنی محنت بھی کر رہے ہو لیکن تمہیں یہ سیکھ کر ملے گا کیا؟" ابا کی یہ بات سن کر میں انہیں کوئی جواب نہ دے سکا تو وہ میرے قریب کھڑے کچھ سوچتے ہوئے دوبارہ بولے۔

"چلو بیٹا ایسا کرو کہ تم الیکشن ہال میں آج میرے ساتھ چلو الیکشن قریب آرہا ہے اور بہت سے ایسے کام ہیں بیٹا جو میں تمہارے ذمہ لگانا چاہتا ہوں۔" ایسا کہتے ہوئے وہ بہت سنجیدہ لگ رہے تھے ان کی بات سن کر میں سیدھا اپنے کمرے میں پہنچا اور تیار ہو کر جو میں باہر آیا تو ابا باہر میرا ہی انتظار کر رہے تھے۔ سکھ چین کے بڑے سے پھیلے ہوئے پیڑ کے نیچے ہی ابا کی کالی پجارو کھڑی تھی جس پر ابا

کے انتخابی نشان والے اسٹیکر بھی لگے ہوئے تھے۔ میرے وہاں پہنچتے ہی نہ جانے کہاں سے ہوا کا تیز بگولا آیا اور میرے سر پر سکھ چین کے سر سبز پتوں کی تالیوں کا شور گونجنے لگا۔ پھر میرے اور ابا کے گاڑی میں بیٹھتے ہی مائیکل نے گاڑی الیکشن کیمپ کی جانب بڑھا دی راستہ بھر ابا میرے اور راحت سے متعلق ہی باتیں کرتے رہے وہ اب یہ جان کر بے حد خوش تھے کہ راحت اور میں ابھی تک ایک دوسرے سے ملتے رہتے تھے۔

الیکشن آفس پہنچ کر گاڑی رکی تو ہمارے گاڑی سے اترتے ہی ابا سے ملنے آئے ان کے دوست احباب پُر تپاک استقبال کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہاں بہت سے چہرے تو ایسے تھے جنہیں میں پہچانتا ہی تھا لیکن چند ایک میرے لیے نئے بھی تھے ان نئے چہروں میں بوبی اور ذیشان بھی تھے جنھوں نے اسی سال ابا کی پارٹی میں شمولیت اختیار کی تھی۔ وہ میرے ہم عمر ہی لگ رہے تھے اور ایسے متحرک کارکن ابا کے بڑے کام کے آدمی ہوتے تھے۔ ابا مجھے کچھ دیر تک یونہی لوگوں سے ملواتے رہے۔ سیاسی تبصرے چلتے رہے پھر انہوں نے مجھے اٹھنے کا اشارہ کیا اور میں ان کے ہمراہ الیکشن کیمپ میں بنے ان کے آفس میں چلا آیا آفس میں داخل ہو کر ابا نے اپنی اونچی نشست والی کرسی پر خود بیٹھنے کے بجائے مجھے بٹھایا اور پھر میرے رُوبرو بیٹھتے ہوئے بولے۔

"طٰہٰ بیٹا تم اور راحت ایک دوسرے کو بے پناہ چاہتے ہو مجھے اس بات کا احساس ہے اور بیٹا تمہارے بڑے ابا کو بھی یہ بات پتا ہے لیکن تم جسے چاہتے ہو وہ کسی عام سے شخص کی بیٹی نہیں بلکہ وہ ہمارے سب سے بڑے سیاسی حریف چوہدری عبد الغنی کی بیٹی ہے اور وہ کسی طور یہ نہیں چاہیں گے کہ وہ اپنی بیٹی کا ہاتھ ہمیں تمہارے لیے دیں ان لوگوں نے تو بیٹا تمہارے بڑے ابا کی زبان کی لاج بھی نہیں رکھی تو پھر!۔۔۔"

ابا بات ادھوری چھوڑ کر رک گئے جب میں نے ان کی اگلی بات کو جاننے کے لیے انہی کی بات کو دہرایا۔ "تو پھر ابا؟" میری بات سن کر جیسے وہ میرے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے بولے۔

"تو پھر اپنا حق چھین لو بیٹا۔" ابا نے یہ بات اس قدر زور ڈالتے ہوئے کہی کہ مجھے لگا ان کی ایک بار کہی بات کئی بار میرے ذہن سے ٹکراتی رہی تھی ان کی کہی اس بات کی گونج ابھی کمرے میں باقی تھی جب وہ میرے سامنے سے اٹھے اور کمرے میں ایک جانب پڑے کیبنٹ میں چابی لگا کر وہ ایک بریف کیس نکال لائے۔ بریف کیس کو میز پر رکھتے ہوئے کھول کر ابا نے میری جانب کر دیا۔

پانچ پانچ ہزار کے نوٹوں سے بریف کیس بھرا پڑا تھا۔ روپے پیسے کی ریل پیل تو گھر میں تھی ہی لیکن اتنا سارا پیسہ آج میں نے پہلی بار دیکھا تھا میری نگاہیں کبھی بریف کیس میں موجود پیسہ تولنے لگتیں تو کبھی میں سوالیہ نگاہوں سے ابا کو دیکھنے لگتا جب ابا میری اضطرابی کیفیت کو بھانپتے ہوئے بولے۔

"یہ سارا پیسہ تمہارے لیے ہے طٰہٰ جاؤ اپنی محبت کو اس شہر سے بہت دور لے جاؤ اور جب تک یہاں حالات ٹھیک نہ ہو جائیں تمہیں یہاں لوٹنے کی ضرورت نہیں۔" آخری بات کہتے ہوئے ابا نے میرے سامنے پڑے بریف کیس کو اپنے ہاتھوں سے بند کیا اور پھر

اسے میری جانب سرکا دیا ایسا دیکھ کر ایکا ایکی میں اپنی نشست سے اٹھا، مجھے ابا پر بے حد پیار آیا میں آگے بڑھ کر ان کے سینے سے جا لگا اور وہ مجھے دعائیں دیتے رہے پھر وہیں سے میں مائیکل کو ساتھ لے کر بینک پہنچا جہاں میں نے وہ سارا پیسہ اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرایا اور واپسی پر مائیکل مجھے گھر چھوڑ کر گاڑی واپس الیکشن ہال میں لے گیا۔

روپیہ، پیسہ دولت چیز ہی ایسی ہے اگر یہ انسان کے پاس نہ ہو تو انسان اسے حاصل کرنے کی جہد میں بے قرار رہتا ہے اور اگر یہ بینک بیلنس یا تجوریوں میں بھرا پڑا ہو تو تب بھی یہ انسان کو بے قرار ہی رکھتا ہے۔ پچاس لاکھ روپے ابا نے مجھے سونپ دیے اور اب یہ سارا پیسہ اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرانے کے بعد میں آزاد تھا۔ اب میں چاہے تو اس روپے پیسے سے کچھ بھی خرید سکتا تھا من چاہی زندگی گزار سکتا تھا شہر بھر کے وہ ریسٹورنٹ، کلب، بار، گالف، کیسینو اور ایسی تمام جگہیں جہاں جانے کے لیے وافر پیسہ درکار تھا اب وہ سبھی جگہیں میری دسترس میں تھیں۔ چند لمحوں، چند گھڑیوں پہلے میں کیا تھا اور اب ان لمحوں میں، میں کیا کچھ سوچ رہا تھا۔

اک عجب اضطراری کیفیت تھی ایک عجب سرور تھا میں کچھ دیر لیٹ کر آرام کرنا چاہتا تھا اور پھر رات میں آج جشن منانا چاہتا تھا لیکن بستر پر لیٹتے ہی میں آنکھیں بند کرتا تو پلکوں تلے سے نیند نہ جانے کہاں کھو گئی تھی دن بھر میں اب اس سمے شام ڈھلے میں تھک ہار کر چند گھڑی آرام کر لیا کرتا تھا لیکن آج تھکن نام کی کوئی چیز ہی نہ محسوس ہو رہی تھی۔

راحت سے بات کیے بھی کافی دن بیت چکے تھے۔ اب میں اس سے دوٹوک بات کرنا چاہتا تھا کہ اگر اس کے ڈیڈی نہیں مان رہے تو پھر ہم دونوں یہاں سے بھاگ چلیں گے کہیں دور جہاں کوئی ہم تک نہ پہنچ پائے جہاں اس کے اور میرے ابا کی سیاست ہمارے ملن کی راہ میں بیڑی نہ بنے جہاں ہم اپنا اک نیا جہاں بسائیں۔ اور اب اسے اپنے دل کی یہ بات کہنے کے لیے میں نے اپنے فون سے اس کا نمبر ملایا نہ جانے اس گھڑی وہ بھی مجھ سے یہی بات کرنے کو بے تاب بیٹھی تھی اس نے پہلی بیل جانے پر ہی کال ریسیو کر لی۔

"طٰہٰ میں راحت۔" اس کی بھرائی ہوئی آواز سن کر میں مضطرب سا ہو کر بولا۔

"ہاں راحت میں نے تمہیں پہچان لیا کیا ہوا تمہیں۔" وہ میری بات سن کر خاموش رہی جب میں عجب اضطراری کیفیت میں اس کے جواب کا منتظر تھا وہ کچھ دیر خاموشی کے بعد دوبارہ بولی۔

"سب کچھ ختم ہو گیا طٰہٰ سب کچھ۔" اس کی بات سنتے ہی میرے پیروں تلے سے جیسے زمین کھسکنے لگی تھی۔

میں ابھی تک اس کی حالت کو سمجھ نہیں پایا تھا کہ وہ رقت آمیز لہجے میں بول رہی تھی زبان پر بات کرتے ہوئے رعشہ سا طاری تھا۔ اس نے ابھی تک کچھ نہیں بتایا تھا وہ فقط اتنا کہہ کر خاموش ہو گئی تھی کہ سب کچھ ختم ہو گیا طٰہٰ اور میں بھی دم سادھے کھڑا سوچ رہا تھا کہ بیتے چند روز میں ایسی کیا انہونی ہو گئی کہ جواب راحت اس قدر آبدیدہ لگ رہی تھی دوسری جانب مکمل خاموشی پا کر میں فوراً بولا۔

"راحت کچھ تو بتاؤ خدارا بولو کہ ایسا کیا ہو گیا جو سب کچھ ختم ہو گیا۔" وہ میری یہ بات سنتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور اب اس سے بات بھی ٹھیک سے نہیں ہو پا رہی تھی پھر چند گھڑیاں یونہی گزر گئیں اور جب وہ ذرا سنبھلی تو اس کی بات سن کر مجھے ذرا سنبھلنے کے لیے سہارے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے اس کی منگنی ہونے جا رہی تھی اپنے ماموں زاد سے اور وہ چند روز میں دبئی سے پاکستان آ رہا تھا صرف اور صرف راحت سے منگنی کے لیے میں اس کی بات سن کر چلاتے ہوئے بولا۔

"ایسا نہیں ہو سکتا راحت تم تو کہتی تھیں تمہارے ڈیڈی مان جائیں گے پھر کیا ہوا۔" میری یہ بات سن کر وہ گھٹی گھٹی سی آواز میں بولی۔

"میں کچھ نہیں کر سکی طہٰ میں جو کچھ کر سکتی تھی میں نے کر لیا وہ نہیں مانے اور وہ ہرگز نہیں مانیں گے۔" اس کی بات ختم ہوتے ہی میں جھٹ سے بولا۔

"میں تم سے ملنا چاہتا ہوں راحت۔" اس نے میری بات سن کر ملن کے لیے ہامی بھر لی وہ تو خود بھی مجھ سے ملنے کے لیے بے تاب تھی لیکن ساتھ ہی اپنی مجبوری بتاتے ہوئے اس نے فوراً ملنے سے انکار کر دیا تھا۔ راحت سے بات کرنے کے بعد میں خاصی دیر تک بے حس و حرکت اپنی جگہ پر ہی بیٹھا رہا اور سوچتا رہا کہ "میں اتنی آسانی سے سب کچھ ختم نہیں ہونے دوں گا چوہدری عبد الغنی میں راحت کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔۔۔ یہاں سے بہت دور۔۔۔!" یونہی سوچتے ہوئے مجھے کمرے میں گھٹن اور گھبراہٹ کا احساس ہونے لگا تھا۔ میں اپنے کمرے سے نکلا اور منی پجارو لے کر الیکشن آفس چلا آیا رات کے اس پہلے پہر فقط بوبی اور ذیشان ہی وہاں موجود تھے وہ کیبل پر کوئی مار دھاڑ سے بھرپور فلم سے لطف اندوز ہو رہے تھے جب وہ مجھے وہاں دیکھ کر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے گویا انہیں اپنی بصارت پر یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔

وہ مجھے وہاں بیٹھنے کو کہتے رہے لیکن میں نے انہیں خود ہی اشارتاً کہیں اور چلنے کو کہا اور انہیں ساتھ لے کر میں ایک کیسینو بار چلا آیا یہ جگہ ہی ایسی تھی جہاں میں ان دونوں کے بغیر نہیں آ سکتا تھا اور اس سے پہلے میں نے ہمیشہ اس جگہ کو دور دور سے ہی دیکھا تھا۔ اندر داخل ہوئے بوبی اور ذیشان میرے دائیں بائیں یوں چل رہے تھے جیسے وہ میرے باڈی گارڈ ہوں۔ اندر ہال روشنیوں سے جگمگا رہا تھا اس کی سیڑھیاں اترتے ہوئے یکایک میں آخری سیڑھی سے نیچے قدم رکھتے ہوئے اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا جب عین اسی لمحے میں نے سامنے کھڑی لڑکی کے عقبی جانب سے ایک ہاتھ بڑھا کر اس کے کاندھے کا سہارا لیا اور میں گرتے گرتے سنبھل گیا۔ وہ دراز قد ریشم و اطلس کی ساٹن پہنے کاندھوں پر دراز گیسو بکھیرے چونک کر پلٹی اور اس کے ہاتھ میں صراحی نما جام چھلکا تو اس کی خشمگیں نگاہیں جو مجھ پر پڑیں اور اس کے لب بھی ہلے لیکن وہ کچھ بول نہ سکی۔ تبھی اس کے عقب سے ایک جسیم نوجوان نمودار ہوا اور وہ اس کے لباس پر گری بیئر کو اپنے رومال سے صاف کرتے ہوئے مخاطب ہوا۔

"عبیرہ کس نے کیا یہ سب؟" اور یہ کہتے ہوئے اس کی نگاہ دو قدم پر ہی جو میں کھڑا تھا مجھ پر پڑی اور جیسے وہ سب کچھ سمجھ گیا وہ غصے سے اپنے ابھرے ہوئے سینے کو مزید پھلاتا ہوا میری جانب بڑھا یہ دیکھتے ہی بوبی اور ذیشان بھی میرے عقب سے نکل کر سامنے آ گئے لیکن میں یہ دیکھ کر ششدر کھڑا رہ گیا جب عبیرہ نے اسے مجھ تک پہنچنے سے پہلے ہی روک لیا۔

"داؤد غلطی ان کی نہیں میری تھی جو میں بیچ راستے میں کھڑی تھی۔" عبیرہ کی بات سنتے ہی اس کا بڑھا ہوا قدم وہیں رک گیا لیکن وہ اپنے چہرے پر چھائے نفرت اور غصے کے تاثرات کو فوری دبا نہ سکا۔

"چلو چھوڑو داؤد۔" ایسا کہتے ہوئے عبیرہ اس نوجوان کا ایک بازو تھامے اسے ہم سے دور لے گئی۔ نہیں تو بوبی اور ذیشان اسے چھوڑنے والے کہاں تھے وہ تو میرے ہاتھ کا اشارہ پاتے ہی رک گئے تھے ورنہ اب تک داؤد بار کے شیشے کی طرح جگمگاتے فرش پر ڈھیر پڑا ملتا۔ میں نے اب اپنی نگاہ کو چارسُو گھمایا جو چند ایک لوگ اپنی مصروفیت چھوڑ کر ہماری جانب متوجہ ہوئے تھے وہ پھر سے پینے پلانے اور لٹانے میں لگ چکے تھے اور اب میں بھی بوبی اور ذیشان کے ساتھ اپنے قدم بار کے کاؤنٹر کی جانب بڑھا چکا تھا۔ اونچی سٹول نما کرسیوں پر ذرا اچھل کر بیٹھتے ہی بوبی نے بیئر کا آرڈر دے دیا اور پھر پہلا ہی جام میری جانب بڑھایا جو میں نے اس کے ہاتھ سے لے کر کاؤنٹر پر ٹکائی اپنی کہنیوں کے درمیان رکھ لیا اور اب میں اس پر جھکا نہ جانے کن اداسیوں میں گم تھا جب اچانک میں نے اپنا سر دائیں جانب گھما کر دیکھا اور پھر چند لمحوں تک میری نگاہ وہیں ٹھہر گئی۔ وہی ریشم و اطلس کی ساٹن پہنے عبیرہ داؤد کے ساتھ بیٹھے نہ جانے کب سے ٹکٹکی باندھے میری جانب ہی دیکھے جا رہی تھی اور وہ اس بات سے بے خبر تھی کہ میں بھی اب اسے ایسا کرتے دیکھ چکا تھا۔ میں نے عبیرہ کو ذہن سے جھٹکتے ہوئے اپنی کہنیوں کے بیچ رکھے جام کو اٹھایا اور آنکھیں زور سے بند کرتے ہوئے سارا جام ایک ہی سانس میں پی لیا اور جب دوبارہ سے آنکھ کھلی تو میرے گرد و نواح کا منظر ہی بدل چکا تھا لیکن درحقیقت منظر وہی تھا میں ہی اپنی سدھ بدھ کھو کر عالمِ مدہوشی میں جا اترا تھا۔ کچھ عجیب بے سوادہ سا چہرہ بناتے ہوئے میں آنکھوں کو تیزی سے جھپکاتا اپنا دماغ ٹھکانے پر لانے کی سعی کر رہا تھا جب بوبی نے میرا خالی جام پھر سے بھر دیا اور میں نے بھی جو کہ پہلے ہی جام پر ڈگمگا گیا تھا کمال جرأت سے دوسرا بھی اٹھایا اور اپنے خشک ہوتے حلق میں اتار لیا۔ ایسا کرتے ہی ایک عجب سی لہر میرے وجود میں اٹھی اور میں جھنجھنا سا گیا اور شبد میرے لبوں پر خود ہی مچلنے لگے دل کی حالت زبان سے خود بہ خود عیاں ہونے لگی۔

"کچھ ختم نہیں ہوا۔۔۔ راحت، میں نہیں ہونے دوں گا ایسا۔" میں نے ایک دم سے اپنا بھاری ہوتا سر اٹھایا۔ بوبی اور ذیشان نے اپنا اپنا جام میرے ہاتھ میں دبے جام سے یوں ٹکرایا کہ پھر چھن چھنا کی جو آواز ابھری تو ساتھ ہی دونوں نے اپنا اپنا جام لبوں سے لگا لیا لیکن اب کی بار میں ایسا نہ کر سکا مجھے جام میں راحت دکھائی دے رہی تھی بے بس لاچار مجبور سی اور پکار رہی تھی۔

"میں جو کر سکتی تھی میں نے کر لیا اب کچھ نہیں ہو سکتا طٰہٰ سب کچھ ختم ہو گیا۔" راحت کی بات سن کر میں چلانے لگا اور چیختے ہوئے اسے یہ احساس دلا رہا تھا کہ میں کچھ نہیں ہونے دوں گا۔ نشے نے بری طرح سے میری سدھ بدھ چھین لی تھی اور اسی حالت میں بوبی

اور ذیشان مجھے گاڑی تک لے گئے میں جو ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تو دیر تک گاڑی کو چابی ہی نہ لگا سکا ایسا دیکھتے ہوئے ذیشان نے چابی میرے ہاتھ سے لی اور میں خود ہی ڈرائیونگ سیٹ سے ہٹ کر ساتھ والی سیٹ پر جا بیٹھا اب ذیشان گاڑی نکال کر واپس الیکشن ہال کی جانب لے جا رہا تھا جب راستے میں ایک جگہ پہنچ کر میں نے شور مچاتے ہوئے ذیشان کو گاڑی روکنے کو کہا اور اس نے بھی میرے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے فوراً ہی گاڑی روک دی۔ گاڑی کے رکتے ہی میں آناً فاناً گاڑی سے نکلا اور اسٹریٹ لائٹ کی مدہم روشنی میں ڈگمگاتے قدموں کے ساتھ شاہراہ کے قریب ہی بنگلوں کی جو لمبی قطار شروع ہو چکی تھی اس میں سے چوہدری عبدالغنی کے بنگلے کی طرف بڑھنے لگا۔ میرے عقب میں بوبی اور ذیشان سمجھ ہی نہیں پائے کہ میں کیا کرنے جا رہا ہوں۔ وہ تا حال گاڑی میں ہی موجود تھے اور میں اب اس بنگلے کے بیرونی آہنی گیٹ تک پہنچ چکا تھا گیٹ کی آہنی سلاخوں کو اپنے دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے تھامے اب میں با آواز بلند چلا رہا تھا۔

"دروازہ کھول راحت میں تمہیں لے جانے آیا ہوں۔" رات کی تاریکی اور سناٹے میں آہنی دروازے سے پیدا ہونے والا شور اور میری بلند آوازیں دور دور تک سنی جا سکتی تھیں۔ چند ہی لمحوں میں بنگلے کی سبھی بتیاں آن ہو گئیں لیکن چوکیدار نے دروازہ نہیں کھولا بنگلے کی بتیاں جل اٹھتے ہی میرے عقب سے بوبی اور ذیشان بھی دوڑتے ہوئے مجھ تک پہنچ چکے تھے۔ وہ مجھے زبردستی واپس گاڑی میں لے جانا چاہتے تھے لیکن میں انہیں بھی یہی کہے جا رہا تھا کہ میں راحت کو لے کر ہی جاؤں گا اس دوران ہوائی فائرنگ کی آواز سنائی دی بوبی نے مجھے کھینچ کر نیچے بٹھا لیا چند لمحے تو فائرنگ کی آواز سنائی دیتی رہی اور جب گنیں خاموش ہوئیں تو بوبی اور ذیشان بڑی مشکل سے مجھے گاڑی تک لے کر پہنچے اور گاڑی میں بیٹھتے ہی بوبی نے گاڑی تیزی سے الیکشن کیمپ کی جانب بڑھا دی۔ راستہ بھر میں انہیں ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں پھر سے گاڑی روکنے کو کہتا رہا لیکن بوبی نے گاڑی الیکشن کیمپ پہنچا کر ہی دم لیا۔ گاڑی رکتے ہی دونوں نے مجھے کاندھے کا سہارا دیا اور پھر اندر لے جا کر بستر پر لٹا دیا۔ کمرے کے بستر پر لگتے ہی پھر میں دھیرے دھیرے نیند کی وادی میں جا اترا۔

اگلے روز جب میری آنکھ کھلی تو سب سے پہلے مجھے ماں کا چہرہ دکھائی دیا وہ مجھ پر جھکی میرے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کر رہی تھیں۔ وہ بے حد مضطرب دکھائی دے رہی تھیں اور میں جانتا تھا کہ اس کی وجہ میں ہی تھا۔ وہ میرے آنکھ کھلتے ہی بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"میرا بیٹا رات بھر نشہ کر کے الیکشن کیمپ میں پڑا سوتا رہے گا تو کیا ماں کو علم نہیں ہو گا؟" ماں کی بات سن کر میں نے ان کا ہاتھ تھامنے کی کوشش کی لیکن انہوں نے ہاتھ پیچھے کر لیا۔ رات کے نشے کا اثر ابھی تک میری بوجھل آنکھوں تلے باقی تھا جب آنکھیں ملتے ہوئے مجھے وہ لفظ بھی نہ مل رہے تھے جن لفظوں سے میں ماں کے غم کی تلافی کر پاتا۔ یکا یک ماں کے عقب سے ابا نمودار ہوئے

کمرے کا دروازہ کھلتے ہی باہر سے آنے والے شور سے پتا چلتا تھا کہ باہر کوئی بڑی تقریب ہونے جا رہی تھی۔ ابا نے کمرے میں داخل ہو کر ایک نظر ماں کی جانب دیکھا اور پھر میرے ذرا پاس آکر کہنے لگے۔

"طٰہٰ بیٹا تمہارے پاس پندرہ بیس منٹ ہیں جلدی سے اٹھ جاؤ آج تقریب میں تمہیں بھی تقریر کرنی ہے بس تمہیں ان کو یقین دلانا ہے کہ ان کی بات سنی جائے گی اہلِ علاقہ کے سبھی مسائل حل ہوں گے غریب طبقہ کو مراعات دی جائیں گی باقی تم سمجھتے ہو بیٹا اسکول سے لے کر اب یونیورسٹی تک ہر تقریری مقابلہ تو تم جیتتے ہی آئے ہو بس آج ذرا بلے بلے ہو جانی چاہیے۔" ایسا کہتے ہوئے وہ ذرا گردن گھما کر ماں سے متوجہ ہوئے۔

بیگم آپ یہاں کیا کر رہی ہیں آپ کو تو باہر ہونا چاہیے باہر ممبر خواتین کشور، سلطانہ سبھی پہنچ چکی ہیں وہ آپ سے ملنے کے لیے منتظر ہیں۔" ایسا کہتے ہوئے وہ ایک بار پھر سے مجھے اشارتاً اٹھنے کا کہہ کر ماں کو ساتھ لے کر باہر نکل گئے ان کے جاتے ہی لا محالہ مجھے بھی اٹھنا ہی پڑا اور یہ میں جانتا تھا کہ اگر میں فوری طور پر نہ اٹھا تو کچھ ہی دیر میں اسپیکر پر میرا ہی نام پکارا جا رہا ہو گا اور تبھی ابا مجھے وہاں نہ پا کر کمرے میں آئیں گے اور پھر مجھے اسی حالت میں ان کے ساتھ چلنا ہو گا۔

پھر میں جو سوچ ہی رہا تھا تو تھوڑی دیر میں ابا دوبارہ کمرے میں چلے آئے یہ تو اچھا ہوا کہ تب تک میں تازہ دم ہو چکا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرائے اور میرے ذرا پاس ہو کر وہ میرے کوٹ کا کالر درست کرتے ہوئے مجھے تقریر میں کہے جانے والے اہم نکات سمجھانے لگے ساتھ ہی وہ اپنی کلائی پر بندھی گھڑی پر وقت بھی دیکھتے جا رہے تھے۔ یونہی باتیں کرتے ہوئے ان کا اشارہ پا کر اب میرے قدم باہر کی جانب اٹھ چکے تھے۔ جب کمرے سے باہر قدم رکھتے ہی سورج کی تیز کرنوں کا سامنا کرتے ہوئے جیسے میری آنکھیں چندھیا گئی تھیں۔ میں نے کوٹ کی جیب سے لٹک رہے سن گلاسز کو چہرے پر سجایا اور اب الیکشن کیمپ سے نکلتے ہوئے ہم اس گراؤنڈ کی جانب بڑھ رہے تھے جہاں ابا نے جلسہ منعقد کر رکھا تھا۔ گراؤنڈ کے عقبی جانب سے ہم اسٹیج پر پہنچے تو سامنے سیلاب کی مانند انسانوں کا انبوہ دکھائی دے رہا تھا۔ ابا کے ساتھ میرے اسٹیج پر قدم رکھتے ہی کسی نے میرا نام پکارا اور پھر فضا تالیوں کے شور سے گونج اٹھی اسٹیج پر بیٹھے سبھی مہمانان خصوصی کو میں نے اشارتاً سلام کیا اور پھر میں مائیک کی جانب بڑھ گیا اور اب میرے اندر سے ایک سیاسی لیڈر کا بیٹا بول رہا تھا۔ وہی اہلِ علاقہ کی خیر خواہی کا جذبہ دن رات ان کی خدمت میں رہنے کا وعدہ چھوٹے بڑے سبھی مسائل حل کرنے کی یقین دہانی، غربت دور کرنے کے خواب، غرباء کے لیے مختلف وظائف اور پھر چار سُو گونجتا تالیوں کا شور اور اسی شور کے تھمنے تک میں ابا سے اجازت لے کر ماں کے ہمراہ گھر چلا آیا تھا۔ گھر پہنچ کر ماں مجھ پر واری جا رہی تھی وہ میرے اوپر سے صدقہ بلائیں اتارتی، پیسہ وارتی ملازموں میں بانٹتی رہی۔ جب ایک دم سے مجھے راحت کا خیال ستانے لگا اور میں وہاں سے سیدھا اپنے کمرے میں چلا آیا۔ کمرے میں پہنچ کر میں نے فوراً اس کا نمبر ڈائل کیا لیکن اس کا نمبر بند ملا۔ پھر دوسری، تیسری، چوتھی بار بھی میرے کوشش کرنے پر اس کا نمبر مسلسل بند جا رہا تھا اور میرا دل تھا کہ جیسے ڈوبا جا رہا تھا۔ رات نشے میں، میں اس کے گھر سے باہر کھڑا نہ

جانے کیا کچھ بولتا رہا تھا اور یہ تو اچھا ہوا جو بوبی اور ذیشان میرے ساتھ تھے جو وہ مجھے فوراً وہاں سے اٹھا کر الیکشن ہال چلے آئے تھے نہیں تو شاید میں اسپتال میں زندگی اور موت کی آخری سانسیں گن رہا ہوتا یا سلاخوں کے پیچھے اپنی رہائی کا انتظار کر رہا ہوتا۔ پھر رہ رہ کر میرے ذہن میں یہی خیال آتا رہا کہ کہیں میرے ایسا کرنے کی وجہ سے ہی تو اب اس کا فون بند نہیں جا رہا میرے ذہن میں اٹھتے اس سوال کا جواب مجھے وہی دے سکتی تھی۔

اسی شام وہ خوش قسمت لمحہ مجھے مل ہی گیا جب میرے کال کرنے پر اس کا نمبر کھلا تھا اور پھر اس نے فوراً ہی کال ریسیو کر لی لیکن دوسری جانب مکمل خاموشی تھی، پھر یہ خاموشی مجھ سے زیادہ دیر تک برداشت نہ ہو سکی اور یہ جانتے ہوئے کہ وہ دوسری جانب فون کان سے لگائے میری آواز سن رہی ہے میں با آواز بلند اس سے مخاطب تھا۔

"راحت تم بس ایک بار ہاں بولو میں تمہیں سات پہروں سے بھی نکال لاؤں گا۔ بولو راحت تم خاموش کیوں ہو بولتی کیوں نہیں تم تو کسی سے ڈرتی نہ تھیں، یہ سماج، دنیا، رسم ورواج پہرے تم انہیں کہاں مانتی تھیں پھر تمہاری خاموشی کی وجہ کیا ہے کیوں آج تمہارے لب سل گئے ہیں۔ کیوں آج تم اس قدر مجبور لگ رہی ہو کس بات کا خوف ہے تمہیں میں آج بھی تمہارے ساتھ ہوں راحت میں کل بھی تمہارے ساتھ تھا اور ہمیشہ رہوں گا۔" میں ہی بولتا رہا جب وہ ابھی تک خاموش تھی اور پھر میں نے بھی خاموشی اختیار کر لی ایک لمحے بعد ہی اس کی ہچکیوں میں ڈوبی آواز ابھری۔

"طٰہٰ آج منان دبئی سے لوٹ آیا ہے۔ آج شب میری منگنی ہونے جا رہی ہے۔" اس کی فقط اتنی سی بات سن کر میں بے تاب ہو کر بولا۔

"راحت تم گھر سے چلی آؤ ہم دونوں یہاں سے کہیں بہت دور چلے جائیں گے جہاں ہمیں کوئی تلاش نہ کر سکے۔ جہاں کوئی ہم تک نہ پہنچ سکے۔" میں ابھی بول ہی رہا تھا جب وہ میری آخری بات مکمل ہوتے ہی بولی۔

"تم ہی یہ کہتے ہو طٰہٰ کہ میں کسی سے نہیں ڈرتی، یہ سماج، دنیا رسم ورواج پہرے تم صحیح کہتے ہو طٰہٰ میں اب بھی نہیں ڈرتی میں اس وقت بھی نہیں ڈری تھی جب تمہارے گھر والے سارے گھر میں مجھے تلاش کرتے پھر رہے تھے کیوں، جانتے ہو اس لیے طٰہٰ کہ میرے ڈیڈی مجھ پر اعتماد کرتے تھے میں روز شام انہیں ضرور بتایا کرتی ہوں کہ میں آج کس سے ملی کیوں ملی اور مجھے اگر کسی سے ملنے جانا ہے تو کیوں جانا ہے۔ تب انہیں میری ہر خوشی عزیز تھی تو آج جب خاندان والے ان کی بات نہیں سن رہے تو کیا میں اپنے ڈیڈی پر اپنی ایک خوشی قربان نہیں کر سکتی طٰہٰ۔"

"تم پاگل ہو چکی ہو راحت۔ تمہیں علم ہے جسے تم ایک خوشی کہہ رہی ہو وہی تمہارے جیون بھر کی خوشی ہے کیا میں ہی تمہاری وہ پہلی اور آخری چاہت نہیں؟" نہ جانے کیوں اس کی باتیں سن کر میں یوں دیوانہ سا ہو کر اب بولے جا رہا تھا۔

وہ میری آخری بات سن کر خاموش تھی اور میں بھی اس کے سامنے ایک سوال رکھ کر خاموش ہو چکا تھا۔ جبکہ دھڑکنیں بے قابو ہو کر کسی سنسان ویران مندر کی گھنٹی کی طرح بج رہی تھیں گویا میرے اندر کا مجازی خدا کسی کو اپنے قدموں تلے جھکانا چاہتا تھا پرستش مانگ رہا تھا سجدے کی خواہش تو نہ تھی لیکن بلیدان چاہتا تھا، عزت کا، آبرو کا اور پھر اس نے بلیدان دے ہی دیا اپنی محبت کا جیون بھر کی خوشیوں کا اس نے مجھ سے کہا۔

"طٰہٰ میں تمہیں کبھی نہیں بھول سکتی اور میں یہ بھی نہ کہوں گی کہ تم بھی مجھے بھول جانا تم اپنی کلائی پر بندھی میری فرینڈ شپ بینڈ کبھی مت اتارنا یہ میری کلائی پر بھی بندھی ہے آدھی تمہارے پاس آدھی میرے پاس لیکن ہمیں جینا ہے طٰہٰ تمہیں میرے لیے اور مجھے اپنے ڈیڈی کی خوشیوں کے لیے تم ایسا کرو گے نا طٰہٰ۔ تم سے فقط پہلی بار تو کچھ مانگ رہی ہوں مجھے یہ اعتماد دو گے نا طٰہٰ۔ بولو طٰہٰ خاموش کیوں ہو؟" نہ جانے کیوں میں اسے جواب نہ دے پایا اور میں نے فون بند کر دیا۔

اسی رات میں تنہا بار جا پہنچا اور جب میں وہاں بیٹھا کئی جام اپنے حلق سے اتار چکا تھا تو ایک اور جام اٹھاتے ہی اسے کسی نے میرے ہاتھ سے چھین لیا میں نے چونکتے ہوئے اپنے سر کو اٹھا کر دیکھا تو سامنے عبیرہ کھڑی تھی میں نے اسے دیکھتے ہی یوں دیوانوں کے سے انداز میں اس کے گردونواح میں دیکھا۔

"آج وہ نہیں آیا آپ کو وہ بالکل اچھا نہیں لگا تھا نا مجھے بھی وہ بالکل اچھا نہیں لگتا۔" وہ میرے چار سُو دیکھنے پر دھیرے سے بولی اور میرے قریب رکھی میز پر بیٹھتے ہی اس نے اپنے دراز کھلے بالوں کو جھٹک کر اپنے چہرے سے ہٹایا اور اب اپنی بڑی بڑی نگاہوں میں نہ جانے وہ مجھ سے کیا کیا سوال پوچھتی رہی میں بھی کب خاموش رہا بولتا چلا گیا وہ راحت ہے ناں؟ اوہوں اوہوں اوہوں ہاہاہاہا وہ بڑی بے وفا نکلی۔ پتا ہے۔۔۔ تم کو۔۔۔ مجھے کہتی ہے تمہیں میرے لیے جینا ہے۔۔۔ اور آگے پتا ہے کیا کہتی۔۔۔ ہیں مجھے اپنے ڈیڈی کے لیے جینا ہے۔۔۔ بے وفا نکلی۔۔۔ تم کو بھی اپنے ڈیڈی کے لیے جینا ہے یا وہ جو تمہارا بوائے فرینڈ ہے کیا نام ہے اس کا۔۔۔ ہاں۔۔۔ ہاں داؤد تمہیں داؤد کے لیے جینا ہے۔۔۔" میں نشے میں نہ جانے اسے کیا کیا بولتا رہا اور وہ میری اتالیق بنی میرا پاٹ سنتی رہی۔ نہ اس نے مجھے ٹوکا نہ بید اٹھا کر مجھے مارنے کو دوڑی بس کسی ذہین و فطین شاگرد کی طرح وہ مجھے سنتی رہی اور جب میں اپنی سدھ بدھ کھونے کو تھا وہ مجھے اٹھائے سہارا دیئے اپنی گاڑی پر اپنے گھر لے گئی۔

اگلے روز جو میری آنکھ کھلی تو اپنے گردونواح کا جائزہ لینے پر مجھے احساس ہوا کہ میں اپنے گھر اپنے بستر پر نہیں تھا۔ پھر جو ذرا ذہن پر زور ڈالا تو گزری رات کسی بھولے بسرے خواب کی طرح میرے ذہن کے سلولائیڈ پر کالی پرچھائیوں کی طرح دکھائی دینے لگی اور مجھے یاد آیا کہ رات میں اپنے گھر جانے کے بجائے عبیرہ کے ساتھ اس کے گھر چلا آیا تھا۔ ایسا یاد آتے ہی میں نے فوراً وقت دیکھا ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ اب میں یہاں مزید رکنا نہیں چاہتا تھا میں نے اردگرد نظر دوڑائی سائیڈ ٹیبل پر میرا پرس اور موبائل رکھے تھے لیکن گاڑی کی چابی نہ تھی میں نے دونوں چیزیں اٹھائیں اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ کمرے سے نکل کر راہداری میں سے

گزر کر اب میں ہال میں داخل ہو رہا تھا اور اب تک مجھے اس کی حیثیت کا اندازہ ہو چکا تھا۔ میں چند لمحے ہال میں کھڑا کسی کی آمد کا انتظار کرتا رہا جب میری نظر ہال میں ایک دیوار پر نصب اسلامک کیلی گرافی کے فن پارے پر پڑی۔ میں بے ساختہ اس کی جانب بڑھ گیا ایک بہت بڑے کینوس پر سورۃ الرحمان کی چند آیات کو بے پناہ خوب صورت سے رنگوں کے حسین امتزاج کے ساتھ یوں لکھا گیا تھا کہ پڑھنے والے کی زبان سے بے ساختہ یہ کلمات ادا ہو جاتے تھے "اور تم اللہ کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے۔" لیکن پھر میں ان آیات کا سامنا دیر تک نہ کر سکا اور میں وہاں سے پلٹا۔ جب ہال کے بیرونی دروازے سے ایک شخص اندر داخل ہوا اور مجھ پر نگاہ پڑتے ہی وہ میری جانب چلا آیا اور قریب پہنچتے ہی مسکرا کر سلام کرتے ہوئے بولا۔

"صاحب آپ اٹھ گئے میں آپ کی گاڑی لینے چلا گیا تھا یہ چابی لے لیں۔" اس سے چابی لیتے ہوئے میں نے عبیرہ سے متعلق دریافت کیا تو وہ بتانے لگا کہ بی بی صاحب باہر دھوپ میں بیٹھی ہے یہ سنتے ہی میں ہال کے بیرونی دروازے کی جانب بڑھا ابھی میں ہال کے دروازے سے باہر پہنچا ہی تھا کہ پھر وہی ملازم میرے عقب سے مجھ کو پکارتا میرے قریب آ پہنچا۔

"صاحب بی بی صاحبہ نے بولا تھا جب آپ اٹھ جائیں آپ کو ناشتہ کرادوں۔" ملازم کی بات سن کر میں نے اسے ناشتہ لانے سے منع کر دیا۔ اگر چہ بھوک تو تھی لیکن اب میں یہاں سے جلد سے جلد نکلنا چاہتا تھا ملازم میری بات سن کر الٹے پیروں لوٹ گیا اور میں ہال کی بیرونی سیڑھیاں اترتا ذرا آگے بڑھا تو سردیوں کی ٹھنڈی میٹھی دھوپ میں لان میں لگی کرسیوں پر ہی مجھ کو عبیرہ بیٹھی دکھائی دی اور اب میں دھیرے دھیرے لان کی نرم ملائم گھاس پر چلتا اس تک جا پہنچا۔ وہ اپنے پیروں کو میز پر ٹکائے کرسی کی پشت گاہ سے اپنا سر لگائے آنکھیں موندھے لیٹی ہوئی تھی۔ میں نے اسے جگانا مناسب نہ سمجھا اور اس کے سامنے ہی رکھی ایک دوسری کرسی پر بیٹھتے ہوئے میں جیسے ہی میز پر رکھے اخبار کو اٹھانے کے لیے جھکا وہ اخبار کے کاغذ کی سرسراہٹ پا کر جاگ گئی اور مجھ پر نظر پڑتے ہی اس نے جھٹ سے میز پر رکھے پیر نیچے کر لیے اور جھٹ سے بولی۔

"آپ اٹھ گئے طٰہٰ۔" اس کی بات سن کر میں مسکرا کر بولا۔

"شکریہ عبیرہ اگر رات میں ویسی ہی حالت میں اپنے گھر جانے کی کوشش کرتا تو شاید نہ پہنچ پاتا۔"

"شکریہ کی ضرورت نہیں طٰہٰ۔ پر ہاں اگر ایک کام بولوں تو کریں گے۔" میری بات کا جواب دیتے ہوئے اس نے جو ایک کام کرنے کی بات کہی تو میں نے جھٹ سے اثبات میں سر ہلا دیا یوں میرا جواب پا کر وہ مجھ کو عجب نگاہوں سے دیکھتی ہوئی بولی۔

"اگر ہو سکے تو کبھی مجھے راحت سے ملوا دیں گے۔" اس کی بات سنتے ہی میں ایک جھٹکے سے اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا۔

آپ راحت کو کیسے جانتی ہیں۔" میں نے حیرت سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا اور وہ بھی مجھے یوں ششدر حیران کھڑا دیکھ کر اپنی نشست سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"رات نشے میں آپ راحت کو ہی تو پکارتے رہے تھے میں ایک بار اس لڑکی سے مل کر اس سے پوچھنا چاہتی ہوں کہ وہ ایسی کیا مجبوری تھی کہ اس نے آپ جیسے شخص کو چھوڑ دیا۔"عبیرہ کی بات سن کر میں سوچنے لگا کہ اب شاید میں خود بھی اس کی جھلک نہ دیکھ پاؤں تو پھر بھلا تمہیں کیسے ملوا سکوں گا لیکن ذہن میں آئی یہ بات میں نے فقط اپنے تک ہی رکھی اور اسے کہا کہ اگر ممکن ہو سکا تو میں اس کی یہ خواہش ضرور پوری کروں گا۔ ایسا کہتے ہوئے میں نے اس سے اجازت چاہی وہ مجھے ناشتے کے لیے روکتی رہی لیکن میں نے معذرت کرلی اب اپنی گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے میں نے ایک نظر دوڑا کر اس کے وسیع رقبے پر پھیلے خوبصورت گھر کو دیکھا اور پھر میں تعریف کیے بغیر نہ رہ سکا اور گاڑی میں بیٹھتے ہی اسے اسٹارٹ کر کے آخری بار میں نے ہاتھ ہلا کر اسے الوداع کہا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔

عبیرہ کے گھر سے نکل کر میں سیدھا اپنے گھر نہیں جانا چاہتا تھا میں جلد سے جلد ابا سے ملنا چاہتا تھا اور میں جانتا تھا کہ اس وقت ابا کہاں ملیں گے۔ الیکشن قریب ہونے کی وجہ سے ابا اب اپنا زیادہ وقت الیکشن ہال میں ہی گزارتے تھے۔ یہی سوچ کر میں نے گاڑی گھر کی بجائے الیکشن ہال کی جانب بڑھا دی۔ الیکشن کیمپ وہاں سے زیادہ دور نہ تھا آدھے پونے گھنٹے میں ہی میں وہاں جا پہنچا۔ گاڑی سے اترتے ہی میں سیدھا ابا کے آفس کی جانب بڑھا جب آفس سے باہر پہنچ کر مجھے الیکشن ہال میں کام کرنے والے ایک ملازم نے روکا۔

صاحب بڑے صاحب نے کسی کو اندر آنے سے منع کر رکھا ہے۔"اس کی بات پر مجھے سخت غصہ آیا لیکن میں جلدی میں تھا سنی" اَن سنی کر کے میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا اور جونہی میں اندر پہنچا میرے پیر وہیں جم گئے۔ سامنے ہمارے ملک کی ایک مایہ ناز اداکارہ بیٹھی تھی اس کے ہاتھ میں سگار تھا جسے دیکھ کر یوں لگ رہا تھا کہ میرے کمرے میں داخل ہونے سے ایک لمحہ پہلے ہی اسے ابا نے اپنے ہاتھ سے اس کے ہاتھ میں تھمایا تھا وہ سگار خاص میرے ابا ہی پیتے تھے۔ اس نے ریشم و اطلس کی بنی ساڑھی زیب تن کر رکھی تھی جس پر لگے ستاروں کی جھلمل سے کمرہ جگمگایا ہوا تھا اور اسی جھلمل روشنی میں مجھے کوئی بات یاد آ گئی تھی۔ جب میں نے یونیورسٹی میں داخلہ لیا تھا تو اکثر میرے کلاس فیلو یہ جان کر کہ میں مشہور سیاست دان خورشید عالم کا بیٹا ہوں مجھ سے میرے ابا اور اداکارہ عذرا جہاں سے متعلق پوچھا کرتے تھے اور میں ان کی یہ باتیں سن کر بھڑک جایا کرتا تھا اور آج ان باتوں کی تصدیق بھی ہو گئی تھی اور اب میری نظر عذرا جہاں کے سراپا سے اس وقت ہٹی جب ابا نے مجھے پکارا۔

"برخوردار کیسے آنا ہوا۔ آؤ میں تمہیں ان سے ملواؤں۔"ابا کی بات مکمل ہوتے ہی میں بے زاری سے بولا۔

"ابا مجھے آپ سے علیحدگی میں بات کرنا ہے۔"ایسا کہتے ہوئے میں کمرے سے نکلنے کے لیے پلٹا جب میرے عقب سے مجھے ابا کی آواز سنائی دی۔ وہ میرا روکھا رویہ دیکھ کر عذرا جہاں سے معذرت کر رہے تھے ایسا سن کر میں نے تیزی سے دروازہ کھولا اور جب میں نے اپنے قدم کمرے سے باہر رکھے تو دروازہ زور سے بند ہو گیا۔ میں کچھ دیر تک وہیں کھڑا کچھ سوچتا رہا اور پھر آفس سے ملحقہ کمرے میں جا پہنچا آفس سے ملحقہ کمرے میں ابا کا انتظار کرتے ہوئے چند لمحوں تک ابا کے آفس کا کمرہ ہی میرے ذہن میں گردش

کرتا رہا۔ عذرا جہاں کی ریشمی ساڑھی کی جھلمل اس کے ہاتھ میں موجود سگار اور پھر ابا کا مجھے چونک کر دیکھتے ہوئے یہ کہنا کہ برخوردار کیسے آنا ہوا آؤ میں تمہیں ان سے ملواؤں اور آخر میں کمرے کا زور سے بند ہوتا دروازہ لیکن اب جو زور سے دروازہ کھلنے کی آواز آئی تو یہ ابا تھے وہ کمرے میں داخل ہوتے ہی مجھ پر برس پڑے۔

"تمہیں مہمانوں کے ساتھ پیش آنے کی ذرا تمیز نہیں اور کیا ہوا ہے تمہیں، ایسی کیا بات ہو گئی جو تم وہاں نہیں کرنا چاہتے تھے۔" ان کی سرزنش بھری گفتگو سن کر میں اپنا غصہ دبا کر خاموش رہا تو وہ پھر غصے سے چلائے۔

"طہٰ میں تم سے کچھ پوچھ رہا ہوں۔" میرا جواب نہ پا کر وہ ذرا نرم لہجے میں بولے۔ "دیکھو بیٹا میں بہت مصروف ہوں جو تمہیں کہنا ہے کہہ چکو اب۔" ابا کی بات سن کر اب کی بار میں خاموش نہ رہ سکا اور بولا۔

ابا۔۔۔ رات راحت کی منگنی ہو گئی ہے۔

"کیا۔۔۔ چوہدری عبدالغنی نے اپنی بیٹی کی منگنی کر دی کہاں کی، میرا مطلب ہے کون سا خاندان ہے؟" ابا نے حیران، ششدر ہو کر مجھ سے دریافت کیا تو میں انہیں بتانے لگا۔

"ابا وہ اس کا رشتے میں ماموں زاد ہے، اور رات ہی دبئی سے لوٹا ہے۔" ابا میری بات سن کر جھٹ سے بولے۔

"تمہیں فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے طہٰ بیٹا تم اور راحت تو ایک دوسرے سے بے پناہ محبت کرتے ہو نا پھر اگر چوہدری عبدالغنی نے زبردستی بے چاری راحت بیٹی کی منگنی کر ہی دی ہے تو کیا ہوا تم اسے تسلی دو اگر اس کا باپ ضد پر اڑ ہی گیا ہے تو اسے!۔۔۔"

"ابا وہ میرے ساتھ نہیں آ رہی اسے اپنے خاندان کی عزت اپنی محبت سے زیادہ عزیز ہے۔ اس نے میرے ساتھ چلنے سے انکار کر دیا ہے۔" ابا کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی میں نے جھٹ سے ساری حقیقت بیان کر دی اور ابا میری بات سن کر ٹھٹک گئے ان کے متغیر ہوتے رنگ سے لگتا تھا جیسے وہ جیتی بازی ہار چکے تھے۔ چند لمحے خاموشی کے بعد وہ صوفے پر جا بیٹھے اور بدستور سوچتے ہوئے انہوں نے مجھے بھی اپنے قریب صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور میں اشارہ پاتے ہی ان کے نزدیک بالکل پاس ہو کر جا بیٹھا وہ اپنے سر کو میرے ذرا اور نزدیک لاتے ہوئے رازدارانہ انداز میں بولنے لگے۔

"جن لوگوں نے تم سے تمہاری محبت چھین لی طہٰ ان لوگوں سے ان کی عزت چھین لو اتنا بدنام کر دو انہیں کہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں اور جو ان کی عزت کو اپنی عزت بنانے چلے ہیں وہ لوگ بھی ان کے منہ پر تھوک کر چلے جائیں پھر یہ تمہارے اختیار میں ہو گا طہٰ کہ تم چاہو تو راحت کو اپنا لو یا چاہو تو تم بھی۔۔۔"

"بس ابا میں سب سمجھ گیا۔" ابا کی باتیں سن کر میرے سینے میں سلگ رہی آگ جیسے اچانک بھڑک اٹھی تھی یکایک میں اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا ابا کے دلائے اشتعال سے میرے وجود سے چنگاریاں اٹھ رہی تھیں۔

"ابا کل کا دن جب طلوع ہو گا تو آپ چوہدری عبد الغنی کا زوال دیکھیں گے۔" میرے ایسے جذبات سن کر میرے عقب سے ابا نے میرے کاندھے کو تھپتھپایا اور میں سینے میں بدلے کی آگ لیے اپنے مقصد کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے چل پڑا۔ الیکشن سیکرٹریٹ سے میں نے بوبی اور ذیشان کو ساتھ لیا اور ایک خاص پرنٹنگ پریس جہاں سے ابا کے الیکشن کی مہم کے دوران لگائے جانے والے بینر اور فلیکس بھی تیار ہوتے تھے وہاں جا پہنچا۔ وہیں میں نے اپنی اور راحت کی ایک تصویر اور چند عشقیہ کلمات دے کر پریس والوں کو ہدایت کی کہ چند گھنٹوں میں ہی مجھے اس کی ہزاروں کاپیاں پوسٹر کی صورت میں چاہئیں۔ پرنٹنگ پریس والوں کو اس سے کیا غرض تھی کہ اس طرح کے پوسٹر شائع کرنے سے کسی کی بیٹی کی عزت کی دھجیاں اڑتی تھیں کسی کا گھر بسنے سے پہلے ہی تباہ ہو جانا تھا، مجھے یہ پوسٹر اپنے انتقام کے لیے درکار تھے۔ انہیں تو غرض تھی پیسے سے، انہیں کسی کے نقصان کی کیا پرواتھی انہیں تو فقط اپنے نفع کی فکر تھی۔

جب کمپیوٹر میں کمپوزنگ ہو رہی تھی، پازیٹو بن رہے تھے، فریم سیٹ ہو رہے تھے اور پھر مشینیں چلنا شروع ہو گئیں، میں ذیشان اور بوبی کو سبھی کچھ سمجھا چکا تھا۔

عبیرہ کے گھر سے نکل کر میں سیدھا الیکشن سیکرٹریٹ پہنچا تھا وہیں سے پھر میں ابا سے مل کر بوبی اور ذیشان کو ساتھ لے کر پرنٹنگ پریس چلا آیا تھا اور جب پریس والوں نے ہمیں ہزاروں کی تعداد میں پوسٹر پرنٹ دیئے تو ہمیں رات ہو چکی تھی لیکن اپنے پلان کے مطابق ہم نے یہ پوسٹر آدھی رات کے بعد دیواروں پر نصب کرنے تھے اور اس مقصد کے لیے میں ذیشان اور بوبی کے ساتھ خود بھی جانے والا تھا۔ ابھی کافی وقت پڑا تھا اور میں تھک بھی چکا تھا۔

بس یہی وجہ تھی کہ میں نے بوبی اور ذیشان کو الیکشن سیکرٹریٹ اتارا، پوسٹر میں نے وہاں چھوڑ کر جانا مناسب نہ سمجھا یوں بوبی اور ذیشان کو رات دیر کو تیار رہنے کا کہہ کر میں پوسٹر گاڑی میں ساتھ لیے گھر چلا آیا۔ گھر پہنچ کر گاڑی پورچ میں کھڑی کر کے جب میں تیزی سے اپنے کمرے کی جانب بڑھ رہا تھا مجھے بڑے ابا مل گئے وہ جلدی میں لگ رہے تھے وہیں کھڑے کھڑے ان سے ذراسی علیک سلیک ہوئی اور پھر وہ باہر کی طرف چلے گئے اور میں اپنے کمرے میں چلا آیا کمرے میں پہنچتے ہی تھکاوٹ سے بوجھل اپنے وجود کو میں نے بستر سے لگایا تو کچھ سکون ملا اور دھیرے دھیرے میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔ اور جب میرے فون پر سیٹ الارم بجا تو میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اگرچہ اس وقت ابھی مجھے مزید آرام چاہیے تھا میری آنکھیں نیند کے بوجھ تلے مشکل سے کھل پا رہی تھیں لیکن پھر چوہدری عبد الغنی کا خیال ذہن میں آتے ہی بدلے کی آگ پھر سے دہک اٹھی۔

"چوہدری عبد الغنی کل کا سورج جب طلوع ہو گا تو پھر وہ تمہارے زوال کا آغاز ہو گا۔" بستر سے اٹھتے ہوئے میں خود سے ہی بڑبڑایا اور پھر آدھی رات کو گھر سے نکلتے ہوئے حتی الامکان میری یہی کوشش تھی کہ گھر کے کسی بھی فرد کو میرے آدھی رات میں یوں باہر جانے کی خبر نہ ہو۔ اسی مقصد سے میں نے گاڑی اسٹارٹ کرنے کے بعد اس کی اگلی پچھلی بتیاں بھی آن نہ کی تھیں۔ یوں

دھیرے سے میں گاڑی لے کر گھر سے نکلا اور پھر گاڑی کو تیزی سے الیکشن سیکریٹ کی جانب بڑھا دیا وہاں پہنچا تو بوبی اور ذیشان پہلے سے ہی میرا انتظار کر رہے تھے انہیں ساتھ لے کر میں چلا تو ابھی کچھ فاصلہ ہی طے ہوا تھا کہ جب مجھے یوں احساس گزرا کہ جیسے کوئی ہمارا پیچھا کر رہا ہو، لیکن پھر میرے عقب میں آ رہی گاڑی جب تیزی سے میرے قریب سے گزر گئی تو میں نے اسے اپنا وہم سمجھ کر ذہن سے جھٹک دیا اور ساتھ ہی گاڑی کی ریس بڑھا کر میں نے گاڑی بائیں جانب موڑ دی۔ یہ وہی اسٹریٹ تھی جہاں راحت کا ماموں زاد منان رہائش پذیر تھا اور میں یہ سب کچھ پہلے سے معلوم کر چکا تھا اب ہمارا مقصد یہی تھا کہ ہم منان کے محلے سے پوسٹر لگانے کا آغاز کریں گے اور پھر یونہی آگے بڑھتے ہوئے سارے علاقے میں لگا دیں گے۔

پھر ایک جگہ پہنچ کر میں نے گاڑی روک دی یہاں اب اسٹریٹ بالکل سنسان پڑی تھی۔ میں نے بوبی اور ذیشان کو نیچے اترنے کا اشارہ کیا وہ دونوں میرا اشارہ پاتے ہی نیچے اترے، تب تک میں بھی گاڑی بند کرنے کے بعد نیچے اتر چکا تھا۔ میں نے ایک بار ارد گرد کے ماحول کا جائزہ لیا گھروں سے باہر لگے برقی قمقمے جل رہے تھے جن کی مدھم روشنی میں آدھے چاند کی روشنی بھی گھل مل رہی تھی۔ آسمان بالکل صاف شفاف دکھائی دے رہا تھا جگمگاتے ستاروں کی بارات سجی تھی اور مجھے ایسا ہی موسم درکار تھا۔ میرے ارد گرد کے ماحول کا جائزہ لینے کے دوران بوبی گاڑی میں سے پوسٹر نکال کر اب میرے اشارے کا منتظر کھڑا تھا اور ذیشان کے ہاتھ میں گلیو تھا جس سے پوسٹر دیوار پر چپکانے تھے۔ میرا اشارہ پاتے ہی ذیشان بوبی کے ہاتھ میں موجود پوسٹر پر گلیو لگانے لگا اور پھر ایسا کرنے کے بعد بوبی نے دو، چار قدم کے فاصلے پر ہی دیوار پر پہلے پوسٹر کو چپکا دیا وہ پہلا پوسٹر دیوار سے چپکا کر پلٹا تو دوسرا پوسٹر میرے ہاتھ میں تھا اور ذیشان اسے گلیو لگا رہا تھا ہم تینوں ہی دائرے میں کھڑے تھے جب یکایک بوبی کے عقب سے آہٹ پا کر ہم تینوں نے مڑ کر دیکھا اور پھر جیسے میرے پیروں تلے سے زمین ہی نکل گئی۔ ابھی چند لمحوں پہلے بوبی جو پوسٹر دیوار سے چپکا کر پلٹا تھا بڑے ابا وہی پوسٹر دیوار سے اکھاڑ کر ہاتھ میں تھامے ہماری جانب چلے آ رہے تھے۔ نزدیک پہنچ کر بڑے ابا نے ہاتھ میں پکڑے پوسٹر کے کئی ٹکڑے کرتے ہوئے انہیں میری جانب اچھال دیا۔ کچھ ٹکڑے سیدھے میرے چہرے سے ٹکرائے اور کچھ اڑتے ٹکڑوں کے بیچ میں انہیں شدید غصے میں بولتے ہوئے سن رہا تھا۔

"تم اس قدر اوچھی، غلیظ حرکتوں پر اتر آئے ہو طٰہ، یہ دن بھی مجھے دیکھنا تھا۔ جب میری اولاد اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے چہروں پر سیاہی ملنے جا رہی ہے۔" اتنا کہہ کر وہ میرے قریب ڈرے سہمے سے کھڑے ذیشان اور بوبی کی جانب بڑھے۔ بوبی کے ہاتھ سے پوسٹر اور ذیشان کے ہاتھ سے گلیو کی بوتل چھین کر انہوں نے دونوں ہی چیزیں یوں کھینچ کر میرے پیروں میں پٹخ دیں کہ میں ڈر کے تھوڑا پیچھے ہٹ گیا اب وہ پھر سے شدید غصے میں بول رہے تھے۔ "یہ غلیظ پوسٹر تو میں نے گھر میں کھڑی تمہاری گاڑی میں ہی دیکھ لیے تھے اور پھر انہیں پڑھتے ہی میں گاڑی سمیت آگ ہی لگا دیتا لیکن پھر میں تمہارا سارا پلان سمجھنا چاہتا تھا تمہیں رنگے ہاتھوں پکڑنا چاہتا تھا اور آج تم نے میرا سر شرم سے جھکا دیا طٰہ تم نے اپنی غیرت کا کیا اچھا سودا کیا۔"

آخری کلمات ادا کرتے ہوئے وہ میری گاڑی کی جانب بڑھے اور اگلے ہی پل گاڑی میں رکھے پوسٹر انہوں نے باہر پھینکنے شروع کر دیئے۔ ایسا دیکھ کر مجھ میں جرأت نہ ہوئی کہ میں آگے بڑھ کر بڑے ابا کو روک سکوں اور مجھے یوں بے بس دیکھ کر بوبی اور ذیشان بھی اپنی جگہوں پر بے حس و حرکت کھڑے یہ سارا منظر دیکھتے رہے۔ اتنے میں بڑے ابا نے گاڑی میں لگا پوسٹرز کا ڈھیر باہر گرا لیا تھا پھر وہ اس ڈھیر کے پاس کھڑے اسے آگ لگا رہے تھے اور پھر چند ہی لمحوں میں ہمارے سامنے پڑے سینکڑوں پوسٹر آگ کا الاؤ بن گئے جس الاؤ کی روشنی میں بوبی، ذیشان اور میں بڑے ابا کے سامنے مجرم بنے کھڑے تھے۔

اس واقعہ کو لے کر اگلے کئی روز تک بھی بڑے ابا کی نفرت اور غصے میں کمی واقع نہ ہوئی اور وہ کئی ہفتوں مجھ سے خفا رہے۔ انہی دنوں جب میں نے بھی اپنے آپ کو اپنے کمرے کی حد تک محدود کر رکھا تھا۔ ایک روز میرے موبائل پر راحت کی کال آئی کئی بیل ہو چکی تھیں اور میں حیرت سے اس کے نام کو اپنے موبائل کی اسکرین پر دیکھ رہا تھا جیسے مجھ کو یقین ہی نہ آ رہا تھا کہ راحت اب بھی مجھ سے رابطہ کر سکتی تھی۔ پھر میرے کال ریسیو کرتے ہی وہ جھٹ سے بولی۔

"طٰہٰ تم نے تو پلٹ کر ایک بار بھی میرا حال نہ پوچھا۔ جھوٹے منہ ہی سہی ایک مبارک باد کا پیغام تک نہ بھیجا اپنے مختصر سے ساتھ کا واسطہ دے کر ایک تم سے اعتماد ہی تو مانگا تھا چلو طٰہٰ تمہاری مرضی چاہو تو جو مرضی سزا دے لو لیکن ایک بار پھر سے تم سے کچھ کہنے آئی ہوں، میں جا رہی ہوں اس شہر ہی کو نہیں اس دیس کو بھی چھوڑ کر جا رہی ہوں۔ منان کی چھٹیاں بہت کم تھیں بڑوں نے یہی فیصلہ کیا کہ سادگی سے نکاح ہو جائے اور میں منان کے ساتھ ہی دبئی چلی جاؤں۔۔۔ بس اس دیس سے جاتے ہوئے یہی خواہش ہے کہ جب کل اس دیس کی فضاؤں سے اُڑوں تو تم سے ایک ملاقات ہو جائے پھر میں تمہیں منان سے بھی ملواؤں گی وہ تمہیں بہت اچھے لگیں گے۔ آؤ گے نا طٰہٰ۔ کل ائیر پورٹ پر مجھے اور منان کو تمہارا انتظار رہے گا۔" وہ اپنی بات کہہ چکی اور نہ جانے کیسے میں نے بھی بھیگتی آنکھوں اور بھرائی ہوئی آواز میں اسے ہاں کہہ دی۔ وہ فون بند کر چکی تھی اور میں بڑے ابا کو دعائیں دے رہا تھا جن کی بدولت نا صرف راحت کی عزت بچ گئی تھی بلکہ میں راحت کی نظروں سے گرنے سے بھی بچ گیا تھا۔ اگلے ہی روز میں عبیرہ کو ساتھ لیے ائیر پورٹ جا پہنچا۔ عبیرہ سے بھی میں نے ایک بار عہد کیا تھا کہ میں اسے راحت سے ضرور ملواؤں گا اور اب وہ راحت سے مل کر بے حد خوش دکھائی دے رہی تھی اور منان سے ہوئی چند لمحوں کی ملاقات سے لگتا ہی نہ تھا کہ ہم اس سے پہلی بار مل رہے ہیں، میں راحت سے عبیرہ کا تعارف کرا رہا تھا جب مجھے یوں لگا جیسے میرے عقب سے کوئی مجھے پکار رہا تھا۔

"طٰہٰ۔۔۔ طٰہٰ آر یو او کے۔" میں خیالوں کے دائرے سے پلٹا۔ یومنہ مجھ سے مخاطب تھی اور میرے گرد و نواح کا منظر یکسر بدل چکا تھا۔ میرے دائیں بائیں کھڑے تانیہ اور آیان مجھ سے کہہ رہے تھے۔

"پپا چلئے ناں۔۔۔!" میں اس وقت جہاز کی سیڑھیاں اترتے ہوئے وہیں کہیں خیالوں میں بہت دور نکل چکا تھا میں نے اپنے سر کو جھٹکتے ہوئے تانیہ اور آیان کے ہاتھ پکڑے اور سیڑھیاں اترتے ہوئے گردن گھما کر کہا۔

"یس۔۔۔ آئی ایم فائن یومنہ۔" وہ میری بات سن کر یوں مسکائی جیسے صدیوں سے کسی اپنے بچھڑے سے مل کر مسکراتے ہیں۔
ائیر پورٹ سے اپنا سامان وصول کر کے پھر جو ہم باہر پہنچے تو وہاں کوئی بھی ہمیں خوش آمدید کہنے کو موجود نہ تھا۔ برسوں پہلے ابا نے مجھے گھر سے نکال دیا تھا۔ اور اب میرا ان سے کوئی رابطہ نہ تھا۔ میں اس وقت مجبور تھا اور بہت پہلے جب ابھی میرا یومنہ سے نکاح بھی نہ ہوا تھا میں یومنہ کو صاف لفظوں میں بتا چکا تھا کہ اب جس راہ کا میں مسافر ہوں اس راہ پر چلتے ہوئے اگر تم میری ساتھی بننا چاہتی ہو تو ایک بار اپنے فیصلے پر غور کر لو میری راہ میں قدم قدم پر امتحان ہوں گے ہر قدم پر ایک نئی آزمائش کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے اور اس وقت اس نے کس اعتماد کے ساتھ جواب دیا تھا۔
"طٰہٰ آپ میرے ساتھ ہوں تو میں زندگی کی ہر آزمائش سے لڑ سکتی ہوں۔" اور آج اس نے اپنی کہی بات کو سچ ثابت کر دکھایا تھا وہ ہماری زندگی میں آئی ہر آزمائش پر ثابت قدم رہی تھی ٹھکرایا تو فقط مجھے میرے گھر والوں نے ہی تھا۔ چچا مرزا تو بہت اصرار کرتے رہے کہ میں ان کے پاس چلا آؤں لیکن یومنہ میری سوچ کو سمجھ چکی تھی وہ جانتی تھی کہ میں ایسا ہرگز نہ چاہوں گا کہ سسرال میں جا ڈیرہ لگاؤں تبھی اس نے بھی میرے ہر فیصلے پر سر تسلیم خم کیا تھا۔
ائیر پورٹ سے نکل کر میں نے ایک ٹیکسی والے سے کرایہ طے کیا تو پھر ہمارے بیٹھتے ہی اس نے گاڑی محلہ مومن پورہ کی جانب بڑھا دی۔ محلہ مومن پورہ وہی جگہ تھی جہاں میں برسوں پہلے آ کر رہائش پذیر ہوا تھا ایک پانچ مرلے کا مکان تھا جسے میں نے کرائے پر حاصل کیا تھا اور پھر جو اپنائیت، محبت اور پیار ہمیں اس محلے سے ملا پھر کہیں اور جا بسنے کا خیال ذہن میں آیا ہی نہیں اپنے شہر کو چھوڑ کر میلوں کی مسافت طے کرنے کے بعد میں محلہ مومن پورہ میں کوئی یونہی نہ چلا آیا تھا بلکہ یہ تو میرے دوست جمیل کی مہربانی تھی جو اس نے مجھ بے یار و مددگار کو یہاں لا بسایا تھا اور پھر صبر، امتحان، آزمائش کے بادل جب دھیرے دھیرے چھٹے تو مجھ پر میرے رب سوہنے کا ایسا فضل و کرم ہوا تھا کہ اس نے مجھے اتنا عطا کیا کہ تب میں چاہتا تو محلہ مومن پورہ کو خیر باد کہہ کر کسی پوش علاقے میں جا بستا لیکن یہ اہلِ محلہ کی ہی بے پناہ محبت تھی کہ میرے ذہن میں کبھی ایسا خیال بھی نہ گزرا۔ جمیل کے ساتھ میرا فون پر رابطہ رہتا تھا اور وہ جانتا تھا کہ آج میں واپس لوٹ رہا ہوں۔ ڈیڑھ دو گھنٹے کے سفر کے بعد جب ڈرائیور نے گاڑی محلہ مومن پورہ میں واقع میری رہائش گاہ کے سامنے روکی تو اہلِ محلہ ہاتھوں میں پھولوں کے ہار اور پتیاں لیے ہمارے استقبال کے لیے کھڑے تھے۔ میں جیسے ہی گاڑی سے نکلا تو جمیل کے بچوں اور علیم بابا کے پوتے پوتیوں نے ہم پر پھولوں کی برسات کر دی۔ سبھی نے یوں گرمجوشی سے ہمارا استقبال کیا کہ سارے سفر کی تھکان گھر کے دروازے پر ہی دور ہو گئی۔ میرے اور یومنہ سے تو وہ اب عرصہ دراز کے بعد مل رہے تھے لیکن میری بیٹی تانیہ اور بیٹے آیان سے وہ پہلی بار مل رہے تھے۔ اور اس وقت سبھی کی توجہ کا مرکز وہی دونوں بنے ہوئے تھے۔ جمیل کے پاس میرے گھر کی چابیاں موجود تھیں یہی وجہ تھی کہ میری آمد کا سن کر اس نے ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی ایک بار سارے گھر کی صفائی ستھرائی کرا دی تھی۔ گھر کے بیرونی دروازے کے دونوں پٹ کھلے تھے اور جب میری نظر پورچ

میں کھڑی اپنی گاڑی پر پڑی تو مجھے خیال آیا کہ میں نے تو ابھی ڈرائیور کو کرایہ کے پیسے بھی نہ دیے تھے۔ میں جو یہ خیال آتے ہی پلٹا تو معلوم پڑا کہ جمیل ٹیکسی والے کو کرایہ ادا کر چکا تھا اور جب ہم سبھی سے مل رہے تھے وہ ہمارا سامان بھی اندر پہنچا چکا تھا۔ وہیں کھڑے کھڑے میں نے یومنہ کو اشارہ کیا کہ وہ محلہ کی عورتوں اور بچوں کو گھر لے آئے وہ میرا اشارہ سمجھ گئی تو میں نے اپنے دوست جمیل اور بابا علیم کو ساتھ لیا اور گھر داخل ہوتے ہوئے میں نے ان کا شکریہ ادا کیا کہ جس طرح سے ہر قدم پر ان لوگوں نے میرا ساتھ نبھایا یوں میرا کوئی اپنا بھی نہ کر سکتا تھا۔ اب سبھی ہال میں بیٹھ چکے تھے جب میں نے یومنہ کو اشارے سے ایک طرف بلایا اور اس سے رائے لی کہ کیوں نہ ہم اپنے اور بچوں کے لیے لائے لباس اور کھلونے اہلِ محلہ میں تقسیم کر دیں وہ میری یہ بات سن کر مسکرائی اور بولی۔

"طہٰ کبھی ہمارے پاس کچھ بھی تو نہ تھا اور اگر آج ہمیں اللہ تعالیٰ نے سبھی نعمتوں سے نوازا ہے تو ہمیں بھی اپنے اردگرد بستے لوگوں کو بھولنا نہیں چاہیے۔" مجھے اس سے ایسے ہی جواب کی توقع تھی پھر ایک بیگ یومنہ عورتوں اور بچوں کی طرف لے گئی اور ایک بیگ کھول کر میں نے اپنے دوست جمیل اور بابا علیم کے سامنے سبھی چیزیں رکھ دیں تاکہ وہ اپنی من پسند چیزیں اٹھا لیں اسی دوران میں نے جو سر گھما کر یومنہ کی جانب دیکھا تو ہمارے دونوں بچے تانیہ اور آیان بھی اپنے لیے لائی چاکلیٹ اور کینڈیز اپنے ہم عمر ساتھیوں میں تقسیم کر رہے تھے۔ پھر یہ سلسلہ رات گئے تک چلتا رہا۔

اگلے روز صبح فجر کی نماز ادا کر کے ہم لوگ پھر سے ذرا استراحت کو لیٹ گئے تھے اور پھر جو سو کر اٹھے تو بچے شہر دیکھنے اور گھومنے پھرنے کی فرمائش کرنے لگے تھے۔ یہ دیکھ کر یومنہ مجھ سے کہنے لگی کہ گھر کے لیے سودا سلف لانا ہے تو یوں بچوں کی سیر بھی ہو جائے گی۔ یومنہ کی بات سن کر میں نے عرصہ دراز کے بعد پورچ میں کھڑی گاڑی کے اوپر سے کپڑا ہٹایا تو وہ میرے خیال کے عین مطابق اسٹارٹ نہیں ہوئی تھی۔ ایسا دیکھ کر میں قریبی ورکشاپ سے جا کر ایک مکینک کو ساتھ گھر لے آیا تھا اس نے اپنے ساتھ لائی بیٹری سے گاڑی اسٹارٹ تو کر دی تھی لیکن پھر وہ میرے کہنے پر گاڑی اپنے ساتھ ورکشاپ لے گیا تھا کیونکہ عرصہ دراز سے بند کھڑی رہنے کی وجہ سے چند ایک کام مزید باقی تھے جو کہ احسن طریقے سے ورکشاپ میں ہی جا کر کیے جا سکتے تھے۔ یوں اس روز ہمیں گاڑی شام کو جا کر واپس ملی اور ہم لوگ بچوں کو ساتھ لے کر مغرب کے بعد گھر سے نکلے تھے۔ پہلے تو ہم لوگ یونہی شہر کی چند ایک اہم شاہراہوں پر گھومتے پھرتے رہے۔ پھر میں نے گاڑی ایک شاپنگ مال کی پارکنگ میں روکی جہاں سے خریداری بھی ہو سکتی تھی، کھانا بھی کھایا جا سکتا تھا اور بچوں کے لیے جوائے لینڈ بھی موجود تھا۔ خریداری کے لیے ہمیں جوائے لینڈ کے قریب سے گزرتے ہوئے اگلی عمارت تک جانا تھا لیکن پھر بچوں نے ہمیں آگے کہاں بڑھنے دیا تھا لا محالہ ہم بچوں کو لیے جوائے لینڈ میں داخل ہو گئے۔ تانیہ سات، آٹھ سال کی ہو رہی تھی جبکہ آیان ابھی پانچ سال کا ہی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بہت سے جھولے ایسے تھے جن پر ابھی انہیں بیٹھنے کی اجازت نہ تھی۔ تو ہم ان جھولوں کے نزدیک کھڑے ہی محظوظ ہوتے رہے۔ پھر تانیہ ہمیں گیم سٹیشن میں لے

جانے کے لیے اصرار کرنے لگی۔ وہ سعودی عرب میں بھی ہمارے ساتھ جب جایا کرتی تھی تو پھر بہت سی کینڈیز اور کھلونے جیت کر ساتھ لے آیا کرتی تھی اور اب گیم جوائے لینڈ کی طرف بڑھتے ہوئے میں اسی لیے یومنہ کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا کیونکہ ہم دونوں ہی جانتے تھے کہ اب تانیہ کے گیم مشین میں داخل ہونے پر کمپنی کا بہت نقصان ہونے والا تھا۔ تانیہ، آیان کا ہاتھ پکڑ کر ہم دونوں کے اندر داخل ہونے سے پہلے ہی اندر پہنچ چکی تھی ہم لوگ اندر پہنچے تو دونوں ہی مختلف گیمز کا مشاہدہ کر رہے تھے۔ ہم لوگ ویک اینڈ پر نہیں آئے تھے، یہی وجہ تھی کہ زیادہ بھیڑ بھاڑ نہ تھی۔ میں تانیہ کے گیمز کا مشاہدہ کرنے تک کوئن لے کر اس کے پاس جا کھڑا ہوا وہ دونوں کھلونے جیتنے والے گیم کے پاس کھڑے تھے اور تانیہ آیان سے پوچھ رہی تھی کہ اسے کون سا کھلونا زیادہ پسند ہے۔ آیان اسے ہاتھ کے اشارے سے یہ سب بتا رہا تھا تانیہ نے اس کے گال پر پیار کیا اور اب اسے کھیلنے کے لیے کوئن چاہیے تھا وہ کوئن لینے کے لیے پلٹی میں اس کے عقب میں ہی کھڑا مسکرا رہا تھا میں نے اسے کوئن دیا اور اب یومنہ بھی میری جانب دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ تانیہ نے میرے ہاتھ سے کوئن لے کر گیم میں انٹر کیا اور پھر وہ اس کے کنٹرول ہینڈل ہاتھ میں لیے گیم کے آغاز کا انتظار کرنے لگی۔ اگلے ہی پل گیم کا آغاز ہو چکا تھا۔ وہ تیسری قطار میں ہی بہت پیارا سا ٹیڈی بیئر تھا جو آیان کو پسند آیا تھا چند سیکنڈ میں ہی کھلونوں کے پاس سے گزرتی راڈ کے دھکے سے اس ٹیڈی بیئر کو گرانا تھا ہم لوگ ابھی دم سادھے کھڑے ہی تھے جب تانیہ نے اسے گرا لیا تھا وہ خوشی سے خود ہی تالیاں بجاتی آیان کو پیار کرنے کو جھکی تو تب تک گیم کے پاس کھڑے ملازم نے ان کا جیتا گفٹ ٹیڈی بیئر انہیں گیم کے عقب سے نکال کر دے دیا تھا اور پھر ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے گیم کے اندر موجود سارے کھلونے ہمارے ہاتھوں میں موجود تھے۔

میں اور یومنہ ایک دوسرے کی جانب مسکرا کر دیکھتے ہوئے کینڈیز والی گیم کی طرف بڑھے کیونکہ اب تانیہ اور آیان وہاں پہنچ چکے تھے جب میں نے سر گھما کر دیکھا تو وہاں موجود ملازم بھی ابھی تک حیرت سے ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے پھر ہماری طرح وہ بھی تانیہ اور آیان کے ارد گرد تجسس سے کھڑے دیکھنے لگے کہ یہ چھوٹی سی بچی کینڈیز کا کیا حشر کرتی ہے اور پھر ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے اس بار ساری کی ساری کینڈیز بھی گیم سے باہر آ گری تھیں۔ یہ دیکھ کر وہاں کھڑے ملازم حیران ششدر ہو کر کبھی ہمارے بچوں تانیہ اور آیان تو کبھی ہمارے ہاتھوں میں موجود کھلونوں کو دیکھتے رہے۔ جوائے لینڈ میں آئے تو ہم لوگ خالی ہاتھ تھے لیکن اب دو بڑے بڑے بیگز میں کھلونے اور کینڈیز لے جا رہے تھے جوائے لینڈ سے نکل کر میں یومنہ اور بچوں کو ایک جگہ رکنے کا کہہ کر خود پارکنگ میں کھڑی گاڑی تک آیا اور پھر کھلونے اور کینڈیز گاڑی میں چھوڑ کر واپس یومنہ اور بچوں کے پاس چلا آیا جو میرا انتظار کر رہے تھے۔ میرے وہاں پہنچتے ہی ہم لوگ آگے بڑھے تو ہمارے ارد گرد دائیں بائیں اب مختلف برینڈز کی دکانیں تھیں جن کے سامنے سے ہم لوگ گزر رہے تھے۔ یونہی چہل قدمی کرتے ہوئے آگے بڑھتے ہوئے تانیہ ایک جوتوں والی دکان کے سامنے پہنچ کر رک گئی وہ یومنہ سے جوتا لینے کی فرمائش کر رہی تھی۔ تانیہ کو جوتا دلانے کے لیے ہم لوگ اس دکان میں داخل ہو گئے اندر پہنچ کر

اندازہ ہوا کہ دکان کافی بڑی تھی جہاں بچوں بڑوں سبھی کے لیے ہر قسم کے جوتے دستیاب تھے لیکن ہماری بیٹی کو تو ساری دکان گھوم کر بھی کوئی جوتا پسند نہیں آ رہا تھا۔ پھر وہ ایک ریک کے پاس پہنچ کر رک گئی۔

"مما مجھے وہ جوتا چاہیے۔" ابھی تانیہ نے جوتا پسند ہی کیا تھا اور ایسا وہ اپنی مما کو بتا رہی تھی جب ریک کے پاس کھڑے سیلز مین نے ایک سرخ رنگ کے جوتے کو ریک سے اتار کر تانیہ کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

"آپ کی بیٹی کی پسند تو لاجواب ہے۔ یہ ہمارے اس سیزن کا سب سے مہنگا جوتا ہے جسے ہم سیزن کے مڈ میں ہی ڈسپلے کرتے ہیں۔"

"انکل ایسا آپ کے پاس بلیو بھی ہے جو آپ نے ابھی تک ڈسپلے نہیں کیا۔" سیلز مین کی بات سن کر تانیہ نے سرعت سے جواب دیا جسے سن کر پہلے تو سیلز مین مسکرایا لیکن پھر جیسے ہی اس نے تانیہ کی بات پر غور کیا تو اس نے اپنا سر گھما کر ریک کی جانب دیکھا جہاں فقط سرخ رنگ کا ہی جوتا پڑا تھا اور یہ بات سیلز مین جانتا تھا کہ بلیو ابھی ڈسپلے نہیں کیا گیا تھا لیکن تانیہ یہ سب کیسے جانتی تھی۔ وہ ابھی حیران ہو کر تانیہ کی جانب دیکھ ہی رہا تھا جب ایک لمبا تڑنگا شخص جسے دیکھ کر ہمیں پتا چلا کہ وہ ہمارے عقب میں ہی کھڑا یہ ساری باتیں سن رہا تھا آگے آیا اور تانیہ کے قریب بیٹھتے ہوئے مسکرا کر بولا۔

"بیٹی تمہارا نام کیا ہے۔"

اس کے ایسا پوچھتے ہی تانیہ دو قدم پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔

"انکل آپ کو اس سے مطلب۔"

"چلو تانیہ ہمیں دیر ہو رہی ہے۔" تانیہ کو گھبراتا دیکھ کر یومنہ ایسا کرتے ہوئے تانیہ کو لے کر باہر کی جانب بڑھی۔ وہ بیٹھا ہوا شخص سراسیمہ سا ہو کر اٹھتے ہوئے میری جانب دیکھ کر اپنے بڑے بڑے پیلے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے بولا۔

"آپ کی بیٹی بہت خاص ہے وہ کوئی عام بچی نہیں، اس میں قابلیت ہے۔" یہ بات تو ہم دونوں میاں بیوی بھی جانتے تھے اور ایسی صورتِ حال میں یومنہ جانتی تھی کہ اسے کیا کرنا ہوتا تھا یہی وجہ تھی کہ وہ تانیہ کو لے کر اس دکان سے باہر چلی گئی تھی۔ میں نے بھی وہاں کھڑے شخص کی بات کا جواب دینا کوئی ضروری نہ سمجھا اور میں آیان کا ہاتھ تھامے آگے بڑھتے ہوئے اس دکان سے باہر نکلنے ہی والا تھا جب مجھے عقب سے اسی شخص کی آواز دوبارہ سنائی دی۔

"میری بات یاد رکھنا تمہاری بیٹی میں خاص قابلیت ہے اس کا خاص دھیان رکھنا۔" میں اس شخص کی بات سن کر لمحہ بھر کو رکا لیکن پلٹا نہیں اور پھر تیز تیز ڈگ بھرتا میں پارکنگ تک چلا آیا تھا جہاں یومنہ تانیہ کو ساتھ لیے پہلے سے گاڑی کے پاس موجود تھی میں نے گاڑی کا لاک اوپن کیا اور پھر سبھی کے بیٹھتے ہی میں نے گاڑی واپس گھر کی جانب بڑھا دی، راستے میں ہی تانیہ اپنی مما اور مجھے بتا رہی تھی کہ وہ انکل اسے اچھے نہیں لگے تھے وہ ڈر گئی تھی اور جب میں نے تانیہ کی بات پر ذرا غور کرتے ہوئے اک بار اس شخص کا حلیہ پھر سے اپنی نگاہوں کے سامنے دہرایا تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کوئی سفلی علوم کا ماہر شخص تھا۔

تانیہ اور آیان ہمارے ایسے بچے نہ تھے جو کہ شادی کے بعد پکے ہوئے پھل کی طرح ہماری جھولی میں آٹپکے تھے۔ بلکہ یومنہ اور میں جب کئی برسوں تک اولاد جیسی نعمت کو ترستے رہے تو ہم نے اللہ کے حضور گڑگڑا کر دعائیں کی تھیں ہمیں جو اللہ والے لوگ ملتے ہم ان سے اولاد کے لیے دعائیں کراتے۔ درگاہوں پر حاضری دیتے اور منتیں مانگتے رہے تھے۔ ہماری اولاد تو راتوں کو اللہ کے حضور گڑگڑا کر مانگی دعاؤں، بزرگوں اور اللہ کے ولیوں کی دعاؤں کا ثمر تھا اور جب تانیہ ذرا بڑی ہوئی تو ہمیں اندازہ ہو گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے عام انسانوں سے زیادہ صلاحیتیں ودیعت کر کے اس دنیا میں بھیجا تھا۔ جب وہ نئی نئی اسکول جانا شروع ہوئی تو ایک روز اس کی استانی نے ہمیں یہ بتا کر حیران کر دیا تھا کہ جو اسے اگلے روز پڑھانا ہوتا تھا تانیہ کو پہلے سے معلوم ہوتا تھا اور اس سے بھی حیران کر دینے والا اس کا جواب ہوا کرتا تھا۔ جب ہم میں سے کوئی اس سے یہ پوچھتا "تانیہ بیٹا تمہیں یہ سب کیسے پتا چلتا ہے تو وہ جھٹ سے جواب دیتی۔"

"مجھ کو اللہ تعالیٰ بتاتے ہیں۔" تب وہ اتنی چھوٹی تھی کہ اس کے اس معصوم انداز پر ہم بے ساختہ ہنس دیا کرتے تھے لیکن اب وہ بڑی ہو رہی تھی اور انسانوں میں پائی جانے والی ایسی قابلیت اور غیر معمولی صلاحیت کا جن عام لوگوں کو ادراک نہ ہوتا تھا میری اور یومنہ کی حتیٰ الامکان کوشش یہی ہوتی تھی ایسے لوگوں سے ہم اپنی بیٹی کو دور ہی رکھیں۔

ہم لوگ اب جس شاہراہ پر سے گزر رہے تھے وہاں سے گھر تک کا فاصلہ زیادہ نہ تھا اور میری نظریں گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے کسی ریستوران کی تلاش میں تھیں۔ ساتھ ہی میں یومنہ اور بچوں سے پوچھ رہا تھا کہ وہ کیا کھانا پسند کریں گے۔ جب اسی دوران میں ایک ریستوران کے نزدیک گاڑی رک چکی تھی میرے ریستوران کے نزدیک گاڑی رکتے ہی ایک نوجوان ملازم مینیو بک لے کر ہماری طرف بڑھا۔ یہ شہر کا روایتی سا ہوٹل تھا جس کی سج دھج رات ہوتے ہی بڑھ جاتی تھی باربی کیو سے اٹھتا دھواں، دیسی مرغ کی کڑاہی اور توے پر بنتے کٹاکٹ کی آوازیں راہ چلتے لوگوں کا دور تک پیچھا کرتی تھیں۔ میں نے بھی آرڈر کے لیے ملازم سے مینیو بک لے کر یومنہ کی جانب بڑھائی۔ تو اس نے بھی یہ کہتے ہوئے مینیو بک مجھے واپس لوٹا دی کہ "طٰہٰ ہمیں دیر ہو جائے گی آپ مختصر سا آرڈر پیک کرا لیں۔" یومنہ کی بات سن کر میں نے ملازم کو ذرا جلدی آرڈر پیک کرنے کو کہا اور پھر میری نگاہ ریستوران کے ساتھ ہی ایک بیکری پر پڑی بچے تو میری آفر سن کر جھٹ سے چلنے کو تیار ہو گئے لیکن یومنہ نے کہا کہ وہ گاڑی میں ہی بیٹھے گی یومنہ کا جواب سن کر میں اور بچے بیکری میں پہنچے جہاں سے سافٹ ڈرنک، جوسز، کیک اور بچوں کے لیے چاکلیٹ لے کر ہم تھوڑی ہی دیر میں واپس پلٹ آئے تھے گاڑی میں واپس پہنچتے ہی ہمارا کھانے کا آرڈر بھی پیک ہو کر آ گیا تھا میں نے بل ادا کیا اور گاڑی گھر کی جانب بڑھا دی گھر اب وہاں سے زیادہ دوری پر نہ تھا ہم کچھ ہی دیر میں گھر جا پہنچے تھے۔

گھر پہنچتے ہی یومنہ کھانا میز پر رکھنے میں مصروف ہو گئی تھی کہ اب سبھی کو زوروں کی بھوک لگ رہی تھی یومنہ کے کھانا میز پر لگاتے ہی میں تو جھٹ سے کھانے کو بیٹھ چکا تھا لیکن یومنہ تانیہ اور آیان کو زبردستی کھانے کی میز پر لائی تھی وہ جوائے لینڈ سے جیتے کھلونوں سے کھیلنا چاہتے تھے۔

کھانے سے فراغت کے بعد یومنہ بچوں کو ان کے کمرے میں سلانے چلی گئی اور میں اپنے خالق حقیقی اپنے رب سوہنے کا شکر بجالانے کے لیے عشاء کی نماز ادا کرنے میں مصروف ہو گیا تھا۔ عشاء کی نماز ادا کر چکنے کے بعد میں نے جو ایک طویل سجدے سے اپنا سر اٹھایا تو عین اسی لمحے یومنہ بھی بچوں کو ان کے کمرے میں سلا کر اپنے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ میں نے جو اپنا سر گھما کر یومنہ کی جانب دیکھا تو لمحہ بھر کو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں برسوں پہلے اسی منظر میں جا اترا تھا جب میں یونہی اپنے کمرے میں اپنے خالق حقیقی کے حضور سربسجود تھا اور یومنہ رومی میاں کے کھیل ''منٹ ٹو وِن اِٹ'' کی کڑی کے سلسلے میں چھپائے رقعے کو میرے کمرے میں کھوجتے پہنچی تھی۔

''چاچو طٰہٰ عالم کے کمرے میں کتابوں والی الماری۔'' یومنہ سامنے کھڑی تھی اور برسوں پہلے وہ جس رقعے کو کھوجتی میرے کمرے میں آ پہنچی تھی، اس رقعے پر درج عبارت میرے لبوں سے ادا ہو گئی تھی میں وہیں اپنی جگہ پر بے حس و حرکت کھڑا رہ گیا تھا بڑے ابا، رومی میاں، مصطفیٰ عالم، بھابھی، صائم میاں، بابا عبدالقادر مائیکل میرے ماں اور ابا مجھے شدت سے یاد آنے لگے تھے اور میری آنکھیں شدتِ جذبات سے چھلک پڑی تھیں۔ یومنہ میری ایسی حالت دیکھ کر فوراً میرے قریب آئی اور اس نے مجھے استراحت کے لیے بستر پر لٹا دیا پھر وہ خود بھی میرے پاس بیٹھی دیر تک میرے بالوں کو سہلاتی رہی نہ میں نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے اور نہ ہی اس نے اپنے لبوں کو جنبش دی۔

رات کے نہ جانے کس پہر میری آنکھ لگ گئی تھی اور جو پھر میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا تو میرے ذہن میں ابھی تک خواب میں دکھائی پڑے شخص کے الفاظ کی گونج باقی تھی۔

''تمہاری بیٹی کوئی عام بچی نہیں اس میں خاص قابلیت ہے اس کا خاص دھیان رکھنا۔'' وہی جوتوں کی دکان پر ملنے والا لمبا تڑنگا شخص اپنے پیلے پیلے دانتوں کی نمائش کرتا انگوٹھیوں سے بھرا ہاتھ اٹھا کر مجھے تنبیہہ کر رہا تھا میں نے سبھی خیالات کو جھٹک کر اپنے دائیں طرف دیکھا یومنہ گہری نیند میں لگ رہی تھی۔ میں نے کمرے میں پھیلی ملگجی روشنی میں وقت دیکھا سوا پانچ بج رہے تھے۔ مطلب کچھ ہی دیر میں فجر کی اذانیں شروع ہونے والی تھیں میں نے اٹھ کر وضو کیا اور بچوں کے کمرے میں جا کر دیکھا تو تانیہ اور آیان سو رہے تھے۔ میں تانیہ کے سرہانے جا بیٹھا اس کی چادر کو اس پر درست کیا اور پھر زیر لب آیت الکرسی پڑھ کر میں چند لمحے اس پر اور ساتھ سو رہے آیان پر دم کرتا رہا۔ ایسا کرتے ابھی مجھے وہاں چند گھڑیاں ہی بیتی تھیں کہ فجر کی اذانیں شروع ہو گئیں اور میں اذان کے کلمات سن کر ان کا جواب دینے لگا۔ اذانیں ختم ہوئیں تو میں بچوں کے کمرے سے نکل کر اپنے کمرے میں پہنچا اور پھر یومنہ کو

نماز کے لیے جگایا یومنہ کے جاگنے پر میں فجر کی نماز باجماعت ادا کرنے مسجد چلا گیا۔ مسجد میں نماز کے بعد جمیل، بابا علیم اور چند ایک اور شناسا چہروں سے ملاقات ہوگئی۔ وہ بھی قبلہ اول کعبتہ اللہ کی زیارت اور مسجد نبویؐ، گنبد خضرا، روضہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار کے واسطے تڑپ رہے تھے۔ وہ بار بار ذکر ہی ذکر میں میرے ہاتھوں کو چوم کر اپنی آنکھوں کو لگاتے رہے اور میں ان کے سامنے کھڑا سوچ رہا تھا کہ یہ تو ایسی پیاس تھی ایسا عشق تھا جو جسے جتنا نصیب ہو، وہ اسے اور پانے کی جستجو میں لگ گیا۔ میں نے پندرہ سال وہاں نمازیں ادا کیں اور ہر نماز میں، میں نے الگ ہی کیفیت کو پایا۔

فجر کی نماز کے بعد جو میں گھر واپس لوٹا تو کوئی مصروفیت تو تھی نہیں، یہی وجہ تھی کہ میں ذرا استراحت کو لیٹ گیا تھا پھر ظہر کے بعد کا وقت چند کاموں میں مصروف گزرا اور عصر کے بعد جو فراغت کے چند لمحے میسر آئے تو میرے بچے تانیہ اور آیان اصرار کرنے لگے کہ میں انہیں باہر لے کر چلوں۔ یوں بچوں کے اصرار پر میں انہیں ہمراہ لیے باہر چلا آیا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ بچے اپنے گھر کے گردونواح میں موجود بازار اور دکانیں بھی دیکھ لیں گے اور یوں کچھ سیر بھی ہو جائے گی۔

ہم لوگ اب سڑک کے اطراف میں کھڑی بے شمار پھلوں کی سجی ریڑھیوں کے نزدیک سے گزر رہے تھے۔ یہاں محلے سے نکلتے ہی سڑک چار مختلف سمتوں میں بٹ جاتی تھی اور پھر شہر بھر کے اطراف سے اس چوک نما حصے سے لوگوں کی آمد و رفت کا سلسلہ رات گئے تک کچھ یوں جاری وساری رہتا تھا کہ یہ شاہراہ ریڑھی بان حضرات کے لیے خاص اہمیت کی حامل تھی۔ پھلوں کی سبھی قسمیں چاہے وہ موسمی ہوں یا بے موسمی یہاں دستیاب تھیں جنہیں دیکھ کر میرا پھل خریدنے کا ارادہ بن ہی رہا تھا کہ جب تانیہ نے مجھے آگاہ کیا کہ اس کا ایک جوتا ٹوٹ گیا تھا۔ وہ اپنے ایک پیر کو ذرا زمین پر گھسیٹتے ہوئے چل رہی تھی۔ یہ دیکھ کر میں نے پھل خریدنے کا ارادہ فوری ملتوی کر دیا تھا اور میں تانیہ کو لے کر جوتا مرمت کرنے والی دکان پر آ گیا تھا۔ وہ سبھی حضرات خان تھے جنہوں نے درخت کے موٹے سے تنے کے عین نیچے پتھروں کی مدد سے چبوترہ سا بنا رکھا تھا جس پر بیٹھے وہ جوتے گانٹھتے تھے۔ وہاں پہنچ کر میں نے تانیہ کا جوتا خان صاحب کو مرمت کرنے کو دیا تو وہ مجھے دیکھ کر کچھ سوچتے ہوئے مسکرا پڑے۔ جیسے یاد کرنے کی کوشش کر رہے ہوں کہ ایسے شخص کو یہاں پہلے بھی دیکھا تھا، وہاں پاس ہی رکھا ایک جوتا میں نے تانیہ کو پہننے کو دے دیا تھا اور اب دونوں بچے تانیہ اور ایان جوتا گانٹھتے ہوئے خان صاحب کے ہاتھوں کی حرکت کو بغور دیکھ رہے تھے اور میری نظریں دھریک کے اس درخت کو دیکھ رہی تھیں جس کے عقب میں اب سورج غروب ہونے کو تھا۔ مارچ کے آخیر دنوں میں سورج کے غروب ہونے کے قریب مستانی پروائی سی چلنے لگتی تھی۔ دھریک کے پیڑ کی نئی پھوٹتی کونپلوں کے ساتھ ہی اپنی بہار دکھاتے اودھے اودھے پھولوں کی دبیز باس فضا میں عجیب حشر بپا کیے ہوئے تھی۔

پھولوں کا رس چوسنے والی مکھیوں، حشرات اور تتلیوں کے غول در غول اوپر منڈلا رہے تھے۔ اوپر ہوائیں ان کی آمد و رفت کا ایک نظام رواں دواں تھا تو میرے عقب میں موجود شاہراہ پر بھی زندگی معمول کے مطابق رواں دواں تھی۔ جب دھریک کے پھولوں

کی دبیر باس میں مجھے اک جانی پہچانی وہی لاہوتی سی خوشبو محسوس ہوئی جو یا تو بابارب نواز کی سنگت میں محسوس ہوتی تھی یا پھر ان کی تحفتاً دی چادر سے محسوس ہوتی تھی۔

ایسا محسوس کرتے ہی میں جیسے حرکت میں آ گیا تھا۔ میں نے یکا یک اپنا سر ارد گرد گھما کر دیکھا عین اسی لمحے وہ میرے عقب سے نمودار ہو کر آگے بڑھے چلے جا رہے تھے۔

او نہ ہو۔۔۔"اس خوشبو کا محور وہ ذات ہی تھی اور جیسا عمل میں انہیں کرتا دیکھ چکا تھا وہ عمل بھی بابارب نواز ہی کر سکتے تھے۔ وہ جو کہتے تھے کہ چھوڑ دو میاں اس دنیا کو جو تمہیں اتنے گھاؤ دیتی ہے جہاں لوگ فقط اپنے سواد کے لیے جیتے ہیں ان لوگوں کے بیچ رہو گے تو انہی کے جیسا ہونا پڑے گا پھر تم گھاؤ سہتے سہتے خود بھی ایک دن انہی کی طرح کانٹا بن جاؤ گے اور یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔ وہی بابا رب نواز جو میرا ہاتھ چچا مرزا کے ہاتھ میں تھما کر پھر مجھے انہی لوگوں کے بیچ چھوڑ گئے تھے اور آج یوں اچانک برسوں بعد مجھے دکھائی پڑے تھے۔

وہ اک عمل بار بار دہرا رہے تھے اک بار اپنے سر کو سینے پر جھکائے کوئی تسبیح زیر لب پڑھتے اور پھر جو وہ ایک دم سے اپنے سر کو اٹھاتے تو اک بار دائیں طرف کے انسانوں، حیوانوں، چرند پرند، حشرات اور در و دیوار پر اس تسبیح کی برکات کو پھونکتے تو دوسری بار ایسا ہی عمل وہ دائیں طرف دہراتے آگے بڑھے چلے جا رہے تھے۔ ایسا دیکھ کر مجھے پختہ یقین ہونے لگا تھا کہ ہو نہ ہو وہ بابارب نواز ہی ہو سکتے تھے اس سے پہلے کہ میں بے ساختہ ان کے تعاقب میں چل پڑتا میں تانیہ کو وہیں اپنے بھائی کے پاس ٹھہرنے کا کہہ کر تیز تیز ڈگ بھرتا آگے بڑھ گیا۔ اب میں باباجی کے تعاقب میں تیز تیز قدم بھرتا چلا جا رہا تھا اور میرے سینے میں میرا دل تھا کہ عجب سے انداز میں پگھلا جا رہا تھا تبھی ان کے اور اپنے درمیان فاصلہ ذرا کم ہوتے ہی میں نے انہیں پکارا۔

"بابا رکیے میں۔۔۔ طہٰ۔۔۔"وہ میری آواز سن کر ذرا فاصلے پر جا کر رکے لیکن پلٹے نہیں۔ میں تیزی سے آگے بڑھ کر ان تک پہنچا اور جو میری نگاہ ان کے چہرے پر پڑی تو جیسے میں بھونچکا سا ہو کر رہ گیا۔ سراپا بھی وہی تھا خوشبو بھی وہی تھی لیکن وہ میرے بابارب نواز نہ تھے میں سراسیمہ ہو کر بولا۔

"معاف کیجیے گا باباجی! میں سمجھا آپ میرے بابارب نواز ہیں لیکن یہ خوشبو یہ سراپا یہ میرے بابارب نواز سا ہی ہے، وہ ایسی ہی خوشبو لگاتے تھے۔"

ہم لوگ عین سڑک کے کنارے کھڑے تھے میری بات سن کر میرے سامنے بابارب نواز جیسے حلیے میں کھڑے باباجی نے اپنی سرمہ لگی روشن نگاہوں سے ایک بار مجھے سر تا پاؤں یوں دیکھا جیسے ان کی نگاہیں ایکسرے مشین ہو جو میرے وجود کے آر پار دیکھ سکتی ہوں یکا یک وہ اپنے بھاری ہاتھوں سے مجھے میرے کاندھوں سے تھامے ذرا ایک طرف سڑک سے کچھ فاصلے پر لے گئے اور کچھ توقف کے بعد بولے۔

"طہٰ میاں بابا رب نواز اس دنیا میں نہیں رہے۔" میرے سامنے کھڑے باباجی نے جو مجھے یہ بری خبر سنائی تو جیسے مجھ پر قیامت ٹوٹ پڑی گویا میرے دماغ کے قریب کوئی بم پھٹا ہو اور مجھے کان پڑی آواز نہ سنائی دے رہی ہو چند گھڑیوں تک میں ایسی ہی حالت سے دو چار باباجی کے سامنے کھڑا آنسو بہاتا رہا اور پھر جب میری آنکھوں کے ساغر تھمے اور میں اپنے گرد و نواح میں کچھ سمجھنے سننے کے قابل ہوا تو مجھے یہ دیکھ کر جھٹکا لگا کہ اب باباجی وہاں نہ تھے۔ میں جھٹ سے پلٹا وہ مجھے تیز تیز ڈگ بھرتے پہلے سا عمل دہراتے آگے بڑھتے دکھائی دیئے۔

وہ میرے بابا رب نواز نہ تھے لیکن ان میں میرے بابا رب نواز کی خوشبو باقی تھی ایسا خیال آتے ہی میرے دماغ میں اک جھماکا سا ہوا۔

ہو نہ ہو یہ تو عہدے تھے جب ایک اللہ کا ولی اس دنیا سے کوچ کر جائے تو اس کی جگہ خالی تو نہ رہے گی وہ رب سوہنا اپنے کسی اور خاص بندے کو وہ منصب سونپ دیتے ہوں گے پھر اب میرے بابا رب نواز کی جگہ ان باباجی نے لے لی تھی۔ میں بے ساختہ پھر سے ان کے تعاقب میں دوڑا۔

"آپ مجھے چھوڑ کر کیسے جاسکتے ہیں بابا!" ان کے برابر پہنچ کر میں نے ایسا کہتے ہوئے انہیں روکا۔ "میرے بابا رب نواز اب اس دنیا میں نہیں رہے، آپ ان سے متعلق اتنا سب جانتے ہیں تو پھر آپ میرے لیے اجنبی کیسے ہوئے۔ میں آپ کو ہرگز نہ جانے دوں گا آج آپ کو مجھے اپنی مہمان نوازی کا شرف تو عطا کرنا ہی پڑے گا۔" وہ میری بات سن کر چند لمحوں تک کچھ سوچتے رہے پھر جیسے انہیں میری حالت دیکھ کر مجھ پر رحم آ ہی گیا۔ وہ میرے ہمراہ چلنے کے لیے راضی ہوئے تو میرے سلگتے سینے میں کچھ راحت کا احساس ہوا میں انہیں ہمراہ لیے خان بابا کی دکان پر پہنچا تو میرے بچے تانیہ اور ایان بے چینی سے میرا ہی انتظار کر رہے تھے۔ میرے لوٹنے تک تانیہ کا جوتا بھی مرمت ہو چکا تھا۔ میں نے خاں صاحب کو جوتا مرمت کرنے کی اجرت دی اور گھر کی طرف بڑھتے ہوئے باباجی کو اپنے بچوں سے ملوایا وہ ان سے مل کر بے حد خوش ہوئے انہوں نے دونوں کے سر پر ہاتھ پھیر کر انہیں دعا دی۔

ہمارے گھر پہنچنے تک مغرب کا وقت ہو چکا تھا، گھر پہنچ کر باباجی یومنہ سے بھی ملے اسے بھی سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی اور میں یومنہ سے باباجی کے آرام و طعام کا بندوبست کرنے کا کہہ کر ان کے ہمراہ مغرب کی نماز ادا کرنے مسجد کی جانب چل پڑا۔

جب میں اور باباجی مغرب کی نماز مسجد میں ادا کر کے گھر لوٹے تو تب تک یومنہ بھی نماز سے فراغت کے بعد دستر خوان بچھا کر کھانا رکھ چکی تھی پھر میں نے اور باباجی نے ہاتھ دھوئے اور ہم کھانا تناول کرنے بیٹھ گئے۔ کھانا کھاتے ہوئے اس قدر خاموشی تھی کہ میں با آسانی سن سکتا تھا کہ وہ ہر لقمے کے ساتھ بسم اللہ اور الحمد اللہ پڑھ رہے ہیں۔ کھانے سے فراغت کے بعد وہیں دستر خوان پر بیٹھے بیٹھے انہوں نے دعا کی اور پھر اٹھ کر مسواک کرنے چلے گئے۔

اتنے میں یومنہ میرے کہنے پر دستر خوان سمیٹ کر چلی گئی اور میں بھی باباجی سے عشاء کے وقت تک کے لیے اجازت لے کر کمرے سے باہر چلا آیا تھا۔ کمرے سے باہر آتے ہی یومنہ نے مجھے دو ایک کام بتادیئے جن سے فراغت پانے تک عشاء کی اذانیں شروع ہو گئیں۔ میں باباجی کے پاس کمرے میں پہنچا تو وہ بھی عشاء کی نماز باجماعت ادائیگی کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ میں نے ان کے نکلنے کے لیے دروازہ کھولا تو وہ میری جانب دیکھ کر مسکرائے اور پھر گھر سے نکل کر ہم خراماں خراماں مسجد کی جانب چل پڑے۔

مسجد میں عشاء کی نماز ادا کرنے کے بعد میں اور باباجی گھر واپس لوٹے تو میں اپنے سارے اہلِ خانہ کے ساتھ باباجی کی خدمت میں بیٹھ گیا تھا۔ وہ اب ایسی گفتگو فرما رہے تھے کہ جس میں چھوٹے بڑے سبھی کی دلچسپی کا سامان تھا۔ انہوں نے تانیہ اور ایان کو اپنے دائیں بائیں بٹھار کھا تھا۔ وہ باتوں ہی باتوں میں کوئی ایسی پُر مزاح بات کر جاتے کہ بچے بھی ہنسنے لگتے یوں چند لمحوں میں ہی بچے ان سے قریب ہو گئے تھے پھر وہ خصوصاً تانیہ سے مخاطب ہوئے۔

"تانیہ بیٹا آپ کو کسی چیز سے ڈر تو نہیں لگتا؟" تانیہ باباجی کی بات سن کر جیسے کچھ سوچنے لگی اور پھر یونہی سوچتے ہوئے بولی۔

"جی بابا! مجھے رات خواب میں دکھائی دیتے مونسٹرز سے بہت ڈر لگتا ہے۔" تانیہ کی بات ختم ہوتے ہی یومنہ بھی باباجی کو بتانے لگی کہ تانیہ اکثر رات کو ڈر جاتی ہے اور میں نے بھی پچھلے چند روز پہلے تانیہ کے ساتھ پیش آئے واقعہ باباجی کے سامنے بیان کر دیا۔ باباجی ہماری باتیں سن کر مسکرائے اور پھر تانیہ سے بولے۔

"تانیہ بیٹا آپ تو بہت بہادر ہیں، آپ ایسے مونسٹرز سے لڑ سکتی ہو، آپ کو آیت الکرسی اور تیسرا کلمہ آتا ہے؟" باباجی کی بات سن کر تانیہ نے بنا کسی غلطی کے آیت الکرسی اور تیسرا کلمہ سنا دیا۔ باباجی نے تانیہ کے ننھے منے سے ہاتھوں پر بوسہ دیا اور پھر مٹھی بند کرتے ہوئے بولے۔

"اب آپ اپنی بند مٹھی پر پڑھی جانے والی آیات پھونکو اور یوں مٹھی سامنے مونسٹرز کی طرف کر کے کھول دو بس سارے مونسٹرز آپ سے ڈر کر بھاگ جائیں گے۔" باباجی کی باتیں سن کر تانیہ کے اعتماد میں بہت اضافہ ہوا جیسے اسے باباجی نے ایسا عمل بتادیا تھا کہ اب وہ بنا جادو کی چھڑی کے مونسٹرز سے لڑ سکتی تھی۔ یونہی باباجی کی سنگت میں وقت بیتنے کا احساس ہی نہیں ہوا جب میں نے محسوس کیا کہ اب ہمیں وہاں سے اٹھنا چاہیے تاکہ بابا آرام کر سکیں۔ یوں بچوں اور یومنہ کے ساتھ میں نے باباجی سے اجازت لی اور وہ ذرا استراحت کرنے کو لیٹ گئے۔

اگلے روز جب باباجی سب سے الوداعی ملاقات کر رہے تھے اور میں انہیں چھوڑنے کے لیے گھر کے بیرونی دروازے تک چلا گیا، وہ میرے ہمراہ چلتے ہوئے کسی گہری سوچ میں لگ رہے تھے۔ بیرونی دروازے سے باہر پہنچ کر وہ رکے اور مجھے ہدایت کرنے لگے کہ طٰہٰ اب گھر لوٹ جاؤ تمہارے ابا کو اس وقت تمہاری ضرورت ہے۔ باباجی کی کہی یہ بات سن کر میں ایک دم سے چونکا۔ پرانے درد اور

ان کی کسک پھر سے جاگ اٹھے تھے۔ میں مضطرب سا کھڑا نہ جانے کن لمحوں میں جا اترا تھا، جب بابا جی نے میرا دھیان بٹانے کے لیے میری بیٹی تانیہ کا ذکر چھیڑ دیا۔ وہ مجھ سے مخاطب تھے۔

"طٰہٰ میاں! تانیہ کا تمہیں خاص خیال رکھنا ہے تم اور یومنہ بیٹی یہ بات تو جانتے ہی ہو کہ وہ کوئی عام بچی نہیں اور ایسے انسان جن میں یہ خاص قابلیت پائی جاتی ہے وہ نہ صرف انسانوں کی توجہ کا باعث بنتے ہیں بلکہ کئی ماورائی قوتیں بھی ایسے انسانوں کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ کبھی اچھائی کی خاطر تو کبھی برائی پھیلانے کے لیے۔ اس بات کا خاص خیال رکھنا کہ جب تک تم پاکستان میں ہو، تانیہ کو کبھی پاکستان کے شمال مشرقی حصے میں نہ لے کر جانا بلکہ میں چاہوں گا کہ تم اسے لے کر جتنا جلد ہو سکے سعودی عرب لوٹ جاؤ۔" میں جو دم سادھے بے حس و بے حرکت کھڑا بابا جی کی باتیں سن رہا تھا۔ ان کی باتوں کا مفہوم سمجھ چکا تھا کہ وہ مجھے کیا سمجھانا چاہتے تھے۔ میں نے انہیں تانیہ اور اپنے باقی اہل و عیال کے لیے دعا کرنے کو کہا تو وہ مجھے ایک بار اپنے سینے سے لگا کر میرے ہاتھوں میں ایک رقعہ تھما کر چلے گئے۔ ان کے جانے پر میں وہیں کھڑا سوچ رہا تھا کہ ان میں اور میرے بابا رب نواز میں کس قدر مماثلت تھی۔ وہ بھی مجھے جب چھوڑ کر جایا کرتے تھے کچھ نہ کچھ سونپ جایا کرتے تھے۔ میں نے جھٹ سے وہ رقعہ کھولا اور میری متجسس نگاہیں جب رقعے پر درج تحریر پر پڑیں تو اس پر وہی پرانی عبارت درج تھی۔

"نفرت انسان سے نہیں بلکہ اس سے سرزد ہوئے گناہ سے ہونی چاہیے۔" یہ عبارت پڑھتے ہی میرے ذہن میں ایک ساتھ کئی جھماکے ہونے لگے۔

"یہ بات تو میں جانتا تھا۔۔۔ نہیں نہیں۔۔۔ ہر گز نہیں۔۔۔" میں اس عبارت کا مفہوم آج تک سمجھ ہی نہ پایا تھا اگر ایسا ہوتا تو پھر میں اپنے ابا کی اذیت دہ باتوں کو سہتا یوں حقیقت سے نگاہیں چرا کر گھر نہ چھوڑتا۔ برسوں یوں اپنوں سے کٹ کر نہ رہتا ایک اذیت میں انہیں مبتلا کر کے ایک اذیت خود بھی سہتا رہا اور یہی سوچتا رہا کہ میں ہی صحیح ہوں اگر وہ غلطی پر ہی تھے تو صحیح میں بھی نہ تھا۔

اگلے کئی روز تک میں اسی کشمکش میں مبتلا ماہی بے آب کی طرح تڑپتا سوچتا رہا کہ میں گھر لوٹوں تو آخر۔۔۔ لوٹوں کیسے۔ میں راتوں کو سجدوں میں پڑا روتا رہا، بلکتا رہا، تڑپتا رہا، سوہنے رب کے حضور گڑ گڑاتا رہا پھر رب سوہنے کو میرے تڑپنے پر رحم آ ہی گیا اور اس نے میری ساری مشکلیں آسان کر دیں۔

اگلے چند روز بعد ہی مصطفی عالم اور ماں میرے پاس گھر آ پہنچے انہیں میرے اس گھر کا پتا چچا مرزا نے دیا تھا اس روز وہ بڑا ہی رقت انگیز منظر تھا ماں کئی گھڑیوں تک مجھے، یومنہ اور بچوں کو چومتی اپنے سینے سے لگاتی رہی۔ مصطفی عالم بھی یوں برسوں بعد مجھ سے مل کر آبدیدہ لگ رہے تھے اور ان کی زبان بار بار ایک ہی کلمات دہرا رہی تھی۔

"طٰہٰ تجھے ہماری ذرا سی یاد نہیں آئی۔" میں ان کی ایسی باتوں کا بھلا کیا جواب دیتا میری آنکھوں کے ساغر ہی انہیں میری بپتا کے نغمے سناتے رہے۔ پھر ماں اور مصطفی عالم اسی گھڑی اپنے ساتھ لے جانے کے لیے اصرار کرنے لگے اور میں جو سر تا پا ان کی محبت میں

بھیگ رہا تھا اب اور دوری نہ سہہ سکتا تھا۔ میں جھٹ سے ان کے ہمراہ چلنے کو راضی ہو گیا تھا اور اسی روز میں یومنہ، بچے، مصطفیٰ عالم اور ماں گھر کی جانب چل پڑے۔

گاڑی محلہ مومن پورہ سے نکل کر شہر کی خاص شاہراہ پر رواں دواں تھی۔ چار سُو اچار گھنٹے کی طویل مسافت تھی اور ہماری گاڑی ابھی تک شہر کے سگنل پار کر رہی تھی۔ جب گاڑی ایک سگنل پر جا کر رکی تو جیسے میرے دل کی دھڑکن بے قابو ہونے لگی تھی۔ مسافت طویل منزل دور اور یہ تاخیر میرے درد اور اذیت کا سبب بن رہی تھی۔

جب سے ماں نے آ کر یہ بتایا تھا کہ ابا کی طبیعت بہت خراب ہے، میں ان سے ملنے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا۔ اپنے ابا کی خراب طبیعت کا سن کر میری نگاہوں کے سامنے وہی منظر بار بار آ جاتا تھا جب ہم نے آہوں اور سسکیوں میں اپنے بڑے ابا کو کھویا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میں ان برے خیالات سے پیچھا نہ چھڑا پا رہا تھا یکا یک سگنل کھلا تو مصطفیٰ عالم نے گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ آگے بڑھا دی۔ میں ان کے مقابل سیٹ پر ہی بیٹھا تھا اور ہمارے عقب میں ماں، بچے اور یومنہ بیٹھی تھی۔ سبھی خاموش تھے اور ہمارے عقب میں محلہ مومن پورہ اب کافی پیچھے رہ گیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا اور مجھے ابھی یہ کل ہی کی بات لگتی تھی برسوں پہلے جب بابا رب نواز نے میرے ابا خورشید عالم اور چچا مرزا کے درمیان دوری کو میرے اور یومنہ کے لگن سے مٹا ڈالا تھا اور خاندان برسوں بعد ماضی کی تلخیاں فراموش کر کے پھر سے ایک ہو گیا تھا۔

بڑے ابا کی کمی تو شدت سے محسوس رہتی تھی لیکن خاندان بھر کے پھر سے جڑ جانے اور چچا مرزا سے رشتہ اور گہرا مضبوط ہو جانے سے میرے ابا خورشید عالم بھی بے حد خوش تھے۔ میں نے ان کی سیاست میں بھی ان کے ہمراہ ایک وقت گزارا تھا، ان کی جائز، ناجائز کمائی کی پائی پائی کا حساب میں جانتا تھا اور پھر جب بابا رب نواز کی سنگت میں اس دنیا اور اس کی حقیقت کا ادراک ہوا تو اب میرا من چاہتا تھا کہ میں ابا سے کہوں کہ وہ ناجائز کمائی کو اپنے مال سے الگ کر دیں۔ مجھ میں اب اور سہنے کی قوت نہ تھی۔ میں ابا کو اس فانی دنیا کی طلب میں اس تباہی کی راہ پر گامزن نہ دیکھ سکتا تھا۔ روز میرے پاس ایسے کئی لوگ آتے جن سے مجھے معلوم پڑتا کہ شہر بھر کی فلاح و بہبود کے نام پر ملنے والا فنڈ ابا کی تجوریوں میں پہنچ چکا تھا اور ادھر شہر کی یہ حالت ہو رہی تھی کہ ناقص صفائی، کچرے اور غلاظت کے ڈھیر، نالیوں سے بہتا گندا پانی، خراب سیوریج سسٹم کی بدولت متعدد علاقوں میں وباء پھوٹنے کا خدشہ لگا تھا۔ اہلِ علاقہ کے مسکین اور غرباء کے لیے ملنے والی امداد ان تک نہ پہنچتی تھی۔

ایسا سب دیکھ کر میرا جی کڑھتا اور میرا من چاہتا کہ میں ابا کو بھی اسی راہ پر چلنے کی دعوت دوں جس راہ پر چلنے سے ہماری نجات وابستہ تھی۔ تو ایک روز ایسی ہی نیت سے میں ابا سے ملا وہ میری باتیں یوں سنتے رہے جیسے انہیں لامحالہ میری باتیں سننا پڑ رہی ہوں۔ یکا یک وہ اٹھے اور مجھے اتنا کہہ کر چلے گئے کہ وہ میری باتوں پر غور کریں گے۔ مجھے اس انداز سے ان کا یوں اٹھ کر چلے جانا معیوب لگ رہا تھا

لیکن میں بھی ہمت ہارنے والا کہاں تھا میں پھر سے اسی جستجو میں لگ گیا کہ مجھے کوئی مناسب موقعہ میسر آجائے تو میں ابا سے پھر سے بات کروں گا۔ ایک روز ایسا موقعہ میرے ہاتھ لگ ہی گیا۔

ایک روز میں عصر کی نماز ادا کر کے مسجد سے گھر پہنچا تو گھر داخل ہوتے ہی میری نظر ابا پر پڑی وہ لان میں پڑی کرسیوں اور میز پر بہت سی فائلیں پھیلائے بیٹھے تھے۔ میں دھیرے سے چلتا ان تک پہنچا اور ہولے سے سلام کرنے کے بعد ان کے نزدیک ہی ایک خالی نشست پر جا بیٹھا۔ انہوں نے میرے سلام کا جواب دیتے ہوئے یکبارگی سر اٹھا کر میری جانب دیکھا اور وہ پھر سے اپنے کام میں لگ گئے۔ میں ان کے سامنے بکھری کاروباری اور جائیداد کے اثاثوں کی فائلیں دیکھ کر سوچ رہا تھا کہ وہ یہ سب آخر کس کی خاطر کر رہے تھے اس قدر سخت تگ و دو دن رات کی سخت مشقت؟ کبھی اندرون ملک دور دراز تک کا سفر تو کبھی بیرون ممالک کاروبار کے سلسلے میں ان کا آنا جانا اگر وہ جائز و ناجائز کو پس پشت ڈال کر یہ سب اپنی اولاد کی خاطر کر رہے تھے۔ یہ سخت تگ و دو وہ ہماری خاطر کر رہے تھے تو وہ سراسر گھاٹے کا سودا کر رہے تھے۔

اپنی آخرت تو وہ تباہ کر ہی رہے تھے ساتھ ہی ساتھ وہ اپنی اولاد میں بھی غلاظت کے زہر کو بھر رہے تھے۔ اور مجھے جب سے رب سوہنے نے اپنی قدرت ثنائی سے یہ ادراک یہ آگاہی دلائی تھی، اب میں اپنے ابا کو اس راہ پر گامزن نہ دیکھ سکتا تھا انہیں خود کو اپنی اولاد کو ایسی تاریک راہوں میں بھٹکتا نہ دیکھ سکتا تھا۔ ایسا سوچتے ہوئے میں انہیں مخاطب کرنے ہی والا تھا جب میں نے محسوس کیا کہ وہ ابھی اپنے کام میں بے حد مصروف لگ رہے تھے میں چند لمحوں تک ان کے فراغت پانے کا انتظار کرتا رہا لیکن پھر انہیں کام میں مصروف دیکھ کر میں نے ان سے بات کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور وہاں سے چلنے کے لیے جیسے ہی اٹھا وہ جھٹ سے بولے۔

"بیٹھو طٰہٰ! کوئی خاص کام تھا۔" اتنا کہہ کر وہ پھر سے کام میں لگ گئے اور میں جو کہ ابھی اٹھ کھڑا ہوا تھا ان کے ایسا کہتے ہی پھر سے بیٹھ گیا اور میں بیٹھتے ہی سوچنے لگا کہ میں اب کی بار ابا سے صاف صاف لفظوں میں اپنے دل کی ساری بات کہہ دوں گا اور پھر میرے جذبات میری زبان سے لفظوں کی صورت میں عیاں ہونے لگے۔

"ابا۔۔۔ یہ دنیا اور اس کی یہ رونقیں تو عارضی ہیں۔ یہ روپیہ، پیسہ، دولت عزت، شہرت تو آنی جانی ہے۔ کام آئے گا تو فقط عمل اور جب تک سانس باقی ہیں عمل کرنے کا وقت بھی باقی ہے۔ ابا آپ وہ پیسہ الگ کر دیں جو آپ کا نہ تھا لیکن دنیا کی حرص نے آپ کے من میں اس کی رغبت دلائی اور آپ شیطان کے بہکاوے میں آ کر اسے اپنا دھن مان بیٹھے۔" اب کی بار میں نے ابا سے ذرا کھلے لفظوں میں بات کر ڈالی تھی میں نہیں جانتا تھا کہ ان کی شفقت پیار تو ایک طرف رشتوں کی بڑائی بھی ان کی نگاہ میں کوئی وقعت نہ رکھتی تھی۔ ان کے نزدیک دولت ہی سب سے بڑی طاقت تھی۔ یہ رشتے ناطے، یہ محبتیں سبھی اسی کے گرد گھومتے تھے۔ وہ میری باتیں سن کر سراسیمہ سا ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے ان کے چہرے کا رنگ لال پیلا ہو رہا تھا۔ شدید غصے کے عالم میں بھرائی ہوئی آواز میں بولے۔

"میں شیطان کے بہکاوے میں آچکا ہوں، میں شیطان بن چکا ہوں۔" اتنا کہہ کر انہوں نے اپنے سامنے رکھی فائلوں میں سے ایک فائل اٹھا کر زور سے ایک جانب اچھال دی۔

"بیگم باہر آکر سنو یہ تمہارا بیٹا جسے ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن مسجد جاتے نہیں ہوئے ملّا بنا میرے سر پر آن کھڑا ہوا ہے۔" ابا کے زور زور سے کہے الفاظ سن کر ماں، بھابھی، مصطفیٰ عالم اور گھر کے ملازم سبھی وہاں آجمع ہوئے تھے۔ ابا نے سامنے رکھی چند ایک اور فائلیں یوں ہوا میں اچھال دیں کہ میرے اطراف میں سینکڑوں صفحات فائلوں سے نکل کر اُڑ رہے تھے اور ابا کا غصہ تھا کہ بڑھتا ہی چلا جارہا تھا۔

"کئی روز سے جو میرا بیٹا مجھ سے کہنا چاہ رہا تھا آج وہ لفظ میری اولاد کی زبان پر آہی گئے۔ میں تو شیطان ہوں میں نے سارا حرام کا مال اکٹھا کر رکھا ہے۔ یہ سارا مال جائیدادیں میں نے حرام کی کمائی سے بنائی ہیں۔ تم اپنے دادا کی کمائی کو حرام کی کمائی کہہ رہے ہو اور میں نے جو اپنے ابا کی جائیداد پر دن رات لگا کر اسے بڑھایا پھیلایا ہے یہ سب کے لیے ہے۔ میں جو تم لوگوں کا معاشرے میں عزت و قار بنانے کی خاطر جٹا رہتا ہوں، میں تو شیطان ہوں ناں۔ ٹھ تم نے اپنے باپ کو خوب صلہ دیا، ایسی اولاد ہوتی ہے۔۔۔ ایسی اولاد نہیں چاہیے مجھے، میں کہتا ہوں جاؤ، جاؤ تمہیں جیسی زندگی گزارنا ہے تم آزاد ہو ہمیں چھوڑ دو ہمارے حال پر۔۔۔" ابا کی پُر خار باتیں سن کر بمشکل میں اپنے پیر زمین پر جمائے کھڑا تھا۔ میرا ذہن ماؤف ہو رہا تھا اور میرے ارد گرد جیسے تاریک آندھیاں چل رہی تھیں۔ ماں ابا کو سنبھالنے میں لگی تھی مصطفیٰ عالم، بھابھی، گھر کے ملازم مجھے متعجب نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ جب میری آنکھیں چھلک پڑیں۔ میں سمجھتا تھا ابا میری بات سنیں گے وہ جو یہ سب کر رہے تھے وہ سب ہمارے لیے ہی تو تھا اگر وہ اپنی اولاد کی خاطر مشقت میں پڑے تھے تو پھر میری ایسی باتیں بھی وہ دھیان لگا کر سنیں گے لیکن میری کھری واضح باتیں انہیں غلط محسوس ہو رہی تھیں، چبھ رہی تھیں۔ وہ حقیقت کا سامنا ہی نہ کرنا چاہتے تھے وہ میری باتوں کا مفہوم ہی نہ سمجھنا چاہتے تھے اور پھر ابا کی ایسی باتوں پر جو میری آنکھیں چھلک پڑیں تو میں بھرائی ہوئی آواز میں فقط اتنا ہی بول پایا تھا۔

"میں نہیں رہوں گا۔۔۔ میں ابھی اسی وقت یہاں سے چلا جاؤں گا۔" اتنا کہہ کر میں اپنے کمرے کی طرف بڑھنے کے لیے پلٹا تو میرے عقب میں یومنہ کھڑی تھی شاید وہ یہاں ذرا دیر سے پہنچی تھی اس کی زبان خاموش تھی لیکن اس کی نگاہوں میں اَن گنت سوال تھے اور میں اس کے سوالوں کے جواب دینے کی حالت میں نہ تھا۔ میں اسے یونہی ششدر کھڑا چھوڑ کر اپنے بھاری قدموں کو اٹھاتا آگے بڑھا جب مجھے میرے عقب سے ابا کی پھر سے آواز سنائی دی۔

"جاؤ میاں شوق سے جاؤ۔۔۔ دو چار دنوں میں جب آٹے دال کا بھاؤ پتا چل جائے تو بے شک لوٹ آنا۔" میں جو لمحہ بھر کو ابا کی بات سننے کے لیے رکا تھا تو پھر آخری بات سن کر اک پل مزید وہاں نہ ٹھہر سکا اور تیز تیز ڈگ بھرتا اپنے کمرے میں چلا آیا۔ کمرے میں پہنچ کر کمرے کے اطراف میں نظر دوڑاتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ وہاں ایسا کیا پڑا تھا جو میرا تھا جو میں اپنے ساتھ لے جا سکتا تھا۔

ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا جب یومنہ میرے عقب میں کمرے میں آ پہنچی تھی چند لمحوں تک وہ میرے عقب میں ہی خاموش کھڑی رہی اور میں بھی پلٹے بنا سوچ رہا تھا کہ کیا یومنہ میرے فیصلے پر راضی ہو گی۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا جب اس نے میرے عقب سے آکر اپنا سر میرے کندھے پر رکھا اور بولی۔

" طٰہ آپ یہی سوچ رہے ہیں ناں کہ آپ یہ بات مجھ سے کیسے کہیں کہ میں آپ کے ساتھ آ رہی ہوں یا نہیں تو سن لیں زندگی کے ہر موڑ پر میں آپ کے ساتھ ہوں۔ اگر آپ میرے ساتھ ہوں تو میں زندگی میں آئی ہر آزمائش سے لڑ سکتی ہوں۔" مجھے یومنہ کی بات سن کر اپنی قسمت پر رشک آ رہا تھا۔

ابا جو کہ شاید یہ سوچ رہے تھے کہ جو یہ ملّا بن بیٹھا ہے تو میرے ایسے رویے سے دلبر داشتہ ہو کر جائے گا بھی کہاں، اپنے سسرال، میرے بھائی مرزا کے ہاں چلا جائے گا مجھے کیا فرق پڑتا ہے وہ بھی تو اپنا ہی گھر ہے لیکن وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ میں اگر گھر سے ایک بار جانے کا ارادہ کر لوں گا تو پھر مجھے کسی کی کوئی ہمدردی کوئی مدد درکار نہ ہو گی۔ تب میں نے یومنہ کو اپنے ساتھ لیا اور گھر سے نکلتے ہوئے فقط وہ قلم اور برش اٹھائے جن سے میں اسلامک کیلی گرافی کیا کرتا تھا۔ میری جیب میں کچھ پیسے تھے جو پچھلے روز میرے چند فن پاروں کی فروخت پر ملے تھے۔

میں نے ادھورے کینوس بھی اپنے ساتھ اٹھائے اور گھر سے چل نکلا، ماں مصطفی عالم اور بابا عبد القادر ہمیں روکنے دروازے تک آئے لیکن میں ابا کی اس ظلمت سے بھری سلطنت میں ایک پل بھی اور نہ ٹھہرنا چاہتا تھا۔ میرا فیصلہ اٹل تھا اور دل میں گھر چھوڑنے کا ذرا ملال نہ تھا۔ اگر کلیجہ چھلنی ہوئے جا رہا تھا تو فقط اپنے ان رشتوں کو چھوڑنے کی وجہ سے جو مجھے جاتا دیکھ کر روکنے کے واسطے گھر کی چوکھٹ تک چلے آئے تھے۔ اتنے میں ایک رکشہ ہمارے پاس سے گزرا تو میں نے اسے رکنے کا اشارہ کیا رکشے کے رکتے ہی میں اور یومنہ اس میں سوار ہوئے تو رکشہ چل پڑا۔ میں اجنبی راستوں پر قدم بڑھا چکا اور یہ نہیں جانتا تھا کہ منزل کہاں ہے اور رکشے والا بھی متعدد بار پوچھ چکا تھا کہ ہمیں کہاں اترنا ہے اور میں بھی اسی کشمکش کا شکار تھا جب میرے دوست جمیل کی کال آ گئی اور میں نے اسے سب سچ سچ بتا دیا پھر اس کے اصرار پر میں اسٹیشن پہنچا اور سینکڑوں میلوں کی مسافت طے کر کے محلہ مومن پورہ چلا آیا۔

جمیل کے گھر آ کر جو اپنائیت اور پیار ملا ہمیں یہ احساس ہی نہیں ہوا کہ ہم کسی اجنبی کے گھر چلے آئے تھے لیکن میں جمیل اور اس کے اہلِ خانہ پر بوجھ نہ بننا چاہتا تھا میں نے چند روز گزرتے ہی ملازمت کے لیے جدوجہد شروع کر دی چند ہی روز کی جدوجہد سے مجھے ایک اخبار کے دفتر میں کتابت کی ملازمت مل گئی تو میں نے جمیل سے ضد کر کے اسی محلے میں ایک کرائے پر مکان لے لیا۔

اخبار کے دفتر سے واپسی پر میں گھر پہنچ کر کینوس پر اسلامی کیلی گرافی کرتا اور پھر جو فن پارے تیار ہو جاتے انہیں شہر کی مختلف دکانوں پر دے آتا تھا۔ چند ایک دکان دار حضرات ایسے بھی تھے جنہیں میرا کام بے حد پسند آیا اور وہ مجھ سے آرڈر پر بھی فن پارے بنوانے لگے تھے۔ یوں دشوار دن دھیرے دھیرے سہل دنوں میں ڈھلنے لگے تھے۔ میں جس محلے میں رہائش پذیر تھا اپنے

گردونواح میں بستے لوگوں کو دیکھتا تو میری ہمت اور بڑھ جاتی تھی۔ بابا علیم بھی ایسے ہی بلند حوصلہ باہمت انسان تھے۔ میں اکثر انہیں کہتا۔

"بابا آپ کے بچے بچیاں تو پڑھ لکھ کر اعلیٰ عہدوں پر فائز ہو چکے ہیں پھر آپ ابھی تک مسر چاول کیوں بیچتے ہیں؟" بابا جی میری باتیں سن کر مسکرا دیتے اور مجھ سے کہتے۔

"طٰہٰ بیٹا میں اگر اپنے پروردگار کا شکر ادا کرنا چاہوں تو میرے ایسے کئی جیون بھی کم پڑ جائیں۔ رب العزت کے مجھ پر اس قدر احسان ہیں اس نے مجھ جیسے معمولی انسان کو کیا کچھ نعمتیں عطا کر دیں۔ آج میری اولاد پڑھ لکھ کر اعلیٰ عہدوں پر فائز ہے میرے بچے بسا اوقات مجھے کہتے ہیں کہ ابا اب آپ ریڑھی نہ لگایا کریں لیکن میں اس بات کو ہرگز نہیں بھولتا کہ پہلے میں کیا تھا۔ میں آج بھی ریڑھی پر اس لیے مسر چاول بیچتا ہوں کہ روز مجھ سے سینکڑوں انسان فقط بیس روپے میں اپنا پیٹ بھر کھانا کھالیتے ہیں۔ مجھ ناچیز پر رب سوہنے کی شاید اس لیے اتنی رحمتیں ہیں۔" بابا علیم کی ایسی دل کو لگتی باتیں سنتے ہوئے میں اکثر اپنے اور یومنہ کے لیے بھی مسر چاول پیک کروالیا کرتا تھا اور جو ذائقہ ان کے مسر چاول میں ہوتا تھا وہ اکثر یومنہ بھی مجھ سے کہتی کہ میں بابا جی سے پوچھوں کہ وہ ایسا کیا شامل کر دیا کرتے تھے کہ خود یومنہ سے بھی ویسے چاول نہ بنتے تھے۔

یومنہ نے جس صبر اور حوصلے سے میرے سنگ وہ دن بتائے اور زبان سے ایک لفظ شکوے کا نہ نکالا تھا یہ شاید اسی صبر اور حوصلے کا پھل تھا کہ ایک روز اخبار کے دفتر میں ہی بیٹھے بیٹھے میں نے ایک اشتہار دیکھا جس میں سعودی عرب کی ایک فیکٹری جو "کسوا" خانہ کعبہ کا غلاف تیار کرتی تھی انہیں اسلامی کیلی گرافی جاننے والے ماہر کاریگر درکار تھے۔ میں نے اسی روز اخبار پر درج پتے پر فارم پر کر کے ارسال کر دیئے تھے میرے فارم ارسال کرنے کے چند روز بعد ہی مجھے انٹرویو کے لیے بلا لیا گیا تھا۔

سعودی عرب سے باقاعدہ ایک وفد آیا ہوا تھا جن میں شامل حضرات نے نہ صرف مجھ سے مختلف سوالات پوچھے بلکہ وہ کئی گھنٹوں تک مجھ سے قلم اور برش کے استعمال سے کیلی گرافی کا مختلف کام لیتے رہے۔ میں انٹرویو دینے کے لیے آتے ہوئے یومنہ سے کہہ آیا تھا کہ وہ میرے لیے دعائیں کرتی رہے پھر ضرور وہ قبولیت کی گھڑی رہی ہو گی کیونکہ وفد نے مجھے سلیکٹ کر لیا تھا۔

اگلے چند روز میں میں نے یومنہ اور اپنا پاسپورٹ بنوایا اور پاسپورٹ ملتے ہی چند ہی روز بعد ہم دونوں جدہ ائیرپورٹ جا اترے جہاں فیکٹری کی گاڑی پہلے سے ہمارے استقبال کے لیے کھڑی تھی۔ ہم دونوں گاڑی میں سوار ہوئے تو گاڑی ہمیں لے کر کمپنی کی طرف سے ملنے والی رہائش گاہ کی طرف چل پڑی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں کوئی سپنا دیکھ رہا ہوں، ابھی میری آنکھ کھل جائے گی اور میں اس سپنے کی حقیقت سے کوسوں دور محلہ مومن پورہ میں اپنے بستر پر سو رہا ہوں گا۔ میں اپنے ساتھ ہی بیٹھی یومنہ کی طرف متوجہ ہوا میری طرح جیسے اسے بھی یقین ہی نہ آ رہا تھا کہ ہم یوں چند روز میں ہی سعودی عرب آ پہنچیں گے اور وہ بھی ایسے کام پر مامور جو دنیا کے چند گنتی کے خوش نصیب لوگوں کے حصے میں ہی آتا ہے۔

اسی سال میں نے اور یومنہ نے پہلے حج کی سعادت حاصل کی اور اسی سال میرے ہی ہاتھوں میں تیاری سے گزرا "کسوا" خانہ کعبہ پر موجود تھا۔ خالص ریشم، سونے اور چاندی کے تاروں سے بنا کسوا جس پر نگاہ پڑتے ہی پتھر سے پتھر دل انسان بھی موم کی طرح پگھلنے لگتا ہے۔ دنیا جسے چھونے کے واسطے، جس کے ایک چھوٹے سے حصے کو پانے کے لیے تڑپتی ہے، سارا سال وہ ہمارے ہی ہاتھوں میں تیاری کے مراحل سے گزرتا تھا۔

لیکن اب وہ فقط ریشم و اطلس سونے و چاندی کے تاروں سے بنا کپڑا نہ رہا تھا۔ اب تو وہ قبلہ اول کی زینت تھا۔ پہلے وہ مٹی سے گوندھا آدم تھا جس میں ابھی روح نہ پھونکی گئی تھی جس میں زندگی کی کوئی رمق نہ تھی۔ وہ ایک مجسمہ تھا اور اب وہ ایک جیتے جاگتے آدم کی طرح بے مثال تھا جیسے آدمؑ کو تمام مخلوقات پر فوقیت دی گئی تھی، یونہی اب ریشم و اطلس سونے و چاندی سے بنے کسوا کو دنیا کے ہر کپڑے پر فوقیت حاصل ہو گئی تھی۔ اس میں بے پناہ نور بھر گیا تھا، ایسی زبردست مقناطیسیت، جذب پیدا ہو گیا تھا کہ نظر نہ ٹھہرتی تھی۔ دیکھتے ہی دل بے قرار ہو جاتا تھا اس پر مر مٹنے کو جی چاہتا تھا۔ اس میں کہیں جذب ہو جانے کو من کرتا تھا یونہی کسوا کو دیکھتے دیکھتے نہ مجھے اپنا ہوش رہا اور نہ ہی یومنہ ہوش میں لگ رہی تھی۔

"طٰہٰ۔۔۔ طٰہٰ چلیے ہم گھر پہنچ گئے ہیں۔" یومنہ کی آواز سن کر میں نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔ یکایک میرے گرد و نواح کا سارا منظر ہی بدل گیا تھا۔ میں خیالوں ہی خیالوں میں کہیں بہت دور نکل چکا تھا اور اب خیالوں کے دائرے سے نکلتے ہی میں یومنہ کی آواز سن کر گاڑی سے اترنے لگا۔ گاڑی سے اترتے ہی اپنے خاندان بھر کو سامنے منتظر کھڑا دیکھ کر میں خوشی کے عجب احساس سے سرشار وہیں کھڑا رہ گیا۔ وہیں کھڑے کھڑے میں نے ایک نگاہ اٹھا کر گھر کے در و دیوار دیکھے جہاں میں نے اپنی حیات کے کئی دور دیکھے تھے۔

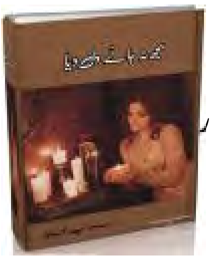
طٰہٰ۔۔۔ اب چلیئے ناں سب آپ سے ملنے کے لیے بے تاب کھڑے ہیں۔" سبھی آگے بڑھ چکے تھے، جب یومنہ نے پلٹ کر مجھ" سے کہا۔ میں وہیں گاڑی کے پاس کھڑا تھا، میں نے یومنہ کی بات سن کر یکبارگی اس کی جانب دیکھا وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی جیسے کہہ رہی ہو طٰہٰ اب سب ٹھیک ہو جائے گا، آپ قدم تو بڑھایئے میں تو ہر قدم پر آپ کے ساتھ ساتھ ہوں۔

میں نے یومنہ کے ہمراہ آگے بڑھتے ہوئے دیکھا تو چچا مرزا کا سارا خاندان، بھابھی، بابا عبد القادر، مائیکل اور دو ایسے نوجوان سامنے کھڑے تھے، جنہیں فی الوقت میں پہچان نہ پایا تھا۔ چچا مرزا نے والہانہ انداز میں آگے بڑھ کر مجھے اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔ چچی یومنہ سے ملتے ہوئے رو پڑی تھیں، بھابھی کی بھی ایسی ہی حالت ہو رہی تھی۔ میں فرزند اور دلدار سے مل کر آگے مائیکل کی طرف بڑھا وہ اپنے ہاتھوں سے اپنے چہرے پر بہتے آنسوؤں کو پونچھ رہا تھا تو بابا عبد القادر تو ایسا بھی نہ کر پائے وہ بے حد ضعیف اور کمزور ہو چکے تھے۔ ان کے برابر میں ہی دو نوجوان چپ چاپ کھڑے یہ سارا منظر دیکھ رہے تھے مجھے ان کی طرف متوجہ پا کر مصطفیٰ عالم آگے آئے اور کہا۔



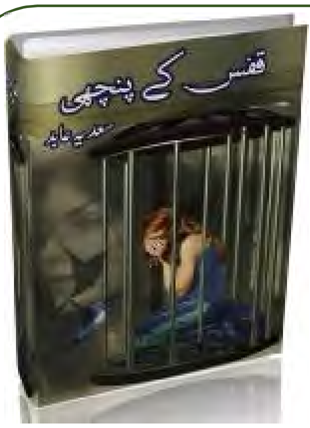
عہدِ وفا

ایمان پریشے کا پاک سوسائٹی کے لیے لکھا گیا مُنفرد ناول، مُحبت کی داستان جو معاشرے کے رواجوں تلے دب گئی، پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں۔



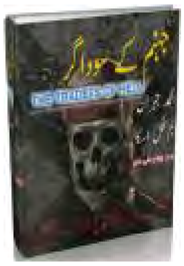
بُجھ نہ جائے دِل دیا

سعدیہ عابد کا پاک سوسائٹی کے لیے لکھا گیا شاہکار ناول، مُحبت، نفرت، عداوت کی داستان، پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں۔



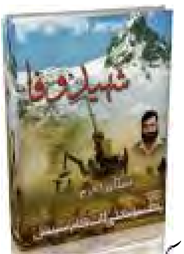
قفس کے پنچھی

سعدیہ عابد کا پاک سوسائٹی کے لیے لکھا گیا شاہکار ناول، علم و عرفان پبلشرز لاہور کے تعاون سے پاکستان انٹرنیشنل بک فیئر میں (3 تا 7 اگست 2017)، **کتابی شکل** میں جلوہ افروز ہو رہا ہے، خریدنے کے لئے تشریف لائیں۔ آن لائن پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں۔



جہنم کے سوداگر

مُحمد جبران (ایم فِل) کا پاک سوسائٹی کے لیے لکھا گیا ایکشن ناول، پاکستان کی پہچان، دُنیا کی نمبر 1 ایجنسی آئی ایس آئی کے اسپیشل کمانڈو کی داستان، پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں۔



شہیدِ وفا

مُسکان احزم کا پاک سوسائٹی کے لیے لکھا گیا ناول، پاک فوج سے مُحبت کی داستان، دہشت گردوں کی بُزدلانہ کاروائیاں، آرمی کے شب و روز کی داستان پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں۔

آپ بھی لکھیے:

کیا آپ رائٹر ہیں؟؟؟۔ آپ اپنی تحاریر پاک سوسائٹی ویب سائٹ پہ پبلش کروانا چاہتے ہیں؟؟؟

اگر آپکی تحریر ہمارے معیار پر پُورا اُتری تو ہم اُسکو عوام تک پہنچائیں گے۔ مزید تفصیل کے لئے یہاں کلک کریں۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام، پاکستان کی سب سے زیادہ وزٹ کی جانے والی کتابوں کی ویب سائٹ، پاکستان کی ٹاپ 800 ویب سائٹس میں شُمار ہوتی ہے۔

"طٰہٰ! انہیں ذرا پہچانو تو یہ کون ہیں؟" مجھ سے بھی نکلتا قد، گوری اجلی رنگت کچھ کچھ میرے ہی جیسے تھے اور اب میری طرف دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔

"رومی اور صائم میاں۔۔۔" میں نے بے ساختہ آگے بڑھ کر دونوں کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا تھا اور اب سبھی ہمارے بچوں تانیہ اور ایان سے مل کر بے حد خوش دکھائی دے رہے تھے اور بچے حیرت سے کبھی ہمیں یوں سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگتے جیسے پوچھ رہے ہوں کہ یہ اتنے سارے ہمیں پیار دینے والے لوگ پہلے کہاں تھے؟

یونہی چند لمحوں تک سبھی سے مل کر ہم ابا کے کمرے کی طرف بڑھے، کمرے میں پہنچتے ہی چچا مرزا نے رقت آمیز جذبات سے ابا کو پکارا۔

"اٹھ جا خورشید عالم! دیکھ تیرا بیٹا، بہو بچے سارے تجھ سے ملنے آئے ہیں۔" میں اور یومنہ ابا کے سرہانے کھڑے ہو گئے وہ گہری نیند میں لگ رہے تھے۔ ابا کے پاس موجود نرس نے بتایا کہ چند لمحوں پہلے ہی اس نے ابا کو نشہ آور انجکشن دیا تھا تا کہ وہ کچھ دیر تک آرام کر سکیں۔ انہیں ایسی حالت میں دیکھ کر میں اور یومنہ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ پائے تھے۔ میں ابا سے ذرا قریب ہوا اور دھیرے سے انہیں پکارنے لگا۔

"دیکھو ابا آپ سے ملنے کون آیا ہے؟ تانیہ بیٹا، ایان ادھر آؤ دیکھو یہ تمہارے دادا جان ہیں۔ ابا۔۔۔ اٹھیے تانیہ اور ایان آپ سے ملنے آئے ہیں۔" ایسا دیکھ کر مصطفیٰ عالم میرے قریب آئے اور مجھے تسلی دینے لگے۔

بھابھی، بچوں اور یومنہ کو لے کر کمرے سے چلی گئیں جب یومنہ کے کمرے سے نکلنے سے پہلے میں نے اسے وہی کالی چادر لانے کو کہا جو اب بابا رب نواز کی نشانی تھی، کمرے سے جانے کے چند لمحوں بعد ہی یومنہ نے وہ چادر بابا عبد القادر کے ہاتھ بھجوا دی تھی۔ ان کے ہاتھ سے چادر لیتے ہوئے میں نے دیکھا ان کے ہاتھوں میں رعشہ طاری تھا وہ بے حد کمزور ہو چکے تھے۔ میں نے ان سے ابا کی صحت کے لیے دعا کرنے کو کہا اور وہ ڈھیروں دعائیں کرتے کمرے سے چلے گئے۔

بابا عبد القادر کے کمرے سے نکلتے ہی میں نے ہاتھ میں موجود چادر ابا پر پھیلا دی اور خود جائے نماز بچھا کر ابا کی صحت اور درازیٔ عمر کے لیے دعائیں کرنے لگا ابا کو کوئی جسمانی بیماری نہ تھی۔ وہ ڈپریشن کا شکار تھے۔

ماں بتاتی ہے کہ ایک روز وہ رات کے کسی پہر خود ہی اٹھ کر چلانے لگے تھے کہ ان پر کسی نے گولی چلائی ہے۔ اس رات انہوں نے کوئی خوفناک خواب دیکھا تھا۔ بس اسی خواب نے انہیں بستر سے جا لگایا تھا۔ وہ بستر پر پڑے خود ہی اعتراف کرنے لگے تھے کہ انہوں نے طٰہٰ اپنے بیٹے پر بڑا ستم ڈھایا، لوگوں کے ساتھ بڑی ناانصافیاں کیں نہ جانے وہ کیا کیا بولتے رہتے تھے۔ میں آج اپنے انہی ابا کی صحت اور درازیٔ عمر کے لیے روتے گڑگڑاتے رب سوہنے کے حضور دعائیں کر رہا تھا۔ کوئی گھڑی قبولیت کی گھڑی ثابت ہوتی

ہے۔ اللہ نے میری اس گھڑی مانگی دعائیں سن لی تھیں۔ میں نے ابا کی آواز سن کر ایک طویل سجدے سے اپنے سر کو اٹھایا وہ مجھے ہی پکار رہے تھے۔ میں جھٹ سے اٹھ کر ان کے قریب جا پہنچا۔

"طٰہٰ بیٹا! تم آ گئے میں نے تمہارے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ بیٹا میں نے تمہاری بات سن کر اسے سمجھنے کی بجائے سارا زور تمہیں غلط ثابت کرنے پر لگا دیا۔ جیسے میں سوچتا تھا کہ میری اپنی اولاد آج مجھے سمجھانے چلی ہے کہ کیا غلط ہے اور کیا صحیح۔ یہ حق تو صرف ماں باپ کے پاس ہوتا ہے کہ وہ اپنی اولاد کو سمجھائیں لیکن میں غلط تھا بیٹا! تمہاری ہر بات درست تھی۔" میں خاموشی سے ابا کی باتوں کو سنتا رہا اور پھر جو وہ خاموش ہوئے تو اب میری باری تھی۔

"ابا۔۔۔ وہ رب العزت ہمیں کئی طرح سے آزماتا ہے ہم پر آن پڑی آزمائش بھی اس کی رحمت کی ایک کڑی ہوتی ہے۔ دنیا کے گورکھ دھندوں میں پھنسے ہم جو اسے بھلا بیٹھتے ہیں تو خود پر آن پڑی مصیبت پر کیسے بلبلا اٹھتے ہیں۔ تب جو ہمیں اس مصیبت سے نجات کی کوئی راہ دکھائی نہیں پڑتی تو فقط ایک ہی ذات ہوتی ہے جو ان دشوار گزار راہوں میں ہمارا سہارا بنتی ہے۔ ہم جو پھر دنیا جہاں کو بھلا کر اس سے اپنی لو لگاتے ہیں تو اس کی رحمت آسمانی بجلی سے بھی کئی ہزار گنا تیزی سے ہماری جانب بڑھتی ہے۔ ابا اللہ سے لو لگا لو اسی میں نجات ہے۔" میں اتنا کہہ کر خاموش ہو چکا تھا۔

کمرے میں مہیب سناٹا چھایا ہوا تھا جب ایک دم سے ابا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے اور میں بھی انہیں چپ کراتے ہوئے ان کے ہاتھوں کو تھامے روتا رہا پھر میں انہیں آرام کرنے کو کہتا رہا لیکن وہ یومنہ اور بچوں سے ملنے کے لیے بضد تھے میں کچھ دیر تک یومنہ اور بچوں کو ان کے پاس لے آیا اور برسوں بعد وہ یومنہ اور بچوں کو دیکھ کر ایک بار پھر سے آبدیدہ ہو گئے تھے۔

اگلے چند روز میں ابا کی طبیعت میں تیزی سے بہتری آ رہی تھی۔ میں اور یومنہ ہمہ وقت ان کی تیمارداری کے لیے موجود رہتے تھے۔ دن کے کسی حصے میں ہم تانیہ اور ایان کو بھی ان کے پاس لے آتے تھے۔ یوں بچوں کے ساتھ ان کا دل بہل جاتا تھا پھر میرے ساتھ تو وہ اپنے دل کا بوجھ اتارتے ہی رہتے تھے۔ چند ہی روز میں وہ خود چلنے پھرنے کے قابل ہو گئے تھے پھر ایک روز جو میں نے عصر کی باجماعت نماز میں سلام پھیرا تو میرے عقب میں ہی ابا بھی نماز کی ادائیگی کے لیے وہاں موجود تھے۔ یہ دیکھ کر میں نے اپنے رب سوہنے کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ ان کا دل بھی مسجد میں لگنے لگا تھا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے ابا پانچوں وقت کے نمازی پرہیز گار بن گئے۔

لیکن جیسے چند ہی روز میں ان کی طبیعت میں ایسی تبدیلی رُونما ہوئی تھی ویسے ہی دھیرے دھیرے جب ان کی طبیعت بالکل سنبھل گئی تو پھر سے پہلی مصروفیت ان کے گرد رہنے لگی۔ ایک ڈیڑھ ماہ بعد میں نے محسوس کیا کہ وہ پھر سے واپس اسی ڈگر پر لوٹ آئے تھے۔

یومنہ اور بچے جب سے یہاں آئے تھے وہ بھی بے حد خوش تھے میں جانے بوجھے ان سے جو محلہ مومن پورہ واپسی کی بات کرتا تو ان کا پُرزور احتجاج دیکھنے کو ملتا تھا۔ ایک روز میں نے یومنہ اور اسے بچوں کو تیار کرنے کو کہا وہ مجھ سے دریافت کرنے کی کوشش کرتی رہی کہ میں انہیں کہاں لے جانا چاہتا ہوں۔ لیکن میں نے ان سے یہ بات چھپائے رکھی۔ یومنہ اور بچے میرے ساتھ گاڑی میں بیٹھے تو میں نے گاڑی آگے بڑھادی۔ راستہ بھر بچے بھی مجھ سے دریافت کرتے رہے کہ "پپا ہم کہاں جارہے ہیں؟" لیکن بچوں سے بھی میں نے یہ بات چھپائے رکھی۔ میں مضطرب گم صم سا تھا اور گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے چاہتا تھا کہ اس لمحے کوئی مجھ سے کسی قسم کا سوال جواب نہ کرے۔

شہر کی بارونق شاہراہ پر گاڑی دوڑاتے ہوئے مجھے ایک ڈیڑھ گھنٹہ ہو رہا تھا جب میں نے گاڑی شہر کے بڑے جیل خانہ سے باہر روک دی۔ گاڑی سے اترتے ہوئے یومنہ نے جیل کے بڑے سے بیرونی دروازے کی جانب دیکھا، حیرانی اور تجسس سے پھر وہ مجھے دیکھتی رہی لیکن اس نے کوئی سوال نہیں پوچھا۔ میں چپ چاپ یومنہ اور بچوں کو لے کر جیل میں داخل ہوا اور انہیں لے کر اس کمرے میں جا پہنچا جہاں لوگ قیدیوں سے ملاقات کرتے تھے۔ وہاں گہرے سناٹے اور عالم اداسی میں بیٹھے ہمیں فقط چند لمحے ہی بیتے تھے کہ ہمارے سامنے خالی پڑے سلاخوں والے کمرے کا اندرونی دروازہ کھلنے کی کربناک آواز گونجی۔ یہ آواز سنتے ہی مجھ سمیت یومنہ اور بچے بھی یوں اچھل کر اپنی نشست سے اٹھ کھڑے ہوئے جب عبیرہ قیدیوں کی وردی میں ملبوس ہماری جانب بڑھی۔

"عبیرہ دیکھو آج میں نے تم سے کیا اپنا عہد پورا کیا۔ یہ یومنہ ہے اور ان سے ملو یہ ہمارے بچے تانیہ اور ایان ہیں۔ تانیہ بیٹا یہ تمہاری عبیرہ آنٹی ہیں۔"

"لیکن طٰہٰ! عبیرہ یہاں کیسے۔۔۔؟" یومنہ نے یوں حیرت سے میرا اور عبیرہ کا منہ تکتے ہوئے کہا لیکن یہ لمبی کہانی تھی میں فی الفور اس کے اس سوال کا جواب نہ دے سکتا تھا۔ عبیرہ نے ہاتھ بڑھا کر یومنہ سے مصافحہ کیا عبیرہ کا بس نہیں چلا کہ وہ آہنی سلاخوں کو توڑ کر یومنہ کے قریب کھڑے بچوں کو اپنے سینے سے لگا لیتی۔ وہ بچوں کے ہاتھوں کو تھامے آبدیدہ لگ رہی تھی۔

کوئی چند گھڑیاں ہی ہمیں یوں عبیرہ سے ملنے کو ملیں جب مجھے آواز سنائی دی کہ ملاقات کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ ناچاہتے ہوئے بھی ہمیں عبیرہ کو وہیں جیل کی آہنی سلاخوں کے پیچھے چھوڑ کر باہر آنا پڑا۔ ہم لوگ جیل سے نکلے، گاڑی میں بیٹھے اور میں نے گاڑی واپس گھر کی جانب بڑھادی۔ میری طرح یومنہ بھی چپ چاپ بیٹھی تھی لیکن تانیہ بول رہی تھی۔

"پاپا! آنٹی جیل میں کیوں بند ہیں، وہ ہمارے ساتھ کیوں نہیں آئیں۔ پاپا لوگوں کو جیل میں کیوں بند کرتے ہیں؟"

"تانیہ چپ ہو جاؤ۔ یومنہ نے غصے سے کہا تو تانیہ خاموش ہو گئی۔

"تانیہ بیٹا! آپ ابھی بہت چھوٹی ہو، آپ کو یہ باتیں سمجھ نہیں آئیں گی۔" میں نے یومنہ کو تانیہ کو ڈانٹتے سنا تو اسے سمجھایا یوں گھر پہنچنے تک باقی کا سارا راستہ ہم خاموش رہے۔

گھر اپنے کمرے میں پہنچ کر یومنہ نے تانیہ اور ایان کو باہر کھیلنے کو بھیج دیا اور وہ مجھ سے تھوڑا قریب آ بیٹھی۔

"طٰہٰ! میں یہاں تک تو جانتی ہوں کہ عبیرہ اور داؤد آپ کو بے یار و مدد گار چھوڑ کر فرار ہو گئے تھے پھر آپ نے عبیرہ سے ملنے کی کوشش بھی کی لیکن وہ آپ سے ملنا ہی نہ چاہتی تھی۔ عبیرہ اور داؤد ایک دوسرے کے بے حد قریب آ چکے تھے۔ ایسے میں عبیرہ سے ایسا کیا فعل سرزد ہوا کہ اسے جیل جانا پڑا۔ طٰہٰ مجھے جاننا ہے، آخر یہ کیا پہیلی ہے۔" یومنہ کا یہ سوال اور اس کا تجسس مجھے بھی اکسانے لگا تھا اور میرے ذہن میں عجب سی اتھل پتھل سی ہونے لگی تھی۔ میں یومنہ کو عبیرہ کی زندگی کے اس باب سے آگاہ کرنے کے لیے وہ کڑی ڈھونڈ رہا تھا جہاں سے میں عبیرہ کی ادھوری کہانی بیان کر سکوں ایسا سوچتے ہوئے میں نے جیسے ہی اپنے ذہن پر زور ڈالا میرے ذہن کی سلولائیڈ پر برسوں پہلے کے مناظر پھر سے ابھرنے لگے تھے۔

اس روز میں گھر پر ہی موجود تھا جب بابا عبدالقادر میرے پاس ایک بند لفافہ لے کر آئے وہ ابھی ابھی ڈاکیا میرے نام دے کر گیا تھا۔ لفافے کی پشت پر بھیجنے والے کا کوئی اتا پتا نہ تھا۔ بابا عبدالقادر کے جانے کے بعد میں نے اس بند لفافے کو کھولا اس میں سے ایک ڈائری برآمد ہوئی۔ میں نے جھٹ سے ڈائری کو کھولا اس کے پہلے صفحے پر ہی ایک عبارت درج تھی۔

"میں تمہاری گناہ گار ہوں طٰہٰ! ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔ عبیرہ!" میں نے جھٹ سے ڈائری کا اگلا صفحہ کھولا جس کے اگلے صفحے پر درج تھا طٰہٰ جب آپ یہ ڈائری پڑھ رہے ہوں میں اس دنیا کو چھوڑ کر آپ سے بہت دور جا چکی ہوں گی، میں نے اقبال جرم تو کیا تھا لیکن یہ میری سب سے بڑی غلطی تھی۔ میں جیل کی سلاخوں کے پیچھے بند اپنی زندگی کے سولہ سال قید بامشقت نہیں گزار سکتی۔ اسی لیے میں اپنی زندگی کا خاتمہ ہی کرنے جا رہی ہوں۔" اتنا پڑھتے ہی میں نے تیزی سے ڈائری کے اگلے صفحات پلٹنا شروع کیے اور میں بنا رکے پڑھتا چلا گیا۔

"داؤد ہمیں طٰہٰ کو یوں بے یار و مدد گار چھوڑ کر نہیں چلے آنا چاہیے تھا، تم واپس پلٹ سکتے تھے اسے اپنے ساتھ لے جا سکتے تھے۔"

"تمہیں کہا نا عبیرہ! میں اس موضوع پر مزید کچھ نہیں سننا چاہتا جیسے تم طٰہٰ کے گولی چلانے پر خوفزدہ ہو گئی تھی یونہی میں بھی ڈر گیا تھا اور پھر اچھا ہی ہوا نا اسے ساتھ لیتے تو ہم کسی بڑی مصیبت میں پھنس جاتے۔ یونہی خوامخواہ میں بدنامی سر لینا پڑتی۔ چلو میں تمہیں کسینو لے کر چلتا ہوں آج بہت سا مال بنائیں گے اور پھر ہنی مون کے لیے سنگاپور چلیں گے۔" داؤد نے عبیرہ کو ساتھ لیا اور وہ کسینو جا پہنچا اس کا کسینو جانا اس کا بدترین دن ثابت ہوا وہ شراب بھی پیتا رہا اور پیسہ بھی ہارتا رہا۔ جب اس کی جیب خالی ہو گئی تو وہ اپنی ہار برداشت نہ کر سکا لیکن اب وہ سوچنے لگا کہ وہ ایسا کیا کر سکتا ہے کہ کسی طرح سے اسے اپنا پیسہ واپس مل جائے اس نے پاس کھڑی عبیرہ کی جانب دیکھا اور پھر اس کا بازو تھام لیا اور بازو کو اوپر کرتے ہوئے اس نے عبیرہ کی بازی لگا دی۔ عبیرہ نے سنا کوئی دس ہزار کی آواز لگا رہا تھا، کسی نے بیس ہزار کی آواز لگائی تو کوئی ذرا پاس آ کر اس کے گرد گھوم کر پچاس ہزار با آواز بلند پکار رہا تھا۔

اسے داؤد سے ایسی کسی بے ہودہ حرکت کی توقع نہ تھی۔ وہ ایسی گری ہوئی حرکت بھی کر سکتا تھا اس نے غضب ناک ہو کر داؤد کو پکارا۔

"داؤد چھوڑو میرا بازو۔۔۔"لیکن داؤد نے اس زور سے اس کی کلائی کو تھام رکھا تھا کہ داؤد کے ہاتھ کی انگلیاں اسے اپنے نرم و نازک بازو میں پیوست ہوتی محسوس ہو رہی تھیں۔ اس نے اگلے ہی پل اس زور سے طمانچہ داؤد کے چہرے پر رسید کیا کہ وہ ہل کے رہ گیا۔ عبیرہ کے طمانچہ کی ایسی گونج تھی کہ کسینو میں چل رہے میوزک کے سوا سبھی لوگ اپنی جگہ جامد و ساکت ہو کر رہ گئے۔

داؤد نے عبیرہ کا بازو چھوڑا وہ اپنے پیروں پر لڑکھڑا سا گیا تھا۔ نشے میں دھت اس نے ایک ہاتھ سے اپنے سر کو ذرا سا تھامنے کی کوشش کی جب اس نے دوبارہ سے آنکھیں جھپکاتے ہوئے سامنے دیکھا تو عبیرہ وہاں سے جا چکی تھی۔ اس روز گھر پہنچ کر عبیرہ ساری رات روتی رہی اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ داؤد جس کی خاطر اس نے طٰہٰ کو چھوڑ دیا تھا وہ ایسی بے ہودہ حرکت بھی کر سکتا تھا۔ اگلے روز جب وہ اپنے کمرے میں ہی پڑی تھی۔ اس کے کمرے کا دروازہ تیزی سے کھلا اور داؤد غضب ناک حالت میں کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی پلٹ کر دروازہ لاک کر دیا اور پھر اس سے پہلے کہ عبیرہ اپنے بستر سے اٹھتی اس نے وہیں بستر پر پہنچ کر عبیرہ کو بالوں سے دبوچ لیا۔

"تمہاری یہ جرأت تم نے میرے دوستوں کے سامنے مجھے تھپڑ دے مارا۔" ایسا کہتے ہوئے اس نے زور دار تھپڑ عبیرہ کو رسید کیا کہ وہ بستر پر جا گری۔ داؤد نے اسے پھر سے بالوں سے دبوچ لیا۔ "تم کیا سمجھتی ہو میں تم سے پیار کرتا ہوں، میں تیری جیسی کم ذات سے شادی کروں گا۔ میرا مقصد تو صرف تمہیں طٰہٰ سے دور کرنا تھا اور اس رات طٰہٰ کے ہاتھوں ہونے والے قتل نے میرا کام اور بھی آسان کر دیا تھا اور اب تمہارا طٰہٰ تو گیا۔۔۔" داؤد آخری بات کہتے ہوئے زور زور سے قہقہے لگانے لگا جیسے وہ پاگل ہو چکا تھا۔ ایک دم وہ پھر سے بولا۔

"اب اگر تمہیں میری ہو کے رہنا ہے تو صرف ایک ہی راستہ ہے کہ میری رکھیل بن کر رہو۔ اب طٰہٰ تو تمہیں قبول کرے گا نہیں۔" داؤد کے منہ سے سچ سن کر عبیرہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا رکھا تھا اور وہ زار و قطار روئے جا رہی تھی۔ داؤد نے اس کے قریب ہی کھڑے ہو کر ایک دو دھمکیاں دیں اور جیسے ہی وہ کمرے سے باہر نکلنے کے لیے پلٹا تو اسے اپنے عقب میں عبیرہ کی آواز سنائی دی۔

"رک جاؤ داؤد۔۔۔" داؤد عبیرہ کی آواز سن کر پلٹا اور پھر جیسے اس کے پیروں تلے سے زمین ہی نکل گئی۔ عبیرہ اس پر ریوالور تانے کھڑی تھی۔

"نن۔۔۔ نن۔۔۔ نیچے رکھ دو اسے عبیرہ!" عبیرہ یہ سن کر چلائی۔

"وہیں رک جاؤ داؤد۔۔۔" داؤد جو ایک قدم آگے بڑھا تھا۔ عبیرہ کے ہاتھ کی انگلیوں کو ریوالور کے ٹریگر پر پیوست دیکھ کر وہیں رک گیا۔

"مجھے غم اس بات کا نہیں کہ تم نے مجھے دغا کیوں دیا؟ غم تو اس بات کا ہے کہ میں نے تمہاری وجہ سے طٰہٰ کو کھو دیا۔ جب اسے میری ضرورت تھی تب میں اسے تمہاری خاطر دھتکارتی رہی۔ تم نے ہی مجھ سے کہا تھا ناں کہ تم مجھ سے بے پناہ محبت کرتے ہو، میرے بغیر تم زندگی کا تصور ہی نہیں کر سکتے۔ تمہاری ایسی باتیں سن کر میں سوچتی تھی کہ اگر کوئی مجھ سے کہے کہ میں طٰہٰ کے بغیر رہ سکتی ہوں تو میرے لیے ایسا نا ممکن تھا۔ میں طٰہٰ کے بغیر جینے کا تصور بھی نہ کر سکتی تھی لیکن پھر میں تمہیں بھی مرتا نہ دیکھ سکتی تھی۔ میں نے سوچا طٰہٰ کی زندگی میں تو راحت کی محبت بھی تھی لیکن اگر میں نے تمہیں انکار کر دیا تو کہیں تم ایسا ویسا قدم نہ اٹھا لو۔۔۔ صرف تمہاری خاطر میں طٰہٰ کو خود سے دور کرنے کے لیے کیا کیا جتن کرتی رہی، اسے نظر انداز کرتی رہی وہ میرے گھر مجھ سے ملنے آتا تو میں ملازم سے کہہ دیتی کہ وہ طٰہٰ سے کہہ دیا کرے کہ میں گھر پر نہیں ہوں۔ لیکن میں جانتی تھی کہ آخر ایسا کب تک چلے گا۔ ایک روز وہ جان جائے گا کہ میں گھر پر ہی ہوں اور ملازم میرے کہنے پر ہی اس سے جھوٹ بولتا رہا ہے۔ پھر ایک روز وہ میرے کمرے تک آن پہنچا میں نے یونہی فون کان سے لگایا اور با آواز بلند ایسا ظاہر کرتی رہی جیسے میں داؤد تم سے باتیں کر رہی تھی کہ طٰہٰ کو مجھ سے نفرت ہو جائے وہ میری طرف سے بددل ہو جائے مجھے بے وفا سمجھ کر بھول جائے۔ اس رات میں ایسا کرنے کے بعد دیر تک خود بھی روتی رہی تھی میں جانتی تھی کہ طٰہٰ بھی میری باتیں سن کر دوسری طرف بیٹھا آنسو بہا رہا ہو گا۔ میری باتیں اس کے دل پر زہر میں بجھے ہوئے تیر کی طرح چلی ہوں گی۔ میں ایسا صرف اس لیے کرتی رہی داؤد کہ کہیں تمہارا دل نہ ٹوٹے، کہیں تم اپنی محبت کو کھو دینے کے غم سے اپنی زندگی نہ کھو دو اور تم نے کیا کیا۔۔۔؟ اتنا بڑا دھوکا دیا مجھے۔۔۔ تم مجھے اپنی رکھیل کیا بناؤ گے میں تمہارا نام و نشان مٹا دوں گی۔۔۔ داؤد۔۔۔" آخری بات کہنے تک عبیرہ پسینے سے شرابور ہو چکی تھی اس کی نگاہوں سے بدلے کی آگ برس رہی تھی۔

"رک جاؤ عبیرہ۔۔۔ رک جاؤ۔۔۔" داؤد کے منہ سے یہ الفاظ دوبارہ ادا ہوئے اور ڈز کی آواز کے ساتھ ہی تیسری بار الفاظ جیسے اس کے حلق میں ہی اٹک گئے تھے۔

عبیرہ کی ڈائری میں اس کی زندگی کی اس حقیقت کو جان کر مجھے اس سے ہمدردی ہونے لگی تھی۔ داؤد نے واقعی اس کے ساتھ بہت بڑی ناانصافی کی تھی جس کی سزا اس نے خود اسے اپنے ہاتھوں سے دے ڈالی تھی لیکن اب وہ خود کے ساتھ بہت بڑا ظلم کرنے جا رہی تھی۔

جیل پہنچ کر مجھے معلوم پڑا کہ عبیرہ نے واقعی خودکشی کی کوشش کی تھی لیکن اسے بچا لیا گیا تھا۔ وہ ایک سرکاری اسپتال میں ایڈمٹ تھی میں وہاں پہنچا تو مجھے دیکھتے ہی اس نے اپنا چہرہ چھپا لیا۔

میں اس کے قریب جا بیٹھا اور سوچتا رہا کہ میں اسے کیا کہوں وہ جو ٹوٹ چکی تھی، ریزہ ریزہ ہو رہی تھی۔ اب زندہ ہی نہ رہنا چاہتی تھی میں اسے کن لفظوں میں دلاسہ دوں پھر نہ جانے کیسے میرے لب ملے اور میں بولتا رہا۔

"عبیرہ تم صحیح تھیں۔۔۔ تم نے وہی کیا جو تمہیں صحیح لگتا تھا۔ تم نے داؤد کو سزا دی کیونکہ وہ ایسی ہی سزا کا حقدار تھا لیکن تم تو بے گناہ تھیں پھر خود کو کیوں بار بار سزا دینے پر اتر آئی ہو۔ قانون کی نظر میں اگر تم قصوروار ہو تو سولہ سال قید بامشقت بھی تو کاٹ رہی ہو۔ یہ سولہ سال بھی گزرے سالوں کی طرح تیزی سے بیت جائیں گے پھر ایک نئی صبح ہو گی۔ تم اپنی زندگی ایک نئے سرے سے شروع کرنا، تم ایسا کرو گی ناں عبیرہ۔۔۔؟" میری باتیں سن کر اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ وہ مسلسل خاموش تھی لیکن اس کے بہتے اشک بتاتے تھے کہ میری باتوں کا اس کے دل پر گہرا اثر ہوا تھا میں بھی تو اسے چاہتا تھا۔ اسے ایسی اذیت دہ حالت میں دیکھ کر میرا دل بھر آیا۔

"محبت تو سہارا ہوتی ہے عبیرہ! اگر تم نے کبھی واقعی مجھ سے محبت کی تھی تو تمہیں اس محبت کا واسطہ آئندہ کبھی اپنی زندگی کو ختم کرنے کی کوشش نہ کرنا۔" میں اتنا کہہ کر اس روز لوٹ آیا تھا۔ مجھے امید تھی کہ عبیرہ اب دوبارہ ایسی احمقانہ حرکت نہ کرے گی اور اس نے میری ایسی امید کو پھر ٹوٹنے نہ دیا تھا۔

یومنہ کو عبیرہ کی دکھوں سے عبارت کہانی سن کر بہت دکھ ہوا اور وہ مجھ سے کہنے لگی۔

"طٰہٰ۔۔۔ ہم لوگ جب اپنوں سے جدا ہوئے تو ان سے دوری کتنا بڑا صدمہ تھی، عبیرہ کو تو اس کے گھر والے، رشتہ دار دوست احباب سبھی چھوڑ چکے ہیں۔ جب آج سے بیس روز بعد اس کی سزا پوری ہو گی تو اسے جیل سے باہر کوئی نہیں لینے آئے گا وہ جیل کی تاریکیوں سے باہر آئے گی تو وہ لمحہ اس کے لیے جیل میں مقید سولہ سالوں سے بھی بھاری ہو گا۔ طٰہٰ! ہم عبیرہ کو گھر لے آئیں گے۔ اسے اس سنگدل دنیا میں بے یار و مددگار نہیں چھوڑیں گے۔" یومنہ صحیح کہہ رہی تھی میں بھی ایسی ہی کشمکش کا شکار ہو رہا تھا۔ جب اس نے عبیرہ کو گھر لے آنے کی بات کہہ کر میری پریشانی دور کر دی تھی۔ یوں میں نے عبیرہ کو گھر لے آنے کی ہامی بھر لی تھی۔

ایک روز بابا عبدالقادر میرے پاس آئے اور بولے کہ بڑے صاحب آپ کو یاد فرما رہے ہیں۔ بابا عبدالقادر میرے ابا کا یہ پیغام دے کر باہر کی جانب نکلے تو میں ان کے تعاقب میں باہر لان میں پہنچا وہ لان میں اسی جگہ بیٹھے تھے جہاں برسوں پہلے بیٹھے ہوئے ابا کی پُرخار باتیں سن کر میں نے دلبرداشتہ ہو کر گھر چھوڑا تھا۔ وہ میرے وہاں پہنچتے ہی مجھے خوش دلی سے ملے اور بتانے لگے۔

"طٰہٰ! میں نے گزرے چند روز میں بہت سے کام نمٹا لیے ہیں۔ اپنے اندرون و بیرون ملک موجود اثاثے اور ان کی تفصیلات جمع کرنے کے بعد میں نے دو ارب روپیہ الگ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میں پہلے خود عملی مظاہرہ کروں گا اور پھر اپنے اردگرد بستے میرے ہی جیسوں سے بھی درخواست کروں گا کہ وہ اپنے وطن کا لوٹا ہوا مال اسے واپس لوٹا دیں۔" ابا کی باتیں سن کر مجھے یقین ہی نہ آ رہا تھا کہ میرے سامنے بیٹھا شخص سابقہ ایم این اے خورشید عالم ہی تھا۔ جسے دولت اپنی اولاد سے زیادہ عزیز تھی، جس نے ایک

بار اسی دولت کی چاہ میں مجھے گھر سے نکال دیا تھا اور وہ اب اپنے اثاثوں سے دستبردار ہونا چاہتے تھے۔ وہ پچھلے دنوں اسی لیے مصروف رہے تھے اور میں کتنا غلط تھا جو یہی سوچتا رہا کہ وہ چند دن نمازی پرہیز گار بن کر پھر سے اپنی ڈگر پر لوٹ چکے تھے۔ ایسا ہر گز نہ تھا بلکہ وہ تو نظام میں تبدیلی لانا چاہتے تھے۔ ایک نئے انقلاب کی راہ ہموار کرنا چاہتے تھے۔ پہلے خود عمل کر کے دوسروں کے لیے ایک مثال قائم کرنا چاہتے تھے۔

اگلے کئی روز میں ابا کی مصروفیت کو دیکھتا رہا، نہ جانے کہاں سے ان میں اس قدر ایمانداری کا جذبہ اُمڈ آیا تھا۔ وہ اپنے حلقے کے قریبی لوگوں میں بھی ایسے جذبے کو ابھارنے میں لگے رہتے تھے اور میں پھر بھلا کیسے پیچھے رہتا، میں بھی ان کے ہمراہ ان کی خدمت میں ہمہ وقت موجود رہتا تھا۔ اسی مصروفیت میں، میں یہ تو بھول ہی گیا تھا کہ چند روز بعد ہی عبیرہ بھی جیل سے رہا ہونے والی تھی اور یہ یاددہانی مجھے یومنہ نے کروائی تھی۔

اگلے روز نئی صبح ہم لوگ فجر کی نماز کے بعد سوئے نہ تھے بلکہ دیر تک عبیرہ کے لیے دعائیں کرتے رہے تھے۔ وہ آج سولہ سال قید بامشقت کاٹ کر رہا ہونے جا رہی تھی۔ ایک طویل آزمائش کے سفر سے گزرنے کے بعد اس کی زندگی کا ایک نیا دن طلوع ہو رہا تھا۔ میں اور یومنہ اب اس گھڑی کا بے صبری سے انتظار کر رہے تھے جب عبیرہ جیل کی تاریکیوں سے نکل کر باہر آئے گی تو وہاں میں اور یومنہ کھڑے اسے خوش آمدید کہہ رہے ہوں گے۔ ایک بار پھر سے دنیا میں دوستی کا جذبہ سربلند ہو رہا ہو گا۔

دوستی اور وفا کے جذبے پھر سے مسکرانے لگیں گے۔ یومنہ اور بچے بھی اس روز بہت خوش لگ رہے تھے۔ یومنہ اور بچوں نے مل کر عبیرہ کو خوش آمدید کہنے کے لیے اس کا کمرہ بھی سجا رکھا تھا۔ میں نے اس کمرے کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو تانیہ نے میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی۔ یومنہ اسے ایسا کرتے دیکھ کر پاس کھڑی کھکھلائے جا رہی تھی اور پھر میرا ایک ہاتھ تانیہ اور دوسرا ایان نے تھاما اور وہ مجھے عبیرہ کے لیے سجائے کمرے کی طرف لے گئے۔ وہاں پہنچ کر بچوں نے جو میری آنکھوں سے پٹی ہٹائی تو کمرہ گلاب کے پھولوں اور کلیوں سے مہک رہا تھا۔ سامنے دیوار پر انگریزی کے بڑے حروف میں ویلکم سویٹ عبیرہ ستاروں سے جگمگا رہا تھا۔ میں نے بے ساختہ تعریف کرتے ہوئے تانیہ اور ایان کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا اور اب بے حد مشکور کن نگاہوں سے یومنہ کی جانب دیکھ رہا تھا۔ اسے دعائیں دے رہا تھا جس نے زندگی میں میری ہر خوشی کا احترام کیا تھا۔ پھر چند لمحوں بعد ہی میں یومنہ اور بچوں کو لے کر گھر سے نکلا تو راستے میں ایک جگہ رک کر میں نے پھولوں کے بوکے لیے اور پھر جو وہاں سے چلا تو گاڑی جیل خانہ کے باہر پہنچ کر ہی رکی۔

گاڑی سے اترتے ہی یومنہ نے پھولوں کے بوکے تانیہ اور ایان کو دیئے اور اب ہم عبیرہ کے جیل سے برآمد ہونے کا بے تابی سے انتظار کرنے لگے۔ جیل خانہ کے بڑے سے آہنی دروازے کا چھوٹا پٹ کھلا تو کالا عبایا پہنے ایک خاتون باہر آئی ایک لمحہ کو میں اور

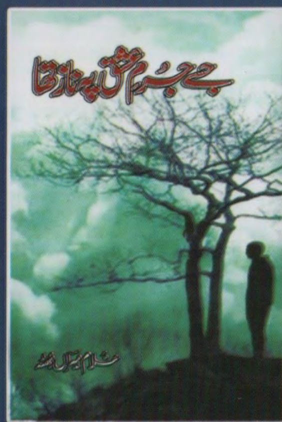
یو منہ پہچان ہی نہ سکے کہ وہ عبیرہ تھی۔ ہم ششدر حیران وہیں کھڑے تھے جب وہ ہاتھ میں ایک چھوٹا سا بیگ تھامے ہماری طرف ہی بڑھتی چلی آ رہی تھی۔

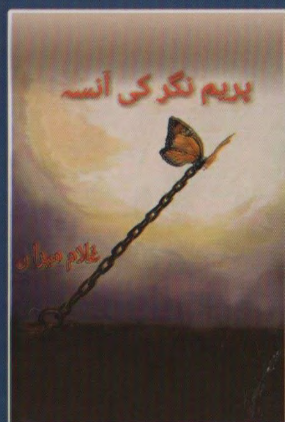
☆☆☆☆☆☆☆

ختم شُد

آپکی قیمتی رائے کا انتظار رہے گا۔۔

مصنف کی دیگر کتب





یارب

- عشق مجازی سے عشق حقیقی تک کا سفر۔
- عدم ادراک سے ادراک تک کی داستان۔
- ایک مجرم کی روداد جسے اس کے احساس ندامت نے مجرم نہ رہنے دیا۔
- کسی برگزیدہ ہستی کی نظر کا کرشمہ۔
- ایک بے وفا کی بے وفائی کا فسانہ۔
- کسی کی بے لوث چاہت کی کہانی۔
- ایک عظیم ذی روح کی عظمت کا احوال جو موت کی اذیت بھلا کر اخبار کے گرد آلود ٹکڑے پر معاف لکھتا رہا۔
- ایک بلند حوصلہ باپ کی بپتا جو اپنے بیٹے کی وصیت پر پابند رہا۔
- سلاخوں کے پیچھے مقید قیدیوں کے لئے امید کی کرن۔
- مایوسیوں کے چھائے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں صبح روشن کی جھلک۔
- خطا سے عطا تک کی کہانی۔

9789695173664

علی میاں پبلیکیشنز ۲۰۔ عزیز مارکیٹ اُردو بازار، لاہور
فون: 37247414
alimianpublications@yahoo.com